TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222737

UNIVERSAL
LIBRARY

روحِ انتخاب (حصہ دوم)

اُردو شرنگاروں پر ایک تاریخی تنقید اور اردو لٹریچر کا تاریخی انتخاب

Checked 1975

مُرتّبہ

مولینا ماجور نجیب آبادی — پنڈت میلارام وفا

پتہ

دفتر انجمن "تعمیرِ ادب" مزنگ لاہور

۱۴۲۷۱
۵۴ ف

دردِ زندگی

۸۸ ف
۸۹۱ ۵ ۳۶

دردِ زندگی جناب احسان دانش کی اُن وجد آفریں نظموں کا حسین ترین مجموعہ ہے جن کو آج ملک کے ادبی حلقوں میں قدر و عزت اور حیرت و استعجاب کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اور اُردو انگریزی کے موقر اخبارات اور رسائل نے پرزور تعصیدے کئے ہیں یہ وہ بیقرار نغمے ہیں جنکو اس نوجوان اور احساس شاعر کی رُوح نے صبح کی عنبر بیز ہواؤں شام کی زرپاش شفق، چاندنی کے سیمیں سیلاب، بہار کی روح پرور شادابی، مزدوروں جیوانوں اور بیکسوں کی حالتِ زار کے دردانگیز مناظر سے متاثر ہو کر ایک سرمدی انداز میں آلاپا ہے۔

اس رنگین مزاج اور فطرت کے پرستار کی ہر نظم صحیح معنوں میں تصویر کہلانے کی مستحق ہے۔ یہ مجموعہ اعلیٰ کاغذ کے ۲۳۶ صفحات پر طباعت و کتابت کی جملہ خوبیوں سے مزین ہے۔ قیمت بلا جلد ۴ دو روپیہ مجلد دو روپیہ آٹھ آنہ

دیشان بکڈپو مزنگ لاہور

فہرست روح انتخاب حصہ دوم

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحات
۱	رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات	آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خانصاحب ایل ایل ڈی	۱
۲	اپنی مدد آپ	〃 〃 〃 〃 〃 〃	۹
۳	علمیت و ذکاوت کا مقابلہ	شمس العلما مولینا محمد حسین صاحب آزاد دہلوی	۱۷
۴	شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار	〃 〃 〃 〃 〃 〃	۲۵
۵	فیلا لوجیا	〃 〃 〃 〃 〃 〃	۴۲
۶	علم الاخلاق	مولوی سید کرامت حسین صاحب بی جج ہائیکورٹ الہ آباد	۵۹
۷	غالب کی اردو نثر	شمس العلما مولینا الطاف حسین صاحب حالی	۷۱
۸	مذہب و عقل	شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی	۸۸
۹	ہماری تعلیم	〃 〃 〃 〃 〃 〃	۹۲
۱۰	شاعری کے ضروری عناصر	شمس العلما علامہ شبلی نعمانی	۹۶
۱۱	فراق اور دھوکا	مصور غم مولینا سید راشد الخیری دہلوی	۱۰۲
۱۲	ابن رشد کا فلسفہ اور یوروپ	مولینا محمد یونس صاحب انصاری فرنگی محلی	۱۱۳
۱۳	حروف کی بحث	آنریبل سر شیخ عبد القادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا	۱۲۰
۱۴	صبح تمنا اور شام حسرت	مولینا ابو الکلام صاحب آزاد ایڈیٹر الہلال	۱۲۷
۱۵	اردو نظم ہندی بحروں میں	پروفیسر تاجور نجیب آبادی ایڈیٹر اخبار اتحاد	۱۴۸
۱۶	شاعری و نفسیات	مرزا محمد سعید صاحب دہلوی ایم اے - آئی - ای ایس	۱۶۸
۱۷	جاپان اور اہل جاپان	نواب مسعود جنگ بہادر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم مملکت نظام	۱۷۴
۱۸	فلسفہ امن	مولینا عبد الماجد صاحب بی اے مصنف فلسفہ مذہبیات	۱۹۱
۱۹	کہکشاں کا ایک سانحہ	مولینا نیاز فتح پوری ایڈیٹر رسالہ نگار	۱۹۸
۲۰	برسات	〃 〃 〃 〃 〃 〃	۲۱۰
۲۱	گلستان	سید سجاد حیدر صاحب ایڈیٹر مرہبی اے رجسٹرار مسلم یونیورسٹی	۲۱۴

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحات
۲۲	اے مادر وطن	سید سجاد حیدر صاحب یلدرم بی اے آکسن بار ایٹ لا سلم یونیورسٹی	۲۲۲
۲۳	آرزو	نواب سر ذوالفقار علی خاں صاحب کے سی آئی ای ایم ایل اے	۲۲۴
۲۴	اسرار خودی	چودھری محمد حسین صاحب ایم اے	۲۲۹
۲۵	حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک	ایم مہدی حسن۔ اضادی الاقتصادی مرحوم	۲۳۷
۲۶	حالی	ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب بجنوری ایم اے پی ایچ ڈی	۲۵۲
۲۷	خوش کیونکر رہئیے	میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا، ایڈیٹر ہمایوں	۲۵۸
۲۸	اخلاقیات اجتماعیہ	مولینا ابوالاعلیٰ مودودی	۲۷۴
۲۹	کیا آپ مہذب ہیں	شیخ محمد ضیاء الدین صاحب شمسی جرنلسٹ	۱۵۳
۳۰	ادب لطیف	ترجمہ از نیو میگزین	۲۸۵
۳۱	بعض راستے	ترجمہ از میشر رنیو یارک	۲۸۶
۳۲	خدا کی تلاش	نامعلوم	۲۸۶
۳۳	میں جانتا ہوں	گلچیں	۲۸۷
۳۴	تاکتخدا لڑکی	حضرت احسن لکھنوی	۲۸۸
۳۵	اے وادی نیل	ابوالمعانی حضرت اختر شیرانی	۲۹۰
۳۶	اگر میں صحرا نشیں ہوتا	سید سجاد حیدر صاحب یلدرم بی اے آکسن بار ایٹ لا سلم یونیورسٹی	۲۹۱
۳۷	اہل قلم روح انتخاب	مرتب	۲۹۳

رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات

(ڈاکٹر سر سید احمد صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی)

ہم اپنے اس آرٹیکل کو بعض بڑے بڑے حکیموں کی تحریروں سے اخذ کر کے لکھتے ہیں کیا عمدہ قول ایک بڑے دانا کا ہے۔ "انسان کی زندگی کا منشاء یہ ہے۔ کہ اس کے تمام قوئے اور جذبات نہایت روشن اور شگفتہ ہوں اور ان میں باہم نامناسبت اور تناقص واقع نہ ہو بلکہ سب مل کر ایک کامل اور نہایت متناسب مجموعہ ہو۔" مگر جس قوم میں کہ پرانی رسم و رواج کی پابندی ہوتی ہے۔ یعنی ان رسموں پر نہ چلنے والا مطعون اور حقیر سمجھا جاتا ہے۔ وہاں زندگی کا منشاء معدوم ہو جاتا ہے +

ایک اور بڑے دانا شخص کی رائے کا یہ نتیجہ ہے کہ آزادی اور اپنے خوشی پر چلنا جہاں تک کہ دوسروں کو ضرر نہ پہنچے ہر انسان کی خوشی اور اُس کا حق ہے۔ پس جہاں کہیں معاشرت کا قاعدہ جس پر کوئی چلتا ہے خاص اس کی خصلت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اگلی روایتوں پر یا پرانی رسم و رواج پر مبنی ہے تو وہاں انسانوں کی خوشحالی کا ایک بڑا جزو موجود نہیں ہے اور جو کہ خوشحالی ہر فرد بشر کی اور نیز کل لوگوں کی ترقی کا بہت بڑا جزو ہے۔ تو اُس ملک میں جہاں رسموں کی پابندی ہے وہ جزو بھی ناپید ہوتا ہے +

کسی شخص کی یہ رائے نہ ہوگی کہ آدمیوں کو بجز ایک دوسرے کی تقلید کے اور کچھ مطلق نہ کرنا چاہئے اور نہ کوئی شخص یہ کہے گا کہ آدمیوں کو اپنی اوقات بسری کے طریقے اور اپنے کاروبار کی کارروائی میں اپنی خوشی اور اپنی رائے کے مطابق کوئی بات بھی نہ کرنی چاہئے۔ سیدھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کو اس کی جوانی میں اس طرح سے تعلیم ہونی چاہئے کہ اور لوگوں کے تجربوں سے جو نتیجے تحقیق ہو چکے ہیں۔ ان کے فوائد سے مستفید ہو اور پھر جب اس کی عقل پختگی پر پہنچے تو خود ان کی بھلائی اور برائی کو جانچے +

بے سوچے اور بے سمجھے رسومات کی پابندی کرنے سے گو وہ رسمیں اچھی ہی کیوں نہ ہوں آدمی کی اُن صفتوں کی ترقی اور شگفتگی نہیں ہوتی جو خدائے تعالیٰ نے ہر آدمی کو جُدا جُدا عنایت کی ہیں۔ ان قوتوں کا برتاؤ جو کسی چیز کی بھلائی برائی دریافت کرنے اور کسی بات پر رائے دینے اور دو باتوں میں امتیاز کرنے اور عقل و فہم کو تیز رکھنے

بلکہ اخلاقی باتوں کی بھلائی اور برائی تجویز کرنے میں مستعمل ہوتی ہیں صرف ایسی ہی صورت میں ممکن ہے جب کہ ہم کو ہر بات کے پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ جو شخص کوئی بات رسم کی پابندی سے اختیار کرتا ہے وہ شخص اُس بات کو پسند یا ناپسند نہیں کرتا اور نہ ایسے شخص کو اس بات کی تمیز یا خواہش میں کچھ تجربہ حاصل ہوتا ہے اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اس صورت میں حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ استعمال میں لائی جاویں۔ ان قوتوں کو اوروں کی تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسے شخص کے لئے بجز ایسی قوت تقلید کے جو بندر میں ہوتی ہے اور کسی قوت کی حاجت نہیں +

البتہ جو شخص اپنا طریقہ خود پسند کرتا ہے وہ اپنی تمام قوتوں سے کام لیتا ہے زمانہ حال پر نظر کرنے کے لئے اس کو قوت تحقیق درکار ہوتی ہے اور انجام کار پر غور کرنے کے لئے قوت تجویز اور اس کا تصفیہ کرنے کو قوت استقرار اور بھلا برا ٹھہرانے کو قوت امتیاز اور سب باتوں کے تصفیہ کے بعد اُس پر قائم رہنے کے لئے قوت استقلال اور یہی سب کام ہیں جو انسان کے کرنے کے لائق ہیں۔ آدمی مثل ایک کل کے نہیں ہے کہ جو اُس کے واسطے مقرر کر دیا ہے اسی کو انجام دیا کرے بلکہ وہ ایک ایسا درخت ہے جو اُن اندرونی قوتوں سے جو خدا نے اس میں رکھی ہیں اور جن کے سبب وہ زندہ مخلوق کہلاتا ہے ہر چہار طرف پھیلے اور بڑھے۔ پھولے اور پھلے +

جو امر کہ پسندیدہ اور تسلیم کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنی فہم اور اپنی عقل سے کام لیں اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر رکھیں یعنی جو عمدہ و مفید ہیں اُن کو اختیار کریں جو قابل اصلاح ہوں اُن میں ترمیم کریں اور جو بُری اور خراب ہوں اُن کی پابندی چھوڑ دیں نہ یہ کہ اندھوں کی طرح یا ایک کل کی مانند ہمیشہ اُسی سے لپٹے رہیں +

یہ بات خیال کی جاتی ہے کہ رسومات کی پابندی نہ کرنے سے آدمی خراب کاموں اور بُری باتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے مگر یہ بات صحیح نہیں ہے اِس لئے کہ انسان کی ذات میں جیسے کہ خراب کام کرنے کی قوتیں اور جذبے ہیں ویسے ہی اُن کے روکنے کی بھی قوتیں اور جذبے ہیں مثلاً ایمان یا نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے۔ پس خراب کام ہونے کا یہ باعث نہیں ہے کہ اُس نے رسومات کی پابندی نہیں کی بلکہ یہ باعث ہے کہ اُس نے ایک قسم کی قوتوں اور جذبوں

کو شگفتہ اور شاداب اور قوی کیا ہے اور دوسری قسم کی قوتوں اور جذبوں کو پژمردہ اور ضعیف اگر رسومات کی پابندی نہ رکھنے کے ساتھ انسان کا ایمان ضعیف نہ ہو۔ یا وہ دلی نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے پژمردہ نہ ہو تو بجز عمدہ اور پسندیدہ باتوں کے اور کسی بات کا ارتکاب ہو

ہمارے زمانہ میں ہر شخص اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک رسم و رواج کا ایسا پابند ہے جیسے کوئی شخص ایک بڑے زبردست حاکم کے نیچے اپنی زندگی بسر کرتا ہو۔ کوئی شخص یا کوئی خاندان اپنے دل سے یہ بات نہیں پوچھتا کہ ہم کو کیا کرنا چاہئے اور ہمارے مناسب یا ہماری پسند اور ہماری پسند کے لائق کیا بات ہے یا جو عمدہ صفتیں مجھ میں ہیں اُن کا ظہور نہایت عمدگی سے کس طرح ممکن ہے اور کونسی بات اُن کی ترقی اور شگفتگی کی معاون ہے۔ بلکہ وہ اپنے دل سے یہ پوچھتے ہیں کہ میری حالت اور رتبے کے کونسی چیز مناسب ہے۔ میرے رتبے اور مقدور کے آدمی کس رسم و رواج کے مطابق کام کرتے ہیں اور اگر کوئی اس سے بھی زیادہ بیوقوف ہوا تو وہ اپنے دل سے اس سے بھی زیادہ بدتر سوال کرتا ہے اور یوں پوچھتا ہے کہ جو لوگ مجھ سے برتر ہیں اور رتبہ اور مقدور میں زیادہ ہیں وہ کن رسموں کو بجالاتے ہیں تاکہ یہ شخص بھی ویسا ہی کر کے انہی کی سی شان میں شامل ہو +

اس بات سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جو لوگ اس طرح پر رسومات کو بجالاتے ہیں وہ اپنی خواہش اور مرضی سے ان رسومات کو اور چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں اور ترجیح دے کر پسند کرتے ہیں نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو بجز ایسی بات کے جو رسمی ہوتی ہے اور کسی بات کی خواہش کرنے کا موقع یا اتفاق نہیں ہوتا اور اس لئے طبیعت خود متحمل اور مطیع رسموں کی پابند ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جو باتیں دل کی خوشی کی کرنی ہوتی ہیں ان میں بھی اوروں کے مطابق کام کرنے کا خیال اوّل دل میں آتا ہے غرض کہ ان کی پسند وہی ہوتی ہے جو بہت سے لوگوں کی ہے وہ صرف ایسی باتوں کے پسند کرنے پر راغب ہوتے ہیں جو عام پسند ہوں اور مذاق اور اصلی سلیقہ جو رسم و رواج کے مطابق نہ ہو اس سے ایسی ہی گریز کی جاتی ہے جیسے کہ جرموں سے۔ یہاں تک کہ اپنی خاص طبیعت کی پیروی نہ کرتے۔ ان میں اپنی طبیعت ہی باقی نہیں رہتی کہ جس کی پیروی کریں اور ان کی ذاتی قوتیں بالکل پژمردہ اور بیکار رہنے کے سبب بالکلیہ ضائع ہو جاتی ہیں اور وہ شخص اپنی دلی خواہش کرنے اور ذاتی خوشی اٹھانے کے قابل نہیں رہتے اور عموماً ایسی طبع زاد رائیں یا خیالات نہیں رکھتے جو خاص اُن

کی اصلی خوشی سے مخصوص ہوں۔ اب غور کرنا چاہیئے کہ انسان کی ایسی حالت پسندیدہ ہو سکتی ہے یا نہیں +

رسومات جو مقرر ہوئی ہیں غالباً اس زمانہ میں جب کہ وہ مقرر ہوئیں مفید تصور کی گئی ہوں مگر اس بات پر بھروسہ کرنا کہ درحقیقت وہ ایسی ہی ہیں محض غلطی ہے ممکن ہے کہ جن لوگوں نے ان کو مقرر کیا ان کی رائے میں غلطی ہو ان کا تجربہ صحیح نہ ہو یا ان کا تجربہ نہایت محدود اور صرف چند اشخاص سے متعلق ہو یا اُس تجربہ کا حال صحیح صحیح بیان نہ ہوا ہو یا وہ رسم اُس وقت اور اس زمانہ میں مفید ہو۔ الّا حال کے زمانہ میں مفید نہ رہی ہو بلکہ مضر ہو یا وہ رسم جن حالات پر قائم کی گئی تھی کسی شخص کی وہ حالت نہ ہو۔ غرض کہ رسموں کی پابندی میں مبتلا رہنا ہر طرح پر نقصان کا باعث ہے۔ اگر کوئی نقصان نہ ہو تو یہ نقصان تو ضرور ہے کہ آدمی کی عقل اور دانش اور جودت طبع اور قوت ایجاد باطل ہو جاتی ہے +

یہ بات بے شک ہے کہ کسی عمدہ بات کی ایجاد کی لیاقت ہر ایک شخص کو نہیں ہوتی بلکہ چند دانا شخصوں کو ہوتی ہے جن کی پیروی اور سب لوگ کرتے ہیں لیکن رسم کی پابندی اور اس قسم کی پیروی میں بہت بڑا فرق ہے۔ رسومات کی پابندی میں اُس کی بھلائی و برائی و مفید و غیر مفید و مناسب حال و مطابق طبع ہونے یا نہ ہونے کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا اور بغیر سوچے سمجھے اس کی پابندی کی جاتی ہے اور دوسری حالت میں بوجہ پسندیدہ ہونے کے اور اس لئے دوسری حالت میں جو قوتیں ترقی کی انسان میں ہیں وہ معدوم و مفقود نہیں ہوتیں الا پہلی حالت میں معدوم و نابود ہو جاتی ہیں +

رسم کی پابندی ہر جگہ انسان کی ترقی کی مانع و مزاحم ہے چنانچہ وہ پابندی ایسی قوت طبعی کے جس کے ذریعہ سے بہ نسبت معمولی باتوں کے کوئی بہتر بات کرنے کا قصد کیا جاوے برابر مخالف رہتی ہے اور انسان کی تنزل حالت کا اصلی باعث ہوتا ہے +

اب اس رائے کو دنیا کی موجودہ قوموں کے حال سے مقابلہ کرو۔ تمام مشرقی یا ایشیائی ملکوں کا حال دیکھو کہ اُن ملکوں میں تمام باتوں کے تصفیہ کا مدار رسم و رواج پر ہے۔ ان ملکوں میں مذہب اور استحقاق اور انصاف کے لفظوں سے رسموں کی پابندی مراد ہوتی ہے۔ بس اب دیکھ لو کہ مشرقی یا ایشیائی قوموں کا جن میں مسلمان بھی داخل ہیں کیسا ابتر اور خراب اور ذلیل حال ہے +

ان مشرقی یا ایشیائی قوموں میں بھی کسی زمانہ میں قوت عقل جودت طبع اور مادۂ ایجاد ضرور موجود ہوگا جس کی بدولت وہ باتیں ایجاد ہوئیں جو اب رسمیں ہیں۔ اس لئے کہ ان کے بزرگ ماں کے پیٹ سے تربیت یافتہ اور حسن معاشرت کے فنون سے واقف پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ سب باتیں انہوں نے اپنی محنت اور علم اور عقل اور جودت طبع سے ایجاد کی تھیں۔ اور انہی وجوہات سے دنیا کی نہایت بڑی اور قوی اور مشہور قوموں سے ہو گئے تھے مگر اب ان کا حال دیکھو کہ کیا ہے اسی رسومات کی پابندی سے اُن کا مآل یہ ہوا ہے کہ اب وہ ایسی قوموں کے محکوم ہیں اور ایسے لوگوں کی آنکھوں میں ذلیل ہیں جن کے آبا و اجداد اس وقت جنگلوں میں آوارہ پڑے پھرتے تھے۔ جس وقت اُن قوموں کے آبا و اجداد عالی شان محلوں میں رہتے تھے اور بڑے بڑے عبادت خانے اور مکانات شاہی اور شہنشاہی محل بنواتے تھے۔ اُس کا سبب یہی تھا۔ کہ اُس زمانہ میں اُن قوموں میں رسم کی پابندی قطعی نہ تھی اور جو کسی قدر تھی تو اُس کے ساتھ ہی آزادی اور ترقی کا جوش اُن میں قائم تھا۔

تواریخ سے ثابت ہے کہ ایک قوم کسی قدر عرصہ تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے اور اُس کے بعد ترقی مسدود ہو جاتی ہے مگر یہ دیکھنا چاہئے کہ ترقی کب مسدود ہوتی ہے یا اُسی وقت مسدود ہوتی ہے جب کہ اس قوم میں سے وہ قوت اُٹھ جاتی ہے جس کے سبب سے نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں اور ٹھیک ٹھیک مسلمانوں کا اس زمانہ میں یہی حال ہے بلکہ میں نے غلطی کی کیونکہ ترقی مسدود ہونے کا زمانہ بھی گزر گیا اور تنزل اور ذلت و خواری کا زمانہ بھی انتہا درجہ کو پہنچ گیا ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ بات کہے کہ یورپ کی قوموں میں بھی جو اس زمانہ میں ہر قسم کی ترقی کی حالت میں شمار ہوتی ہیں بہت سی رسمیں ہیں اور اُن رسموں کی نہایت درجہ پر پابندی ہے تو وہ قومیں کیوں ترقی پر ہیں؟

یہ اعتراض صحیح ہے اور درحقیقت یورپ میں رسموں کی پابندی سے نہایت نقصان ہے اور اگر اس کی اصلاح نہ ہوتی رہتی جیسے کہ اب تک ہوتی رہی ہے تو ان کو بھی بدنصیبی کا دن پیش آوے گا مگر یورپ میں اور مشرقی ملکوں کی پابندی رسومات میں ایک بڑا فرق ہے یورپ میں رسومات کی پابندی ایک عجیب اور نئی بات ہونے کو تو مانع ہے مگر رسومات کی تبدیلی کا کوئی مانع نہیں۔ اگر کوئی شخص عمدہ رسم نکالے اور سب لوگ پسند کریں فی الفور پرانی

رسم چھوڑ دی جائیگی اور نئی رسم اختذکر لی جاویگی۔ اور اس سبب سے اُن لوگوں کے قوائے عقلی اور حالت تمیز اور قوت ایجاد ضائع نہیں ہوتی +

تم دیکھو کہ یہ پوشاک جو اب انگریزوں کی ہے ان کے باپ دادا کی نہیں ہے بالکل اپنی پوشاک بدل دی ہے۔ ہر درجہ کے لوگوں کا جو مختلف لباس تھا اُس رسم کو چھوڑ دیا گیا ہے اور ضرور سمجھا گیا ہے۔ کہ ہر شخص ایک سا مثل اوروں کے لباس پہنے۔ اس وقت کوئی رسم یورپ میں ایسے درجہ پر نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی رسم اُس کے برخلاف مگر اُس سے عمدہ ایجاد کرے اور لوگ اُس پر اتفاق کریں اُسی وقت تبدیل نہ ہو سکے اور اسی تبدیلی کے ساتھ اُن کی ترقی بھی ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ نئی نئی کلیں ہمیشہ ایجاد ہوتی رہتی ہیں اور تا وقتیکہ اُن کی جگہ بہتر کلیں ایجاد نہ ہو جاویں وہ بدستور رہتی ہیں۔ ملکی معاملات اور تعلیم میں اخلاق میں بلکہ مذہب میں ہمیشہ ترقی کے خواہاں ہیں۔ پس یہ تصور کرنا کہ یورپ بھی مثل ہمارے مگر دوسری قسم کی رسموں میں مبتلا ہے۔ محض نادانی اور ناواقفیت کا سبب ہے +

البتہ یورپ میں اور بالتخصیص انگریزوں میں جو بات نہایت عمدہ اور قابل تعریف اور لائق خواہش کے ہے اور درحقیقت بغیر اس کے کوئی قوم مہذب اور تربیت یافتہ نہیں ہو سکتی وہی بات اُس کی تنزل کا باعث ہوگی۔ بشرطیکہ اُس کی اصلاح نہ ہوتی رہیگی۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ تمام انگریز جو حب وطن میں نامی ہیں اس بات پر نہایت کوشش اور جانفشانی کر رہے ہیں کہ کل قوم کے لوگ یکساں ہو جاویں اور سب اپنے خیالات اور طریقے یکساں مسائل اور قواعد کے تحت حکومت کر دیں اور ان کوششوں کا نتیجہ انگلستان میں روز بروز ظاہر ہوتا جاتا ہے جو حالات کہ اب خاص خاص لوگوں اور فرقوں کے پائے جاتے ہیں اور جن کے سبب اُن کی خاص خاص عادتیں قائم ہوئی ہیں وہ اب روز بروز ایک دوسرے کے مشابہ ہوتی ہیں انگلستان میں اس زمانہ سے پہلے مختلف درجوں کے لوگ اور مختلف ہمسایوں کے لوگ اور مختلف پیشہ والے گویا جُدی جُدی دنیا میں رہتے تھے یعنی سب کا طریقہ اور عادت جدا جدا تھا۔ اب وہ سب طریقے اور عادتیں ہر ایک کی ایسی مشابہ ہو گئی ہیں کہ گویا سب کے سب ایک ہی محلہ کے رہنے والے ہیں۔ انگلستان میں بہ نسبت سابق کے اب بہت زیادہ رواج ہو گیا ہے۔ کہ لوگ ایک ہی قسم کی تصنیفات کو پڑھتے ہیں اور ایک ہی سی باتیں سنتے ہیں اور ایک ہی سی چیزیں دیکھتے ہیں۔ اور ایک ہی سے مقاموں میں جاتے ہیں۔

اور یکساں باتوں کی خواہش رکھتے ہیں اور یکساں ہی چیزوں کا خوف کرتے ہیں اور ایک ہی سے حقوق اور آزادی سب کو حاصل ہے۔ اور اُن حقوق اور آزادیوں کے قائم رکھنے کے ذریعے بھی یکساں ہیں اور مشابہت اور مساوات روز بروز ترقی پاتی جاتی ہے۔ اور تعلیم و تربیت کی مشابہت اور مساوات سے اس کو اور زیادہ وسعت ہوتی ہے۔ تعلیم کے اثر سے تمام عام خیالات کے اور غلبہ اور رائے کے پابند ہوتے جاتے ہیں۔ اور عام ذخیرہ حقائق اور مسائل اور رایوں کا موجود ہے۔ اس پر سب کو رسائی ہوتی ہے۔ آمد و رفت کے ذریعوں کی ترقی سے مختلف مقاموں کے لوگ مجتمع اور شامل ہوتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں اور اس سبب سے بھی مشابہت مذکور ترقی پاتی ہے۔ کارخانوں اور تجارت کی ترقی سے آسایش اور آرام کے وسیلے اور فائدے زیادہ شائع ہوتے ہیں اور ہر قسم کی عالی ہمتی بلکہ بڑی سے بڑی اولوالعزمی کے کام ایسی حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ ہر شخص ان کے کرنے کو موجود و مستعد ہوتا ہے۔ کسی خاص شخص یا گروہ پر منحصر نہیں رہا ہے۔ بلکہ اولوالعزمی تمام لوگوں کی خاصیت ہوتی جاتی ہے۔ اور ان سب پر آزادی اور عام رائے کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے۔ اور یہ تمام امور ایسے ہیں جیسے انگلستان کے تمام لوگوں کی رائیں اور عادتیں اور طریق زندگی اور قواعد معاشرت اور اموات رنج و راحت یکساں ہوتے جاتے ہیں۔ اور بلاشبہ ملک اور قوم کے مہذب ہونے کا اور ترقی پر پہنچنے کا یہی نتیجہ ہے اور ایسا عمدہ نتیجہ ہے کہ اس سے عمدہ نہیں ہوسکتا +

مگر باوصف اُس کے ہم اس نتیجہ کو بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے باعث تنزل قرار دیتے ہیں تو ضرور ہم کو کہنا پڑے گا کہ کیوں یہ عمدہ نتیجہ باعث تنزل ہوگا سبب اُس کا یہ ہے کہ جب سب لوگ ایک سی طبیعت اور عادت اور خیال کے ہو جاتے ہیں تو ان کی طبیعتوں میں سے وہ قوتیں جو نئی باتوں کے ایجاد کرنے اور عمدہ عمدہ خیالات کے پیدا کرنے اور قواعد حسن معاشرت کو ترقی دینے کی ہیں زائل اور کمزور ہو جاتی ہیں اور ایک زمانہ ایسا آتا ہے۔ کہ ترقی ٹھہر جاتی ہے اور پھر ایسا زمانہ ہوتا ہے کہ تنزل شروع ہو جاتا ہے +

اس معاملہ میں ہم کو ملک چین کے حالات پر غور کرنے سے عبرت ہوتی ہے چینی بہت لئیق آدمی ہیں بلکہ بعض باتوں پر لحاظ کیا جاوے تو عقل مند بھی

ہیں۔ اور اُس کا سبب یہ ہے کہ اُن کی خوش قسمتی سے ابتدا ہی میں ان کی قوم میں بہت اچھی اچھی رسمیں قائم ہوگئیں اور یہ کام اُن لوگوں کا تھا جو اس قوم میں نہایت دانا اور بڑے حکیم تھے +

چین کے لوگ اس بات میں مشہور و معروف ہیں کہ جو عمدہ سے عمدہ دانش اور عقل کی باتیں اُن کو حاصل ہیں اُن کو ہر شخص کی طبیعت پر بخوبی منقش کرنے کے واسطے اور اس بات کے لئے جن شخصوں کو وہ دانش مندی کی باتیں حاصل ہیں ان کو بڑے بڑے عہدے ملیں نہایت عمدہ طریقے اُن میں رائج ہیں۔ اور وہ طریقے حقیقت میں بہت ہی عمدہ ہیں۔ بے شک جن لوگوں نے اپنا ایسا دستور قائم رکھا۔ انہوں نے انسان کی ترقی کے اسرار کو پالیا اور اس لئے چاہئے تھا کہ وہ قوم تمام دنیا میں ہمیشہ افضل رہتی مگر برخلاف اس کے ان کی حالت سکون پذیر ہوگئی ہے اور ہزاروں برس سے ساکن ہے اور اگر اُن کی کبھی کچھ اور ترقی ہوگی تو بے شک غیر ملکوں کے لوگوں کی بدولت ہوگی۔ اس خرابی کا سبب یہی ہوا۔ کہ اُس تمام قوم کی حالت یکساں اور مشابہ ہوگئی اور سب کے خیالات اور طریق معاشرت ایک سے ہو گئے اور سب کے سب یکساں قواعد اور مسائل کی پابندی میں پڑ گئے اور اس سبب سے وہ قوتیں جن سے انسان کو روز بروز ترقی ہوتی ہے۔ اُن میں سے معدوم ہوگئیں +

پس جب کہ ہم مسلمان ہندوستان کے رہنے والے جن کی رسومات بھی عمدہ اصول و قواعد پر مبنی نہیں ہیں بلکہ کوئی رسم اتفاقیہ اور کوئی رسم بلاخیال اور قوموں کے اختلاط سے آگئی ہے جس میں ہزاروں نقص اور برائیاں ہیں پھر ہم ان رسموں کے پابند ہوں۔ اور نہ اُن کی بھلائی برائی پر غور کریں اور نہ خود کچھ اصلاح اور درستی کی فکر میں ہوں بلکہ اندھا دھند سے انہی کی پیروی کرتے چلے جاویں۔ تو سمجھنا چاہئے کہ ہمارا حال کیا ہوگیا ہے۔ اور آیندہ کیا ہونے والا ہے +

ہماری نوبت چینیوں کے حال سے بھی رسومات کی پابندی کے سبب بدتر ہوگئی ہے + اور اب ہم میں خود اتنی طاقت نہیں رہی کہ ہم اپنی ترقی کر سکیں۔ اس لئے بجز اس کے کہ دوسری قوم ہماری ترقی اور ہمارے قوائے عقلی کی تحریک کا باعث ہو اور کچھ چارہ نہیں۔ بعد اس کے کہ ہمارے قوائے عقلیہ تحریک میں آجاویں اور پھر

قوت ایجاد ہم میں شگفتہ ہو تب ہم پھر اس قابل ہونگے کہ خود اپنی ترقی کے لئے کچھ کر سکیں +
مگر جب کہ ہم دوسری قوموں سے از راہ تعصب نفرت رکھیں اور کوئی نیا طریقہ زندگی کا کہ وہ کیسا ہی بے عیب ہو اختیار کرنا صرف بسبب اپنے یا رسم و رواج کی پابندی کے معیوب سمجھیں تو پھر ہم کو اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کی کیا توقع ہے +
مگر جو کہ ہم لوگ مسلمان ہیں اور ایک مذہب رکھتے ہیں جس کو ہم دل سے سچ جانتے ہیں۔ اس لئے ہم کو مذہبی پابندی ضروری ہے اور وہ اسی قدر ہے کہ جو معاشرت اور تمدن اور زندگی بسر کرنے اور دنیاوی ترقی کی اختیار کرتے ہیں۔ اُس کی نسبت اتنا دیکھ لیں کہ وہ مباحات شرعیہ میں سے ہے یا محرمات شرعیہ میں سے درصورت ثانی بلاشبہ ہم کو احتراز کرنا چاہئے اور درصورت اول بلا لحاظ پابندی رسوم کے اور بلا لحاظ اس بات کے کہ لوگ ہم کو بُرا کہتے ہیں یا بھلا اُس کو اختیار کرنا ضرور بلکہ واسطے ترقی قومی کے فرض ہے +

اپنی مدد آپ

خُدا اُن کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں

یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے۔ اس چھوٹے سے فقرہ میں انسانوں کا اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔ ایک شخص میں اپنی آپ مدد کرنے کا جوش اُس کی سچی ترقی کی بنیاد ہے اور جب کہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے۔ جب کہ کسی شخص کے لئے یا کسی گروہ کے لئے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے۔ تو اس شخص میں سے یا اُس گروہ میں سے وہ جوش اپنے آپ مدد کرنے کا کم ہو جاتا ہے۔ اور ضرورت اپنے آپ مدد کرنے کی اُس کے دل سے مٹتی جاتی ہے۔ اور اسی کے ساتھ غیرت جو ایک نہایت عمدہ قوت انسان میں ہے۔ اور اسی کے ساتھ عزت جو اصلی چمک دمک انسان کی ہے از خود جاتی رہتی ہے اور جب کہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو تو وہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھ میں ذلیل

اور بے غیرت اور بے عزت ہو جاتی ہے۔ آدمی جس قدر کہ دوسرے پر بھروسہ کرتے جاتے ہیں۔ خواہ اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ ہی پر کیوں نہ کریں (یہ امر بدیہی اور بالبداہت ہے) کہ وہ اُسی قدر بے مدد اور بے عزت ہوتے جاتے ہیں۔ اے میرے ہم وطن بھائیو! کیا تمہارا یہی حال نہیں ہے؟

ایشیا کی تمام قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں کہ اچھا بادشاہ ہی رعایا کی ترقی اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یورپ کے لوگ جو ایشیا کے لوگوں سے زیادہ ترقی کر گئے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ ایک عمدہ انتظام قوم کی عزت و بھلائی و خوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے خواہ وہ انتظام باہمی قوم کے رسم و رواج کا ہو یا گورنمنٹ کا۔ اور یہی سبب ہے کہ یورپ کے لوگ قانون بنانے والی مجلسوں کو بہت بڑا ذریعہ انسان کی ترقی و بہبودی کا خیال کر کے اُن کا درجہ سب سے اعلیٰ اور نہایت بیش بہا سمجھتے تھے۔ مگر حقیقت میں یہ سب خیال غلط ہیں۔ ایک شخص فرض کرو کہ وہ لندن میں آیرلینڈ کی طرف سے پارلیمنٹ کا ممبر ہی کیوں نہ ہو جائے یا کلکتہ میں وائسرائے اور گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستان کا ممبر ہی ہو کر کیوں نہ بیٹھ جاوے۔ قومی عزت اور قومی بھلائی اور قومی ترقی کیا کر سکتی ہے۔ برس دو برس میں کسی بات پر ووٹ دے دینے سے گو وہ کیسی ہی ایمانداری اور انصاف سے کیوں نہ دیا ہو قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے۔ بلکہ خود اُس کے چال چلن پر اس کے برتاؤ پر بھی اُس سے کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا تو قوم کے برتاؤ پر کیا اثر پیدا کر سکتا ہے ہاں یہ بات بے شبہ ہے کہ گورنمنٹ سے انسان کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی۔ مگر عمدہ گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ ہے۔ کہ آدمی آزادی سے اپنے قوٰے کی تکمیل اور اپنی شخصی حالت کی ترقی کر سکتا ہے۔

یہ بات روز بروز روشن ہوتی جاتی ہے کہ گورنمنٹ کا فرض بہ نسبت مثبت اور معمل ہونے کے زیادہ تر منفی اور مانع ہے۔ اور وہ فرض جان اور مال اور آزادی کی حفاظت ہے۔ جب کہ قانون کا عمل درآمد دانش مندی سے ہوتا ہے۔ تو آدمی اپنی جسمی اور ذہنی محنت کے ثمروں کا بے خطرہ حظ اٹھا سکتا ہے۔ جس قدر گورنمنٹ کی حکومت عمدہ ہوتی ہے اتنا ہی ذاتی نقصان کم ہوتا

ہے۔ مگر کوئی قانون گو وہ کیسا ہی ابھارنے والا کیوں نہ ہو سست آدمی کو محنتی۔ فضول خرچ کو کفایت شعار شراب خور کو نائب نہیں بنا سکتا۔ بلکہ یہ باتیں شخصی محنت۔ کفایت شعاری نفس کشی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ قومی ترقی۔ قومی عزت قومی اصلاح۔ عمدہ عادتوں۔ عمدہ چال چلن۔ عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہے نہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقوق اور اعلیٰ اعلیٰ درجہ حاصل کرنے سے ۔

پرانے لوگوں کا مقولہ ہے "اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ" اگر اس مقولہ میں "النّاس" سے چند خاص آدمی مراد لئے جائیں جو بادشاہ کے مقرب ہوتے ہیں تو یہ مقولہ صحیح ہے اور اگر یہ معنی لئے جائیں کہ رعایا اپنی گورنمنٹ کی سی ہو جاتی ہے۔ تو یہ مقولہ صحیح نہیں ہے۔ رعایا کبھی گورنمنٹ کے رنگ میں نہیں رنگی جاتی۔ بلکہ گورنمنٹ رعایا کا سا رنگ بدلتی جاتی ہے۔ نہایت ٹھیک بات ہے کہ گورنمنٹ عموماً اُن لوگوں کا جن پر وہ حکومت کرتی ہے عکس ہوتی ہے۔ جو رنگ ان کا ہوتا ہے اُسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے۔ جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے تہذیب اور شائستگی میں آگے بڑھی ہوئی ہے رعایا اس کو زبردستی سے پیچھے کھینچ لاتی ہے۔ اور جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے کمتر اور تہذیب اور شائستگی میں پیچھے ہوتی ہے۔ وہ ترقی کی دوڑ میں رعایا کے ساتھ آگے کھچ جاتی ہے۔ تاریخ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان و انگلستان کا یہی حال ہوا۔ انگلستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں اس زمانہ کی گورنمنٹ سے آگے بڑھی ہوئی تھی۔ اُس نے زبردستی سے گورنمنٹ کو اپنے ساتھ آگے کھینچ لیا۔ ہندوستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں موجودہ گورنمنٹ سے کوسوں پیچھے پڑی ہے۔ گورنمنٹ کتنا ہی کھینچنا چاہتی ہے۔ مگر وہ نہیں کھنچتی بلکہ زبردستی سے گورنمنٹ کو پیچھے کھینچ لائی ہے

یہ ایک نیچر کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کے چال چلن کا ہوتا ہے۔ یقینی اسی کے موافق اُس کے قانون اور اسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے۔ جس طرح کہ پانی خود بخود اپنی پنساں میں آجاتا ہے۔ اسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے۔ اور جاہل و خراب و ناتربیت یافتہ رعایا پر دیسی ہی انگریز حکومت کرنی پڑتی ہے ۔

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی وعمدگی اور قدر و منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن اخلاق و عادات تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے۔ کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے۔ اور ایک قوم کی تہذیب درحقیقت اُن مرد و عورت و بچوں کی شخصی ترقی ہے۔ جن سے وہ قوم بنی ہے +

قومی ترقی مجموعہ ہے شخصی ایمانداری۔ شخصی ہمدردی کا۔ اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے شخصی سستی۔ شخصی بے غرتی۔ شخصی بے ایمانی۔ شخصی خود غرضی کا اور شخصی برائیوں کا۔ ناتہذیبی و بدچلنی جو اخلاقی و تمدنی یا باہمی مباشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے درحقیقت وہ خود اسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چاہیں۔ کہ بیرونی کوشش سے ان برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کر دیں۔ تو یہ برائیاں کسی اور نئی صورت میں اُس سے بھی زیادہ زور شور سے پیدا ہو جاویں گی۔ جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کی ترقی نہ کی جاوے +

اے میرے عزیز ہم وطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے تو اُس کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کرو۔ غور کرو۔ کہ تمہاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کس طرح پر عمدہ ہو تاکہ تم بھی ایک معزز قوم ہو۔ کیا جو طریقہ تعلیم و تربیت کا۔ بات چیت کا۔ وضع و لباس کا۔ سیر سپاٹے کا۔ شغل اشغال کا تمہاری اولاد کے لئے ہے۔ اُس سے اُن کے شخصی چال چلن۔ اخلاق و عادات۔ نیکی و سچائی میں ترقی ہو سکتی ہے؟ حاشا و کلا۔

جب کہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی اصلاح کر سکتی ہے۔ تو اس بات کی امید پر بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اصلاح و ترقی کرے۔ کس قدر افسوس بلکہ نادانی کی بات ہے۔ وہ شخص درحقیقت غلام نہیں ہے۔ جس کو ایک ناخدا ترس نے جو اُس کا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے خرید لیا ہے یا ایک ظالم اور خود نخوتا بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے بلکہ درحقیقت وہ شخص اصلی غلام ہے۔ جو بداخلاقی و خود غرضی جہالت اور شرارت کا مطیع اور اپنی خود غرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے بے پروا ہے۔ وہ قومیں جو اس طرح دل میں غلام ہیں وہ بیرونی

زوروں سے یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے آزاد نہیں ہو سکتیں جب تک کہ غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے کہ ہماری اصلاح ترقی گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام پر منحصر ہے اس وقت تک کوئی مستقل اور برتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح و ترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ گو کیسی ہی تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جاویں وہ تبدیلیاں فانوس خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں جس میں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ مگر جب دیکھو تو کچھ بھی نہیں +

مستقل اور مضبوط آزادی۔ سچی عزت۔ اصلی ترقی شخصی چال چلن کے عمدہ ہونے پر منحصر ہے۔ اور وہی شخصی چال چلن۔ معاشرت اور تمدن کا محافظ اور وہی شخصی چال چلن قومی ترقی کا بڑا ضامن ہے۔ جان اسٹیورٹ مل جو اسی زمانہ میں ایک بہت بڑا دانا حکیم گزرا ہے۔ اس کا قول ہے کہ ظالم اور خود مختار حکومت بھی زیادہ خراب نتیجے پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر اُس کی رعایا میں شخصی اصلاح اور شخصی ترقی موجود ہے۔ اور جو چیز کہ شخصی اصلاح و شخصی ترقی کو دبا دیتی ہے۔ درحقیقت وہی شے اُس کے لئے ظالم و خود مختار گورنمنٹ ہے پھر اُس شے کو جس نام سے چاہو پکارو۔ اُس مقولہ پر میں اس قدر اور زیادہ کرتا ہوں کہ جہاں شخصی اصلاح و شخصی ترقی مٹ گئی ہے۔ یا دب گئی ہے وہاں کیسی ہی آزاد اور عمدہ حکومت کیوں نہ قائم کی جاوے وہ کچھ بھی عمدہ نتیجے پیدا نہیں کر سکتی۔ اور اس اپنے مقولہ کی تصدیق کو ہندوستان کی اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کی مثال پیش کرتا ہوں۔ اے مسلمان بھائیو! کیا تمہاری یہی حالت نہیں ہے؟ تم نے اس عمدہ گورنمنٹ سے جو تم پر حکومت کر رہی ہے کیا فائدہ اٹھایا ہے۔ تمہاری آزادی کے محفوظ رکھنے کا تم کو کیا نتیجہ حاصل ہوا ہے! ہیچ ہیچ ہیچ! اس کا سبب یہی ہے کہ تم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ نہیں ہے +

انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خضر ملے۔ گورنمنٹ فیاض ہو۔ اور ہمارے سب کام کر دے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے لئے کی جائے اور ہم خود نہ کریں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کو ہادی اور رہنما بنایا جائے تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کر دے اور آدمیوں کو انسان پرست بنا دے۔ حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے۔ اور اس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے

ہیں جیسے کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے کیا لالہ اشرفی مل جو ہر روز لچھمی کی پوجا کرتے ہیں اور بے انتہا دولت رکھتے ہیں۔ انسانوں میں کچھ قدر و منزلت کے لایق گنے جاتے ہیں ؛

بڑا سچا مسئلہ اور نہایت مضبوط جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے وہ اپنی آپ مدد کرتا ہے۔ جس وقت لوگ اُس کو اچھی طرح سمجھینگے اور کام میں لاویں گے تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جاویں گے۔ اوروں پر بھروسہ اور اپنی مدد آپ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے اور پہلا خود انسان کو ؛

قومی انتظام یا عمدہ قوانین کے اجراء کی خواہش۔ یہ بھی ایک قدیمی غلط خیال ہے۔ سچا اصول وہ ہے جو ولیم ڈراگن نے ڈبلن کی نمایش گاہ و دستکاری میں کہا تھا۔ جو ایک بڑا خیر خواہ آیرلینڈ کا تھا ؛

اُس نے کہا کہ "جس وقت میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں اسی وقت مجھ کو میرا ملک اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں۔ ہم اپنی آزادی کے لئے بہت سی باتیں سنتے آئے ہیں۔ مگر میرے دل میں بہت بڑا مضبوط یقین ہے کہ ہماری محنت ہماری آزادی ہمارے اوپر منحصر ہے۔ میں یقین کرتا ہوں۔ کہ اگر ہم محنت کئے جاویں اور اپنی قوتوں کو ٹھیک طور پر استعمال کریں تو اُس سے زیادہ ہم کو کوئی موقع یا آیندہ کی قوی توقع اپنی بہتری کے لئے نہیں ہے۔ استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اگر ہم ایک دلی ولولہ اور محنت سے کام کئے جائیں گے۔ تو مجھے پورا یقین ہے کہ تھوڑے زمانہ میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کی مانند آرام و خوشی و آزادی کی ہو جاویگی"

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی موجودہ حالت انسانوں کے نسل در نسل کے کاموں سے حاصل ہوئی ہے۔ محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنے والوں۔ زمین کے جوتنے والوں۔ کانوں کے کھودنے والوں۔ نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں۔ مخفی باتوں کو ڈھونڈ کر نکالنے والوں۔ آلات جر ثقیل سے کام لینے والوں۔ اور ہر قسم کے پیشہ کرنے والوں۔ ہنرمندوں شاعروں حکیموں۔ فیلسوفوں۔ ملکی منتظموں نے انسان کو موجودہ ترقی کی حالت پر پہنچانے میں بڑی

مدد دی ہے۔ ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی ہے۔ اور اُس کو ایک اعلیٰ درجہ تک پہنچایا ہے۔ ان عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب و شائستگی کی عمارت کے معمار ہیں۔ لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم و ہنر میں جو ایک بے ترتیبی کی حالت میں تھی۔ ایک ترتیب پیدا ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اُس زرخیز اور بے بہا جائداد کا وارث کیا ہے۔ جو ہمارے پرکھوں کی ہوشیاری اور محنت سے مہیا ہوئی تھی۔ اور وہ جائداد ہم کو اس لئے نہیں دی گئی ہے۔ کہ ہم صرف مثل مار سیر گنج اس کی حفاظت ہی کیا کریں۔ بلکہ ہم کو اس لئے دی گئی ہے۔ کہ اس کو ترقی دیں۔ اور ترقی یافتہ حالت میں آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ جاویں۔ مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ ہماری قوم نے اُن پرکھوں کی چھوڑی ہوئی جائداد کو بھی گرا دیا +

انگریزوں کو جو دنیا کے اس دور میں اس قدر ترقی ہوئی ہے۔ اُس کا سبب صرف یہی ہے۔ کہ ہمیشہ اُن کی قوم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ رہا ہے۔ اور اس قوم کی شخصی محنت اس پر گواہ عادل ہے۔ یہی مسئلہ اپنی مدد آپ کرنے کا انگریزوں کی قوم کی طاقت کا سچا پیمانہ رہا ہے +

انگریزوں میں اگرچہ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو تمام لوگوں سے اعلیٰ درجہ کے اور زیادہ مشہور تھے اور جن کی تمام لوگ عزت بھی کرتے تھے۔ لیکن کم درجہ کے اور غیر مشہور آدمیوں کے گروہوں میں ہے بھی اُس قوم کی بڑی ترقی ہوئی ہے گو کسی لڑائی اور میدان کارزار کی فہرستوں اور تاریخوں میں صرف بڑے بڑے جنرلوں اور سپہ سالاروں کے نام لکھے گئے ہوں۔ لیکن وہ فتوحات اُن کو زیادہ انہیں محنتی لوگوں کی شجاعت اور بہادری کے سبب ہوئی ہے۔ عام لوگ ہی تمام زمانوں میں سب سے زیادہ کام کرنے والے ہوئے ہیں۔ بہت سے ایسے شخص ہیں۔ جن کی زندگی کا حال کسی نے نہیں لکھا لیکن تہذیب و شائستگی اور ترقی پر اُن کا بھی ایسا ہی قوی اثر ہوا ہے۔ جیسا کہ ان خوش نصیب مشہور نامور آدمیوں کا ہوا ہے۔ جن کی زندگی کے حالات مؤرخوں نے اپنی تاریخوں میں لکھے ہیں +

ایک نہایت عاجز مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے لگاؤ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے۔ اُس شخص کا اُس زمانہ میں اور آئندہ زمانہ میں اُس کے

ملک اور اس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن گو معلوم نہیں ہوتا۔ مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے۔ اور آئندہ کی نسل کے لئے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔

ہر روز کے تجربہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ شخصی ہی چال چلن میں یہ قوت ہے کہ دوسرے کی زندگی اور برتاؤ اور چال چلن پر نہایت قوی اثر پیدا کرتا ہے۔ اور حقیقت میں یہی ایک نہایت عمدہ عملی تعلیم ہے۔ اور جب ہم اس عملی تعلیم کا علمی تعلیم سے مقابلہ کریں تو مکتب و مدرسے و مدرستہ العلوم کی تعلیم اس عملی تعلیم کی ابتدائی تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے علم کا یعنی زندگی کے برتاؤ کا نام جس کو انگریزی میں "لائف ایجوکیشن" کہتے ہیں۔ انسان پر قوم پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مکتب و مدرسہ و مدرستہ العلوم کا علم طاق میں یا صندوق میں یا الماری میں یا کسی بڑے کتب خانہ میں رکھا ہوا ہوتا ہے۔ مگر زندگی کے برتاؤ کا علم ہر وقت دوست سے ملنے میں گھر کے رہنے سہنے میں۔ شہر کی گلیوں میں پھرنے میں۔ صرافہ کی دُکان کرنے میں۔ ہل جوتنے میں۔ کپڑا بننے کے کارخانہ میں۔ کلوں سے کام کرنے کے کارخانہ میں اپنے ساتھ ہوتا ہے۔ اور پھر بے سکھائے اور بے شاگرد کئے لوگوں میں صرف اُس کے برتاؤ سے پھیلتا جاتا ہے۔

یہ پچھلا علم وہ علم ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اسی پچھلے علم سے عمل چال چلن تعلیم نفسی۔ نفس کشی۔ شخصی خوبی۔ قومی مضبوطی۔ قومی عزت حاصل ہوتی ہے۔ یہی پچھلا علم وہ علم ہے۔ کہ جو انسان کو اپنے فرائض ادا کرنے اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے اور زندگی کے کاروبار کرنے اور اپنی عاقبت کے سنوارنے کے لائق بنا دیتا ہے۔ اس تعلیم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا۔ اور نہ یہ تعلیم کسی درجہ کی علمی تحصیل سے حاصل ہوتی ہے۔ لارڈ بیکن کا نہایت عمدہ قول ہے "علم سے عمل نہیں آجاتا۔ علم کو عمل میں لانا علم سے باہر اور علم سے برتر ہے۔" اور مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست اور اس کے علم کو یا عمل یعنی اس کے برتاؤ میں کر دیتا ہے۔ علم کی بہ نسبت عمل اور سوانح عمری کی بہ نسبت عمدہ چال چلن آدمی کو زیادہ تر معزز اور قابل ادب بناتا ہے۔

کیا یہی وجہ ہے جو مدرستہ العلوم مسلمانان کے بانیوں نے یہ تجویز کی ہے۔ کہ مسلمانوں کے لڑکے گھروں سے اور بد صحبتوں سے بمنجملہ مدرستہ العلوم میں عالموں اور اشراف اور تربیت یافتہ لوگوں کی صحبت میں رکھے جاویں؛

علمیت اور ذکاوت کا مقابلہ

(شمس العلماء مولانا محمد حسین صاحب آزاد)

کہتے ہیں کہ اقلیم خیال میں ایک وسیع ولایت تھی۔ جس کا نام **ملک فصاحت** او۔ وہاں کے بادشاہ کا لقب **ملک الکلام** تھا۔ بادشاہ مذکور کے محلوں میں دو بیبیاں تھیں۔ ایک کا نام **فرحت بانو** اور دوسری کا نام **دانش خاتون** تھا **دانش خاتون** کا ایک بیٹا تھا۔ یہ سیدھا سادا شخص حسن متانت میں باپ کا خلف الرشید اور تمکنت اور سنجیدگی میں ماں کی تصویر تھا۔ اُسے **علم** کہتے تھے۔ **فرحت بانو** کی بیٹی **ذکاوت** تھی۔ کہ باپ کے سبب سے خوش بیانی میں اسم بامسمّیٰ اور ماں کے اثر سے زندہ دلی۔ اور شگفتہ مزاجی میں گلاب کے تختہ کو شرمندہ کرتی تھی۔ چونکہ **فرحت بانو** اور **دانش خاتون** دونو سوکنیں تھیں۔ دونوں بچوں نے بگاڑ کا دودھ پیا تھا۔ اور بگاڑ ہی میں پرورش پائی تھی۔ یعنی ابتدا سے ایسی باتیں دل پر نقش ہوئی تھیں۔ کہ ایک ایک کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ بلکہ ہر ایک دوسرے کی صورت سے بیزار تھا۔ باپ نے دیدۂ دور اندیش سے ان کی نا اتفاقی کے نتیجے پہلے ہی دیکھ لئے تھے۔ اس لئے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ان کے دل اپنایت کی گرمیٔ محبت سے ملائم ہوں۔ آخر صورت یہ نکالی۔ کہ اپنی نظر محبت کو دونو میں برابر تقسیم کر دیا۔ مگر باپ کی شفقت منصفانہ نے کچھ اثر نہ کیا۔ کیونکہ ماؤں کی طرف کی عداوت دور تک جڑ پکڑے ہوئے تھی۔ اور بچپنے کے خیالات کے ساتھ مل کر آہستہ آہستہ بہت دور تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ نئے نئے سوانح جو پیش آتے تھے۔ اُن میں عداوت مذکور اور بھی پختہ ہوتی جاتی تھی۔ مگر اس میں شک نہیں۔ کہ دونو کے دونو خوبی و کمال کی جان اور تعلیم و تہذیب کے پتلے تھے۔

جب ذرا ہوش سنبھالا تو عالم بالا کے پاک نہادوں کی نظر اُن پر پڑنے لگی۔ اور وہاں کی مہمانیوں میں آنے جانے لگے۔ چند روز کے بعد **ذکاوت** نے باپ کے اشارے سے اپنے **نشاط محل** میں بڑے بڑے اہل کمال کو جمع کر کے **رقاص فلک** یعنے زہرہ کی ضیافتیں کرنی شروع کیں۔ مگر ان جلسوں میں **علم** کا سانگ بھرا۔ اور اس میں اس

خوبی سے اس کی ہجو کی کہ محفل کو لٹا لٹا دیا۔ **علم** نے بہت برا مانا۔ چنانچہ اس کے توڑ پر **قاضی افلاک** یعنے **مشتری** کی ضیافت کی اور اپنے زور علم سے شہزادی **ذکاوت** کی بے اصل سخن سازی اور بے علم طراریوں کی قلعی کھولنی شروع کی۔ اور **مشتری** نے **عطارد** کے اتفاق رائے سے عمامۂ فضیلت اس کے سر پر بندھوا دیا۔ اسے تدبیر اور تقدیر کا انقلاب کہتے ہیں۔ کہ جہاں باپ نے جن لوگوں کو مؤید سمجھ کر فہمایش اور اصلاح کے لئے کہا تھا۔ وہی چمکانے لگے۔ اور نتیجہ اس کا یہ ہؤا۔ کہ عداوت کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی۔ اسی عالم میں دونو بڑے ہوئے اور اب انہیں عالم قدس کے دربار میں جانے کا شوق پیدا ہؤا۔ مگر وہ بھی اس لئے نہ تھا۔ کہ خود جو کچھ عزت و حرمت حاصل کریں۔ بلکہ ہر ایک کی غرض یہ تھی۔ کہ اپنے حریف کی عزت کو خاک میں ملائے۔ اور جو کچھ اپنے ڈھنگ میں اس نے زور پکڑا ہے۔ اسے آگے نہ بڑھنے دے۔ آخرکار دونو کے جمال و کمال کی بدولت وہ دن آپہنچا۔ کہ رسم و رواج کے بموجب دربار آسمانی میں پہنچے اول **علم** نے تخت کے سامنے کھڑے ہو کر دونو ہاتھ اٹھائے۔ اور چند فقرے ثنائے الٰہی اور دعاے بادشاہی میں اس حسن تاثیر سے ادا فرمائے کہ سب کی آنکھیں آسمان کو لگ گئیں۔ اور سینہ ہاے گرم کے جوش سے محفل میں ایک گونج پیدا ہوئی۔ بعد اس کے **ذکاوت** آگے بڑھی۔ زمین کو بوسہ دیا۔ مگر جب سر اٹھایا۔ تو چند شعر پڑھ کر ایک تبسم زیر لب کیا۔ کہ گویا ایک چمن پھر زعفران لوگوں پر برسا دی۔ انعام یہ ہؤا۔ کہ دونو عالم بالا کے پاک نہادوں میں داخل ہو گئے۔ اور **خواجہ خضر** نے اپنے مبارک ہاتھ سے آب حیات کا مبارک جام بھر کر دیا۔ کہ جب تک آسمان پر چاند سورج کا چاندی سونا ہے۔ تمہارا سکہ روے زمین پر چلتا رہے۔ دربار آسمانی میں قدیم سے **ملنساری** اور **اخلاق** کا انتظام تھا۔ افسوس یہ کہ اس وقت سے اس میں خلل آگیا۔ کیونکہ دربار میں داخل ہو کر دونو جوانوں کے دماغ بگڑے۔ اور دل **نمود** اور **افتخار** کے جوش سے بھڑک اٹھے پھر اس پر ساتھ والوں کی واہ وا غضب تھی کہ ادھر اسے بڑھاتے تھے ادھر

اسے چڑھاتے تھے۔ مگران حملوں کی بوچھاڑیں دونو کے جی چھڑا دیتی تھیں۔ جن کا تار نہ ٹوٹتا تھا۔ اور فتح کا یہ حال تھا۔ کہ اول بدل کرتی تھی۔ کبھی ادھر کا پلہ جھکا دیتی تھی۔ کبھی ادھر کا۔ ایک بالکل مغلوب نہ ہو جاتا تھا۔ کہ دوٹوک ہو کر فیصلہ ہو جائے۔ جس وقت کہ بحث شروع ہوتی تھی۔ تو ذکاوت اس زور برق اور طمطراق سے آتی تھی۔ کہ سب کو اسی کی جیت نظر آتی تھی۔ بلبل کی طرح چہکتی اور پھولوں کی طرح مہکتی۔ پہلے ہی حملے میں تمام محفل مارے خوشی کے اس طرح چمک اٹھتی تھی۔ گویا کبھی نہ بجھے گی۔ اور علم روکھی پھیکی صورت بنائے اپنے زور کو ذرا دبائے رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ تعریفوں کا جوش و خروش بگولے کی طرح گزر جاتا۔ مگر اس کے بعد جو ٹھیراؤ شروع ہوتا وہی علم کی طرف سے پکارتا تھا۔ کہ اب ذرا ٹھیرو گے۔ تو خاطر جمع سے سنو گے پھر علم بھی دفعئے شروع کرتا۔ یہ عالمانہ دفعئے روکھے سوکھے تو ہوتے تھے۔ مگران میں یا تو تعریف کے اعتراضوں کو آپس میں لڑا کر اس کی باتوں سے اسی کو جھوٹا کر دیتے تھے۔ یا ذہن نشین کر دیتے تھے۔ کہ ذکاوت کے دلائل اصلاً قابل وقار و اعتبار نہیں۔ یعنی اس نے سارے مقدمے کے مطلب کو تو لیا ہی نہیں۔ ایک ایک ٹکڑا توڑ کر اس پر باتوں کا طومار باندھ دیا ہے اس تقریر کو سن کر سب آپس میں تصدیق و تسلیم کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ مگر پھر جب کہ ذکاوت کی رسیلی آواز نکلتی تو سب کے کان ادھر ہی لگ جاتے شور و غل چپ چاپ اور ساری محفل ایسی خاموش ہوتی۔ کہ سناٹے کا عالم ہو جاتا۔ اس میں بھی جہاں جہاں موقع پاتی۔ حریفانہ لطیفوں اور ظریفانہ چٹکلوں سے علم کو ایسا چٹکیوں میں اڑا جاتی۔ کہ سننے والوں کے منہ میں تحسین و آفرین کا ایک حرف نہ چھوڑتی۔ پھر ادھر سے علم اپنے ہدایت نامہ کا طومار لے کر کھڑا ہوتا۔ اول تو ذکاوت کا اور اس کے کلام کا سفلہ پن دکھاتا۔ کہ یہ متانت سے خالی ہے۔ جو جو رنگ اس نے جمائے تھے۔ انہیں حقیقی اور تحقیقی دلیلوں سے بلکہ آیتوں اور روایتوں سے اس طرح مٹاتا۔ کہ اہل نظر کو سوائے سر ہلانے اور بجا و برحق کہنے کے کچھ بن نہ آتی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اہل محفل نے اپنی غلط فہمی کو چھوڑنا شروع کیا۔ اور جب محفل کا خاتمہ کر کے اٹھے تو علم کے دلائل صادقہ کے لئے عظمت دلوں میں لئے اٹھے۔

مگر جتنی اس کی عظمت کے لئے اٹھے۔ اُتنی ہی اُس کی شوخی و شگفتہ بیانی کے لئے مہر و محبت لئے اٹھے۔

جب دونو کے کمال اپنی اپنی اعزاز و قدردانی کے لئے اہل نظر سے سفارش کرتے تھے۔ توحسن طلب کے انداز بالکل الگ الگ تھے **ذکاوت** تیز اور بے باک ہو کر ایسی چمک دمک سے آتی تھی۔ کہ دیکھنے والوں کی آنکھ نہ ٹھیرتی تھی **علم** بھی آگے بڑھتا تھا۔ مگر اپنے وقار و متانت میں کمال بندوبست اور نہایت روک تھام سے قدم اٹھاتا تھا **ذکاوت** کند ذہنی اور دیر فہمی کے داغ سے بہت بچتی تھی۔ اور **علم** چوک جانے اور دھوکہ کھانے کے سوا کسی تہمت سے نہیں ڈرتا تھا۔ **ذکاوت** کی ہشیاری کا یہ عالم تھا۔ کہ سمجھنے سے پہلے ہی جواب دے اٹھتی تھی۔ کہ ایسا نہ ہو۔ دیری تیز فہمی پر حرف آئے **علم** کی یہ فصاحت تھی۔ کہ سیدھی سی بات میں بھی اس خیال سے اٹک جاتا تھا۔ کہ حریف نے اپنی تقریر میں جو جو توڑ جوڑ مارے ہیں۔ ان میں سے ایک دقیقہ بھی بے کھولے نہ رہ جائے۔ برخلاف اس کے **ذکاوت علم** کی بریکٹ کو جھٹ پٹ بلکہ اس گھبراہٹ سے خاک میں ملا دیتی تھی۔ کہ وہ دیکھتا رہ جاتا تھا۔ مگر پھر **علم** اس کی بات میں بال بال کے فرق اس تفصیل سے دکھاتا تھا۔ کہ سننے والے اکتا جاتے تھے۔ بلکہ جن باتوں کا آج تک کسی نے انکار نہ کیا تھا۔ اُن کے ثبوتوں میں خواہ مخواہ بات کو طول دے کر وقت ضائع کرتا تھا۔ **ذکاوت** اپنی نمود کی ہوس میں ایسی ایسی باتیں بھی پیش کر دیتی تھی۔ کہ جنہیں نہ سوچا تھا نہ سمجھا تھا۔ اور اس میں بھی شک نہیں۔ کہ اکثر دلچسپ اور دل پسند خیالوں کو خوشنمائی سے دکھا کر کامیاب بھی اس قدر ہو جاتی تھی۔ جس کی اسے خود بھی امید نہ تھی۔

برخلاف اس کے **علم** اکثر قدما کے قدموں پر چلتا تھا۔ وہ نئے خیالوں سے بچتا تھا۔ اور ڈرتا تھا۔ کہ ایسا نہ ہو کہیں ان نتیجوں میں پھنس جائے۔ جنہیں اس کی نظر پیش بین دیکھ نہیں سکتی۔ اکثر ڈھب ایسے آپڑے تھے۔ کہ اگر ذرا ہمت کامیاب کو اور آگے بڑھاتا۔ تو دشمن کو مار ہی لیتا مگر احتیاط جو اس کا جانی رفیق تھا۔ وہ روک لیتا تھا۔

حق یہ ہے کہ غلط فہمی سے دونو خالی نہ تھے اور اسی نے دونو کو تیرہائے اعتراض کے نشانہ پر رکھا تھا۔ **ایجاد** اور **اختراع** تو **ذکاوت** کے مصاحب تھے اور **قدامت** اور **تقلید علم** سے بہت محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ اسی واسطے **ذکاوت** کو تو وہی بات پسند آتی تھی۔ جو کہ آج تک کسی نے دیکھی ہو نہ سنی ہو۔ **علم** کا قاعدہ رہتا۔ کہ بزرگان سلف کے قدم بقدم چلتا تھا۔ اور ان کی ایک ایک بات پر جان قربان کرتا تھا۔ بلکہ اس کے نزدیک جس قدر بات پرانی تھی۔ اسی قدر سر اور آنکھوں پر رکھنے کے قابل تھی۔ برخلاف اس کے **ذکاوت** پرانے پن سے بہت گھبراتی تھی۔ اور ہر رنگ میں نیا شعبدہ دکھاتی تھی۔ اس کا قاعدہ یہ تھا۔ کہ دلائل سے قائل نہ کر سکتی تو لطائف و ظرائف ہی سہی۔ غرض واہ وا لئے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ اور اُسے قائل کرنے کی کچھ پرواہ بھی نہ تھی۔ مگر **علم** اپنی رائے کو ہمیشہ ایسے سنجیدہ اصول اور پکے تلے قواعد سے سنبھالے رہتا تھا۔ کہ اگر مقدمہ اس کے برخلاف بھی فیصل ہو جاتے۔ تو اس کے دلائل برجستہ کو یاد کر کے مدتوں تک تعریفیں ہوتی رہیں +

مناظرہ کے شوقینو! دیکھو اب دونو حریف اپنی اپنی چال بھولتے ہیں

چند روز کے بعد اُن کی طبیعتوں میں ایک تبدیلی واقع ہوئی کہ دونو نے اپنی اپنی خاصیت اصلی کو چھوڑ دیا۔ یعنی ہر ایک یہ سمجھنے لگا۔ کہ جو حربہ حریف نے کیا ہے۔ یہی حربہ میں کروں۔ تو دو ٹوک فتح ہو جائے۔ یعنی اس نے اُس کے رنگ لینے شروع کئے اور اس نے اُس کے ڈھنگ پر چلنا شروع کیا۔ چنانچہ دونو طرف یہی چلتا ہتیار رہو گیا۔ یعنی کبھی کبھی **ذکاوت** دلائل منطقی پر بھی طبع آزمائی کرتی تھی۔ **علم** ان دلیلوں کو بچرسمجھ کر فقط مسکرا دیتا تھا۔ مگر اس طرح کہ ان سب کی صورت بگڑ جاتی تھی۔ ساتھ ہی اسکے طرفدار چلاتے کہ واہ وا دلیل کا نام بھی نہ تھا۔ یہ تو باتوں ہی باتوں کا مصالح تھا۔ ان تجربوں میں دونوں نقصان پر نقصان پاتے تھے اور خود اپنی حقیقت کو دشمن کے ہاتھوں میں ڈال کر سبک ہوتے تھے۔ اور یہ ذلتیں اٹھاتے تھے۔ غرض جس طرح **ذکاوت** کی طبیعت میں متانت و وقار اور بات میں بوجھ بھار نہ تھا۔ اسی طرح **علم** کے کلام میں ظرافت کا نمک اور رنگینی کا نقش و نگار نہ تھا۔ دو قدم چلتا اور اگر پڑتا +

یہ مباحثے ایسے مدت دراز تک جاری رہے۔ کہ لازم ملزوم ہو گئے۔ اور عالم بالا میں بھی فرقے فرقے ہو کر دونو طرف جتھے بندھ گئے۔ چنانچہ **ذکاوت** کو زہرہ نے اپنے دامن حمایت میں لے لیا۔ اور **تبسم۔ تمسخر۔ مزاح۔ دل لگی** کو اس کے ساتھ کر کے کہا کہ حسن و جمال کی پریوں میں جا کر جلسے کیا کرو۔ ادھر **علم** پر مشتری کی نظر عنایت رہی۔ مگر وہ تو خشک مغز تھے۔ اور جب نکلتے تھے۔ تو عصمت۔ حرمت۔ عزت۔ محنت اعتدال۔ تحمل۔ تقوے۔ روکھے پھیکے۔ کبھی کبھی بڈھے اور پرانے بڑھیاں جلو میں لے کر نکلتے تھے۔ اور کسی درگاہ یا خانقاہ تک جا کر چلے آتے تھے،

خوش ہانو دیکھنا! طنز و تعریض کی نہ ٹھہرے۔ نہیں تو خواہ مخواہ لڑائی ہو پڑے گی

نئی بات یہ ہوئی کہ **ذکاوت** کے سنگار خانے میں زیور و لباس پہنانے کے لئے دو کارپردازوں کی ضرورت ہوئی اور اس میں **طنز** اور **تعریض** آکر نوکر ہو گئے۔ انہوں نے اپنی رفاقت میں ایک شخص کو رکھا تھا۔ کہ جسے **بغض دیو زاد** کہتے تھے۔ اس کے ہاتھ میں کمان تھی۔ اور پشت پر ایک ترکش آویزاں تھا۔ جس میں **طعن** و **تعریض** نے تیر بھرے تھے۔ اور **عداوت** کے زہر میں بجھائے تھے۔ ان تیروں کا اثر یہ تھا۔ کہ جہاں لگتے۔ وہاں جم کر ایسے بیٹھتے کہ نہ کسی **جراح** کا جتن چلتا نہ کسی **حکیم** کا نسخہ پیش جاتا۔ چنانچہ جب **علم** کسی امر مفید یا غور کے کام میں مصروف ہوتا یا اپنے معتقدوں کو فیض علم پہنچاتا۔ یہ اس وقت **ذکاوت** کی طرف سے تیر مارا کرتا۔ اس کا بند و بست اور کچھ نہ ہو سکا۔ فقط اتنا ہوا کہ مشتری نے **نکتہ چینی** اور **غلط گیری** کو دو ڈھالیں دے کر ساتھ کر دیا۔ کہ اگر جواب ترکی بہ ترکی نہ ہو سکے۔ تو اس سے روکا کرو۔ چنانچہ یہ دونو اکثر تیروں کی نوکیں توڑ دیتے تھے۔ کبھی بھال نکال کر پھینک دیتے تھے۔ کبھی اسی پر الٹ دیتے تھے۔

جب **سلطان آسمانی** نے دیکھا کہ ان کے آئے دن کے رگڑوں جھگڑوں سے عالم بالا کے امن میں خلل آنے لگا۔ تو بہت خفا ہوا اور ارادہ کیا۔ کہ ان دونو جھگڑالوؤں کو عالم خاکی میں ڈال دے۔ چنانچہ آخر کار دونو دنیا میں آپڑے۔ اور اپنے قدیمی جھگڑے یہاں بھی جاری کر دیے۔ یہاں دونو کے ساتھ بڑے بڑے گرمجوش معتقد جمع ہو گئے **ذکاوت** نے اپنی خوش نمائی سے نوجوانوں اور رنگین مزاجوں

کو بھالیا۔ اور **علم** نے اپنی متانت و وقار سے پُرانے پُرانے بڈھوں کو پھسلالیا۔ ان لوگوں کی بدولت تھوڑے ہی عرصہ میں نئے نئے شگوفے کھلنے لگے۔ اور بڑے بڑے اثر اس کے ظہور میں آئے۔ چنانچہ **ذکاوت** کے جلوس کے لئے گلزار۔ اور پر بہار سیرگاہیں سجائی گئیں۔ کہ جو اُس کے قدر دان ہوں وہاں استقبال کو حاضر ہوں۔ اسی طرح **علم** کے لئے مدرسے۔ مسجدیں۔ درگاہیں اور خانقاہیں قرار پائیں۔ دونوں جتھے اس پر جان دیتے تھے۔ کہ شان و شکوہ اور ناموری اور دریا دلی میں ایک دوسرے سے بازی لے جائیں۔ اس طرح کہ اپنے حریف کو گرد کردیں۔ اور اس عقیدے کے پھیلانے میں عرق ریزی کر رہے تھے۔ کہ جو مخلوق دنیا میں پیدا ہو۔ اسے واجب ہے۔ کہ دونوں میں سے ایک فریق میں ضرور داخل ہو۔ ساتھ اس کے یہ بھی تھا۔ کہ جو شخص طرفین میں سے کسی کی بارگاہ میں ایک دفعہ بھی جانکلے پھر اُسے دوسرے کی نظرِ عنایت کی امید نہ رکھنی چاہیئے۔ اس خاک دانِ ظلماتی میں ایک خاکی جماعت تھی۔ کہ وہ دونوں میں سے ایک کو بھی نہ مانتی تھی۔ یہ لوگ روتی صورت۔ سوتی مورت۔ دولت کے بندے تھے۔ اور اسی کی عبادت کرتے تھے۔ زر و مال کے خزانے ان کے عبادت خانے تھے۔ وہاں کیا **علم** کیا **ذکاوت** کسی کی بھی دعا قبول نہ ہوتی تھی اور سبب اس کا یہ تھا۔ کہ اُن کی آنکھوں پر روپے کی چربی چھائی ہوئی تھی۔ اور کانوں میں غفلت کی روئی تھی۔ **ذکاوت** نے اُن پر بہت بہت گل افشانیاں کیں۔ مگر ان کے لبوں پر کبھی تبسم کا رنگ بھی نہ آیا۔ اور **علم** نے بھی اپنی فصاحت و بلاغت سے بہت دماغ سوزی کی تھی۔ مگر ان کی طبع خوابیدہ نے پھریری بھی نہیں لی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کسی کی آنکھیں روشن بھی ہو جاتی تھیں۔ مگر **دولت** کا ایک مُرید خاص اُن پر تعینات تھا۔ وہ اُسی وقت آسمان اُن کی آنکھوں میں ایک سُرمہ دے جاتا تھا۔ کہ ہر چیز انہیں چھوٹی اور حقیر ہی نظر آتی تھی سغرض اُن کی کم نظری اور بے اعتنائی **علم** اور **ذکاوت** دونو کو بری معلوم ہوئی۔ چنانچہ یہ دونو متفق ہو گئے۔ اور اپنے اپنے معتقدوں کو چڑھا کر بھیجا۔ انہوں نے اسی وقت **دولت پرستوں** کے عبادت خانوں کا رخ کیا۔ اور جاتے ہی کسی کے پہلو میں **اشاروں کنایوں** کی چٹکیاں لیں۔ اور کسی کی بغل میں **ظرافت** کی گدگدیاں شروع کردیں۔ اس وقت سارے **دولت پرست**

چونک پڑے۔ اور جب کچھ چین نہ آیا۔ تو گھبرا کر **روپے** کو مدد کے لئے بلایا۔ روپے کے پاس بڑے نقش اور منتر تھے۔ وہ آیا اور اپنے سارے ہتکھنڈے چلتر کام میں لایا۔ مگر کوئی پیچ اس کا چل نہ سکا۔ پھر بھی اتنا ہوا۔ کہ **ذکاوت** اور **علم** نے جو اپنے اپنے معتقد بھیجے تھے۔ اُن میں پھوٹ ڈال دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے آقاؤں کے راز کھولنے شروع کر دیے۔ یعنی جو کچھ **ذکاوت** اور **علم** تحریر کرتے یہ جھٹ **دولت پرستوں** کو خبر جا پہنچاتے۔ بلکہ جب کچھ تجویز **دولت پرستوں** کی ذلت کے لئے عمل میں آتی تو یہ رشوت خوار کارگزار دل میں برا مانتے۔ اور اگر کچھ حکم لے کر جاتے بھی تو **دولت پرستوں** کے سامنے خوشامد کے پیرایہ میں ظاہر کرتے وہ باوجود اس کے دل میں انہیں بھی حقیر ہی سمجھتے تھے۔ جب یہ خوشامدی رفتہ رفتہ **دولت** اور **دولت پرستوں** کے درجہ عنایت تک جا پہنچے۔ تو خوشامد کی بدولت بڑے بڑے انعام اور جاگیریں حاصل کیں۔ چند روز کے بعد ایسے بدماغ ہوئے۔ کہ جو اہل عزت خود ان کے آقاؤں کے مصاحب تھے۔ اُن سے پہلو مار کر چلنے لگے۔ اور اُن کے مقابل میں اپنے تئیں بہ نظر فضیلت دیکھنے لگے۔

القصہ جب **ذکاوت** اور **علم** دونو نے دیکھا کہ اہل دنیا کا یہ حال ہے۔ اور جو نوکر اپنے تھے۔ وہ سب نمک حرام ہو گئے۔ تو دونو نے مل کر دو عرضیاں تیار کیں جن میں **دولت** اور **دولت پرستوں** کی زیادتیاں اور اپنے نمک حراموں کی بدذاتیاں سب لکھیں۔ اور **سلطان آسمانی** کی خدمت میں بھیج کر التجا کی۔ کہ ہمیں ہماری قدیمی آرام گاہ میں جگہ مل جائے۔ یہ عرضی سُن کر **سلطان آسمانی** داہنے ہاتھ کو بڑے زور شور سے گرجے۔ اس کے یہ معنی کہ ان سب کا روسیاہ کرو۔ اور دونو ہمارے پاس چلے آؤ۔ اس حسن طلب کو نہایت غنیمت سمجھے۔ اور خوشی خوشی شکریے کرتے ہوئے چلنے کو تیار ہوئے **ذکاوت** نے جھٹ بازو پھیلائے۔ اور غبار سے دامن جھاڑتی ہوئی آسمان ہوا کو اڑی۔ لیکن اس فضائے لا انتہا میں کہ جہاں نہ راہ تھی نہ رہنما۔ نظر دور تک کام نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے چند ہی قدم پر رستہ بھول گئی **علم** رستے خوب جانتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی پر خوب ہلائے۔ مگر ان کے بازوؤں میں زور نہ تھا۔ چھوٹی چھوٹی اڑانیں کیا کرتے تھے۔ غرض کہ

ہاتھ پاؤں مار کر دونو زمین پر آپڑے۔ اُس وقت ایک دوسرے کی مصیبت کو خیال کر کے سمجھے۔ کہ اب اتفاق کے سوا گزارہ نہیں۔ ناچار دونو نے ہاتھ ملائے۔ اور پھر اڑے **علم** کو تو **ذکاوت** کی قوت پرواز کا سہارا ملا اور **ذکاوت** کو **علم** دوربین نے رستہ بتایا۔ پلک مارے **سلطان آسمانی** کے دربار میں جا داخل ہوئے۔ چونکہ بگاڑ کے مزے دونو نے خوب چکھ لئے تھے۔ اس لئے اب کی دفعہ دونو میں بہت محبت اور اخلاص ہوا۔ مگر **ذکاوت** کو **علم** کو صلاح دی۔ کہ بھائی تم ذرا **حسن ظرافت** اور اس کی سہیلیوں سے نشست برخاست رکھا کرو۔ اسی طرح انہوں نے **ذکاوت** کو سمجھایا کہ تم ذرا **صلاح و اعتدال** کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کرو۔ ان صحبتوں نے دونو کی طبیعتوں میں بڑا اثر کیا۔ **علم** کی خشک دماغی کو **حسن** اور **ظرافت** کی طراوت پہنچی **ذکاوت** کی شوخی اور طراری نے **صلاح** سے اصلاح پائی۔ دونو آہستہ آہستہ عالم بالا کے پریزادوں میں ایسے ہردل عزیز ہو گئے۔ کہ جس جلسہ میں یہ نہ ہوں اُس میں رونق ہی نہ معلوم ہوتی تھی۔ چند روز کے بعد **سلطان آسمانی** کے ایما سے دونو نے شادیاں کر لیں۔ اور اُن کی نسلوں سے **علوم و فنون** کی اولاد کے سلسلے جاری ہو گئے۔

شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار

اے ملک فنا کے رہنے والو دیکھو! اس دربار میں تمہارے مختلف فرقوں کے عالی وقار جلوہ گر ہیں۔ بہت سے حُبّ الوطن کے شہید ہیں۔ جنہوں نے اپنے ملک کے نام پر میدان جنگ میں جا کر خونی خلعت پہنے۔ اکثر مصنف اور شاعر ہیں جنہیں اسی ہاتفِ غیبی کا خطاب زیبا ہے۔ جس کے الہام سے وہ مطالب غیبی ادا کرتے رہے اور بے غیبی سے زندگی بسر کر گئے۔ ایسے زیرک اور دانا بھی ہیں۔ جو بزم تحقیق کے صدر اور اپنے عہد کے باعث فخر رہے۔ بہت سے نیک بخت نیکی کے رستے بتاتے رہے۔ جس سے ملک فنا میں بقا کی عمارت بناتے رہے۔

بقائے دوام دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی۔ کہ اس کے لئے فنا نہیں۔ دوسری وہ عالم یادگار کی بقا جس

کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں۔ اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے۔ یا تو ثواب آخرت کے لئے یا دنیا کی ناموری اور شہرت کے لئے ہوئے۔ لیکن میں اس دربار میں اُنہیں لوگوں کو لاؤں گا۔ جنہوں نے اپنی محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہائے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی شہرت اور ناموری کو سمجھا۔ اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے۔ اُن کے نام شہرت کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں۔ مگر بڑا فکر یہ ہے کہ جن لوگوں کا ذکر کرتا ہوں۔ اُن کی حق تلفی نہ ہو جائے۔ کیونکہ جن بچاروں نے ساری جانفشانی اور عمر بھر کی محنتوں کا اجر فقط نام کو سمجھا۔ اُن کے حصہ میں کسی طرح کا نقص ڈالنا سخت ستم ہے۔ اسی لحاظ سے مجھے تمام مصنفین اور مؤرخین سے مدد مانگنی پڑی۔ چنانچہ اکثروں کا نہایت احسان مند ہوں۔ کہ انہوں نے ایسے ایسے لوگوں کی ایک فہرست بنا کر عنایت کی۔ اور مجھے بھی کل دوپہر سے شام تک اسی کے مقابلہ میں گزری۔ ناموران موصوف کے حالات ایسے دل پر چھائے ہوئے تھے۔ کہ اُنہوں نے مجھے سوتے سوتے چونکا دیا۔ میں اس دم میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ چونکہ بیان اس کا لطف سے خالی نہیں۔ اس لئے عرض کرتا ہوں +

خواب میں دیکھتا ہوں۔ کہ گویا میں ہوا کھانے چلا ہوں۔ اور چلتے چلتے ایک میدان وسیع الفضا میں جا نکلا ہوں۔ جس کی وسعت اور دلفزائی میدان خیال سے بھی زیادہ ہے + دیکھتا ہوں۔ کہ میدان مذکور میں اس قدر کثرت سے لوگ جمع ہیں۔ کہ نہ انہیں محاسب فکر شمار کر سکتا ہے۔ نہ قلم تحریر فہرست تیار کر سکتا ہے۔ اور جو لوگ اس میں جمع ہیں۔ وہ غرض مند لوگ ہیں۔ کہ اپنی اپنی کامیابی کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک پہاڑ ہے۔ جس کی چوٹی گوش سحاب سے سرگوشیاں کر رہی ہے۔ پہلو اس کے جس طرف سے دیکھو ایسے سر پھوڑ اور سینہ توڑ ہیں۔ کہ کسی مخلوق کے پاؤں نہیں جمنے دیتے۔ ہاں حضرت انسان کے ناخن تدبیر کچھ کام کر جائیں تو کر جائیں۔ میرے دوستو اس رستہ کی دشواریوں کو سر پھوڑ اور سینہ توڑ پہاڑوں سے تشبیہ دے کر ہم خوش ہوتے ہیں۔ مگر نری نامنصفی ہے۔ پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کر لے تو ان بلاؤں کو جھیلے جن پر وہ مصیبتیں گذریں وہی جانیں۔ یکایک قلہ کوہ سے ایک شہنائی کی سی آواز آنی شروع ہوئی

یہ دلکش آواز سب کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اس طرح کہ دل میں جان اور جان میں زندہ دلی پیدا ہوتی تھی۔ بلکہ خیال کو وسعت کے ساتھ ایسی رفعت دیتی تھی۔ جس سے انسان مرتبۂ انسانیت سے بھی بڑھ کر قدم مارنے لگتا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات تھی۔ اتنے انبوہ کثیر میں سے تھوڑے ہی اشخاص تھے۔ جن کے کان اس کے سننے کی قابلیت یا اُس کے نغموں کا مذاق رکھتے تھے +

ایک بات کے دیکھنے سے مجھے نہایت تعجب ہوا اور وہ تعجب فوراً جاتا بھی رہا۔ یعنی دوسری طرف جو نظر جا پڑی تو دیکھتا ہوں۔ کہ کچھ خوبصورت خوبصورت عورتیں ہیں اور بہت سے لوگ اُن کے تماشائے جمال میں محو ہو رہے ہیں۔ یہ عورتیں پریوں کا لباس پہنے ہیں۔ مگر یہ بھی وہیں چرچا سنا۔ کہ درحقیقت نہ وہ پریاں ہیں۔ نہ پری زاد عورتیں ہیں۔ کوئی ان میں **غفلت** کوئی **عیاشی** ہے۔ کوئی **خود پسندی** کوئی **بے پروائی** ہے۔ جب کوئی ہمت والا ترقی کے رستہ میں سفر کرتا ہے۔ تو یہ ضرور ملتی ہیں۔ انہیں میں پھنس کر اہل ترقی اپنے مقاصد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان پر درختوں کے جھنڈ سایہ کئے تھے۔ رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے۔ گوناگوں میوے جھوم رہے تھے۔ طرح طرح کے جانور بول رہے تھے۔ نیچے قدرتی نہریں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہیں وہ دانش فریب پریاں پتھروں کی سلوں پر پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں۔ اور آپس میں چھینٹے لڑ رہی تھیں۔ مگر ایسے ایسے ابھاوے بلندی کوہ کے ادھر ہی ادھر تھے۔ یہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا۔ کہ جو لوگ ان جعلی پریوں کی طرف مائل ہیں۔ وہ اگرچہ اقوام مختلفہ۔ عہدہ ہائے متفرقہ۔ عمرہائے متفارقہ رکھتے ہیں۔ مگر وہی ہیں۔ جو حوصلہ کے چھوٹے ہمت کے پستے اور طبیعت کے پست ہیں +

دوسری طرف دیکھا۔ کہ جو بلند حوصلہ صاحب ہمت عالی طبیعت تھے۔ وہ ان سے الگ ہو گئے۔ اور غول کے غول شہنائی کی آواز کی طرف بلندی پر متوجہ ہو گئے۔ جس قدر یہ لوگ آگے بڑھتے تھے۔ اُسی قدر وہ آواز کانوں کو خوش آیند معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ بہت سے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص اس ارادہ سے آگے بڑھے۔ گویا بلندی کوہ پر چڑھ جائیں۔ اور جس طرح ہو سکے پاس جا کر اس نغمۂ آسمانی

سے قوت روحانی حاصل کریں۔ چنانچہ سب لوگ کچھ کچھ چیزیں اپنے اپنے ساتھ لینے لگے۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا آگے کے رستہ کا سامان لے رہے ہیں۔ سامان بھی ہر ایک کا الگ الگ تھا۔ کسی کے ایک ہاتھ میں شمشیر برہنہ علم تھی۔ ایک ہاتھ میں نشان تھا۔ کسی کے ہاتھ میں کاغذوں کے اجزاء تھے۔ کسی کے بغل میں ایک کپاس تھی۔ کوئی پنسلیں لئے تھا۔ کوئی جہازی قطب نما دوربین سنبھالے تھا۔ بعضوں کے سر پر تاج شاہی دھرا تھا۔ بعضوں کے تن پر لباس جنگی آراستہ تھا۔ غرض کہ علم ریاضی اور جرثقیل کا کوئی آلہ نہ تھا۔ جو اُس وقت کام میں نہ آرہا ہو۔ اسی عالم میں دیکھتا ہوں۔ کہ ایک فرشتۂ رحمت میرے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑا ہے۔ اور مجھے بھی اس بلندی کا شائق دیکھ کر کہتا ہے۔ کہ یہ سرگرمی اور گرم جوشی تمہاری ہمیں نہایت پسند ہے۔ اُس نے یہ بھی صلاح دی۔ کہ ایک نقاب منہ پر ڈال لو۔ میں نے بے تامل تعمیل کی۔ بعد اس کے گروہ مذکور فرقہ فرقہ میں منقسم ہوگیا۔ کوہ مذکور پرستوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ سب نے ایک ایک راہ پکڑلی۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو دیکھا۔ کہ چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں میں ہو لئے۔ وہ تھوڑی ہی تھوڑی دور چڑھے تھے۔ کہ اُن کا رستہ ختم ہوا۔ اور وہ تھم گئے۔ مجھے معلوم ہوا۔ کہ ان پست ہمتوں نے صنعت گری اور دستکاری کی راہ لی تھی کہ روپے کے بھوکے تھے۔ اور جاں محنت کا صلہ چاہتے تھے۔ میں ان لوگوں کے پیچھے تھا۔ جنہوں نے دلاوروں اور جانبازوں کے گروہ کو پیچھے چھوڑا تھا۔ اور خیال کیا تھا۔ کہ چڑھائی کے رستے ہم نے پالئے۔ مگر وہ رستے ایسے پیچ در پیچ اور درہم برہم معلوم دیئے۔ کہ تھوڑا ہی آگے بڑھ کر اس کے ہیر پھیر میں سرگردان ہوگئے۔ ہر چند برابر قدم مارے جاتے تھے۔ مگر جب دیکھا تو بہت کم آگے بڑھتے تھے۔ میرے فرشتۂ رحمت نے ہدایت کی۔ کہ یہ وہی لوگ ہیں۔ جہاں عقل صادق اور عزم کامل کام دیتا ہے وہاں چاہتے ہیں۔ کہ فقط چالاکی سے کام کر جائیں۔ بعضے ایسے بھی تھے۔ کہ بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ مگر ایک ہی قدم ایسا بے موقع پڑا۔ کہ جتنا گھنٹوں میں بڑھے تھے اُتنا دم بھر میں پیچھے آن پڑے۔ بلکہ بعضے ایسے ہوگئے۔ کہ پھر چڑھنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اس سے وہ لوگ مراد ہیں۔ کہ جو مدد روزگار سے ترقیاں حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ مگر کوئی ایسی جرأت نمایاں نہیں کرتے ہیں۔ کہ دفعتہً گر پڑتے ہیں۔ اور آیندہ کے لئے

بالکل اس سے علاقہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہم اتنے عرصہ میں بہت اونچے چڑھ گئے۔ اور معلوم ہوا۔ کہ جو چھوٹے بڑے رستے پہاڑ کے نیچے سے چلتے ہیں۔ اوپر آکر دو شاہراہوں سے ملتے ہیں۔ چنانچہ وہاں آکر تمام صاحب ہمت دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ان دو شاہراہوں میں ذرا ذرا آگے بڑھ کر ایک ایک بھوت ڈراؤنی صورت۔ ہیبت ناک مورت کھڑا تھا۔ کہ آگے جانے سے روکتا تھا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک درخت خاردار کا ٹہنا تھا۔ بھوت کا نام **دیو ہلاک** تھا۔ اور کانٹے وہی ترقی کے مانع اور موت کے بہانے تھے۔ جو اولوالعزموں کو راہ ترقی میں پیش آتے ہیں۔ چنانچہ جو سامنے آتا تھا۔ ٹہنے کی مار منہ پر کھاتا تھا۔ دیو کی شکل ایسی خونخوار تھی۔ گویا موت سامنے کھڑی ہے۔ ان کانٹوں کی مار سے غول کے غول اہل ہمت کے بھاگ بھاگ کر پیچھے ہٹتے تھے۔ اور ڈر ڈر کر چلاتے تھے۔ کہ ہے ہے موت! ہے ہے موت! دوسرے رستے پر جو بھوت تھا۔ اُس کا نام **حسد** تھا۔ پہلے بھوت کی طرح کچھ اُس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ لیکن ڈراؤنی آواز اور بھونڈی صورت اور مکروہ و معیوب کلمے جو اُس کی زبان سے نکلتے تھے۔ اس لئے اُس کا منہ ایسا بُرا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ اُس کے سامنے ایک کیچڑ کا حوض بھرا تھا۔ کہ برابر چھینٹیں اُڑائے جاتا تھا۔ اور ہر ایک سفید پوش کے کپڑے خراب کرتا تھا۔ جب یہ حال دیکھا۔ تو اکثر اشخاص ہم میں سے بیدل ہو کر رہ گئے۔ اور بعضے اپنے یہاں تک آنے پر کمال نادم ہوئے۔ میرا یہ حال تھا۔ کہ یہ خطرناک حالتیں دیکھ دیکھ کر دل ہراساں ہوا جاتا تھا۔ اور قدم آگے نہ اُٹھتا تھا۔ اتنے میں اُس شہنائی کی آواز اس تیزی کے ساتھ کان میں آئی۔ کہ بجھے ہوئے ارادے پھر چمک اُٹھے۔ جس قدر کہ دل زندہ ہوئے۔ اسی قدر خوف و ہراس خاک ہو ہو کر اڑتے گئے۔ چنانچہ بہت سے جانباز جو شمشیریں علم کئے ہوئے تھے۔ اس کڑک دمک سے قدم مارتے آگے بڑھے۔ گویا حریف سے میدان جنگ مانگتے ہیں۔ یہاں تک کہ جہاں دیو کھڑا تھا۔ یہ اُس دہانہ سے نکل گئے۔ اور وہ موت کے دانت نکالے دیکھتا رہ گیا۔ جو لوگ سنجیدہ مزاج اور طبیعت کے دھیمے تھے۔ وہ اسی رستے پر پڑے۔ جدھر حسد کا بھوت کھڑا تھا۔ مگر اُس آواز کے ذوق شوق نے انہیں بھی

ایسا مست کیا۔ کہ گالیاں کھاتے کیچڑ میں نہاتے مر پچ کر یہ بھی اس کی حد سے نکل گئے چنانچہ جو کچھ رستے کی صعوبتیں اور خرابیاں تھیں۔ وہ بھی ان بھوتوں ہی تک تھیں۔ آگے دیکھا۔ تو اُن کی دست رس سے باہر ہیں۔ اور رستہ بھی صاف اور ہموار بلکہ ایسا خوش نما ہے۔ کہ مسافر جلد جلد آگے بڑھے اور ایک سپاٹے میں پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے۔ اس میدانِ روح افزا میں پہنچتے ہی ایسی جاں بخش اور روحانی ہوا چلنے لگی۔ جس سے روح اور زندگانی کو قوت دوامی حاصل ہوتی تھی۔ تمام میدان جو نظر کے گرد و پیش دکھائی دیتا تھا۔ اُس کا رنگ کبھی نور سحر تھا۔ اور کبھی شام و شفق۔ جس سے قوس قزح کے رنگ میں کبھی شہرت عام اور کبھی بقائے دوام کے حروف عیاں تھے۔ یہ نور و سرور کا عالم دل کو اس طرح تسلی و تشفی دیتا تھا۔ کہ خود بخود پچھلی محنتوں کے غبار دل سے دھوئے جاتے تھے۔ اور اِس مجمع عام میں امن و امان اور دلی آرام پھیلتا تھا۔ جس کا سرور لوگوں کے چہروں سے پھولوں کی شادابی ہو کر عیاں تھا۔ ناگہاں ایک ایوان عالی شان دکھائی دیا۔ کہ اُس کے چار طرف پھاٹک تھے اُس پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا۔ کہ پھولوں کے تختہ میں ایک پری حور شمائل چاندی کی کرسی پر بیٹھی ہے۔ اور وہی شہنائی بجا رہی ہے۔ جس کے میٹھے میٹھے سروں نے ان مشتاقوں کے انبوہ کو یہاں تک کھینچا تھا۔ پری ان کی طرف دیکھکر مسکراتی تھی۔ اور سروں سے اب ایسی صدا آتی تھی۔ گویا آنے والوں کو آفرین و شاباش دیتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ خیر مقدم! خیر مقدم! خوش آمدید! صفا آوردید!" اس آواز سے یہ خدائی لشکر کئی فرقوں میں منقسم ہو گیا۔ چنانچہ مؤرخوں کا گروہ ایک دروازہ پر استادہ ہوا۔ تاکہ صاحب مراتب اشخاص کو حسبِ مدارج ایوان جلوس میں داخل کرے۔ یکایک وہ شہنائی جس سے کبھی شوق انگیز۔ جوش خیز اور کبھی جنگی باجوں کے سُر نکلتے تھے اب اُس سے ظفر یابی اور مبارکبادی کی صدا آنے لگی۔ تمام مکان گونج اٹھا۔ اور دروازے خود بخود کھل گئے۔ جو شخص سب سے پہلے آگے بڑھا۔ معلوم ہوا۔ کہ کوئی راجوں کا راجہ مہاراجہ ہے۔ چاند کی روشنی چہرہ کے گرد ہالہ کئے ہے۔ سر پر سورج کی کرن کا تاج ہے۔ اس کے استقلال کو دیکھ کر لنکا کا کوٹ پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ اس کی حق داری جنگل اور پہاڑوں کے حیوانوں کو جاں نثاری میں حاضر کرتی ہے

تمام دیوی دیوتا دامنوں کے سایہ میں لئے آتے ہیں۔ فرقہ فرقہ کے علماء اور مؤرخ اسے دیکھتے ہی شاہانہ طور سے لینے کو بڑھے۔ اور وہ بھی متانت اور انکسار کے ساتھ سب سے پیش آیا۔ مگر ایک شخص کہن سالہ۔ رنگت کا کالا ایک پوتھی بغل میں لئے ہندوؤں کے غول سے نکلا۔ اور باواز بلند چلایا۔ کہ آنکھوں والو کچھ خبر ہے؟ دیکھو! دیکھو! ترتیب کے سلسلہ کو برہم نہ کرو۔ اور نرنکار کے نور کو اجسام خاک میں نہ ملاؤ یہ کہہ کر آگے بڑھا۔ اور اپنی پوتھی نذر گزرانی۔ اُس نے نذر قبول کی۔ اور نہایت خوشی سے اس کے لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ تو معلوم ہؤا۔ کہ اس کا ہاتھ بھی فقط سورج کی کرن تھا۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کوئی کچھ سمجھا کوئی کچھ سمجھا۔ اُس وقت ایک بمان یعنی تختِ ہوادار آیا۔ وہ اس پر سوار ہو کر آسمان کو اُڑ گیا۔ معلوم ہوا۔ کہ یہ **رامچندر جی** ہیں۔ اور یہ **والمیک** ہے۔ جس نے راماین نذر دی۔ سب لوگ ابھی **والمیک** کی ہدایت کا شکریہ کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں ایک اور آمد آمد ہوئی۔ دیکھا کہ ایک تخت طلسمات کو ۳۲ پریاں اُڑائے لئے آتی ہیں۔ اس پر ایک اور راجہ بیٹھا ہے مگر نہایت دیرینہ سال۔ اسے فرقہ فرقہ کے علما اور مؤرخ لینے کو نکلے۔ مگر پنڈت اور مہاجن لوگ بہت بیقراری سے دوڑے۔ معلوم ہؤا کہ راجہ تو مہاراجہ **بکرماجیت** تھے۔ اور تخت **سنگھاسن بتیسی**۔ پریاں اتنی بات کہہ کر ہوا ہوگئیں۔ کہ جب تک سورج کا سونا اور چاند کی چاندی چمکتی ہے۔ نہ آپ کا سنہ ہٹیگا نہ سکہ مٹے گا۔ برہمنوں اور پنڈتوں نے تصدیق کی۔ اور انہیں لے جاکر ایک مسند پر بٹھا دیا۔

ایک راجہ کے آنے پر لوگوں میں کچھ قیل وقال ہوئی۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا۔ کہ اپنے دو مصاحبوں کو بھی ساتھ لے جائے۔ اور اراکین دربار کہتے تھے کہ یہاں **تمکنت** اور **غرور** کا گذارہ نہیں۔ اتنے میں وہی ۳۲ پریاں پھر آئیں۔ چنانچہ ان کی سفارش سے اُسے بھی لے گئے۔ جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا۔ ایک پنڈت آیا۔ دونو ہاتھ اُٹھا کر اشیر باد کہی۔ اور **بقائے دوام** کا تاج سر پر رکھ دیا۔ جس میں ہیرے اور پنّے کے نو دانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا۔ کہ وہ راجہ **بھوج** تھے۔ اور ۳۲ پریوں کا جھرمٹ وہی کتاب **سنگھاسن بتیسی** تھی۔ جو اُن کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ اور جس نے تاج سر پر رکھا وہ **کالی داس** شاعر تھا۔ جس نے ان کے عہد

میں نوکتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگی جاوید بخشی ہے + اس طرف تو برابر یہی کاروبار جاری تھے - اتنے میں معلوم ہوا - کہ دوسرے دروازہ سے بھی داخلہ شروع ہوا - میں اس طرف متوجہ ہوا - دیکھتا ہوں - کہ وہ کمرہ بھی فرش فروش جھاڑ فانوس سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے - ایک جوان پیل پیکر ہاتھ میں گرز گاؤ سر - نشۂ شجاعت میں مست جھومتا جھامتا چلا آتا ہے - جہاں قدم رکھتا ہے - ٹخنوں تک زمین میں ڈوب جاتا ہے - گرد اس کے شاہان کیانی اور پہلوانان ایرانی موجود ہیں - کہ درفش کاویانی کے سایہ بے زوال میں لئے آتے ہیں - حب قوم اور حب وطن انتظار میں دروازے پر کھڑے تھے - سب نے اسے بچشم تعظیم دیکھا - انہی میں سے ایک پیر مرد دیرینہ سال جس کے چہرے سے مایوسی اور ناکامی کے آثار آشکارا تھے - وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا - اور ایک کرسی پر بٹھایا - جسے بجائے پایوں کے چار شیر کندھوں پر اٹھائے کھڑے تھے - پھر پیر مرد نے اہل مجلس کی طرف متوجہ ہو کر چند اشعار نہایت زور و شور کے پڑھے - نہیں ! بلکہ اُس کے کارناموں کی تصویر صفحہ ہستی پر ایسے رنگ سے کھینچی جو قیامت تک رہیگی - بہادر پہلوان نے اٹھ کر اُس کا شکریہ ادا کیا - اور گل فردوس کا ایک طرّہ اس کے سر پر آویزاں کر کے دعا کی - کہ الٰہی یہ بھی قیامت تک شگفتہ و شاداب رہے - تمام اہل محفل نے آمین کہی +

معلوم ہوا کہ وہ بہادر - ایران کا حامی - شیر سیستانی **رستم** پہلوان ہے - اور کہن سال مایوس **فردوسی** ہے جو شاہنامہ لکھ کر اُس کے انعام سے محروم رہا +

بعد اس کے ایک نوجوان آگے بڑھا - جس کا حسن شباب نوخیز اور دل بہادری اور شجاعت سے لبریز تھا - سر پر تاج شاہی تھا - مگر اس سے ایرانی پہلوانی چھلو چراتی تھی - ساتھ اس کے حکمت یونانی سر پر چتر لگائے تھی - میں نے لوگوں سے پوچھا - مگر سب اُسے دیکھ کر ایسے محو ہوئے - کہ کسی نے جواب نہ دیا - بہت سی مؤرخ اور محقق اُس کے پیچھے کو بڑھے - مگر سب ناواقف تھے - وہ اس تخت کی طرف لے چلے - جو کہانیوں اور افسانوں کے ناموروں کے لئے تیار ہوا تھا - چنانچہ ایک شخص جس کی وضع اور لباس سب سے علیحدہ تھا - ایک انبوہ کو چیر کر نکلا - وہ کوئی یونانی مؤرخ تھا - اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے جا کر سب سے پہلی کرسی پر بٹھایا -

فرشتۂ رحمت نے میرے کان میں کہا کہ تم اس گوشہ کی طرف آجاؤ۔ تاکہ تمہاری نظر سب پر پڑے۔ اور تمہیں کوئی نہ دیکھے۔ یہ سکندر یونانی ہے۔ جس کے کارنامے لوگوں نے کہانی اور افسانے بنا دیے ہیں۔

اس کے پیچھے پیچھے ایک بادشاہ آیا۔ کہ سر پر کلاہ کیانی اور اس پر درفش کاویانی جھومتا تھا۔ مگر پھر یرا علم کا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح آتا تھا گویا اپنے زخم کو بچائے ہوئے آتا ہے۔ رنگ زرد تھا۔ اور شرم سے سر جھکائے تھا۔ جب وہ آیا۔ تو سکندر بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو اٹھا۔ اور اپنے برابر بٹھایا۔ باوجود اس کے جس قدر سکندر زیادہ تعظیم کرتا تھا۔ اس کی شرمندگی زیادہ ہوتی تھی۔ وہ دارا بادشاہ ایران تھا۔

دفعتہً سکندر نے آواز دی "انہیں لاؤ"، جو شخص داخل ہوا۔ وہ ایک پیر مرد بزرگ صورت تھا۔ کہ مقیشی ڈاڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اُس کے چہرہ کو روشن کیا تھا۔ ہاتھ میں عصائے پیری تھا۔ جس وقت وہ آیا۔ سکندر خود اٹھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر لایا۔ اپنے برابر کرسی پر بٹھایا۔ اور پانچ لڑی کا سہرا اس کے سر پر باندھا۔ معلوم ہوا۔ کہ یہ **نظامی گنجوی** ہیں۔ اور اس سہرے میں خمسہ کے مضامین سے پھول پروئے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اٹھا۔ اور تھوڑا سا پانی اس پر چھڑک کر کہا۔

"اب یہ کبھی نہ کملائیں گے"۔

بعد اس کے جو شخص آیا۔ اگرچہ سادہ وضع تھا۔ مگر فیاضانہ روشن اور چہرہ فرحت روحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا۔ جو لوگ اب تک آ چکے تھے۔ ان سب سے زیادہ عالی رتبہ کے لوگ اُس کے ساتھ تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ پر **افلاطون** تھا۔ اور بائیں پر **جالینوس**۔ اس کا نام **سقراط** تھا۔ چنانچہ وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا۔ لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ **ارسطو** اپنے اُستاد یعنی **افلاطون** سے دوسرے درجہ پر بیٹھے گا۔ مگر اس مقدمہ پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے۔ کہ ان کا سرگروہ خود ارسطو تھا۔ اس منطقی زبردست نے کچھ شوخی اور کچھ سینہ زوری سے مگر دلائل زبردست اور براہین معقول کے ساتھ سب اہل محفل کو قائل کر لیا۔ کہ یہ مسند میرا ہی حق ہے۔ اور یہ کہہ کر اوں سکندر کو آئینہ دکھایا۔ پھر **نظامی** کو

سلام کر کے بیٹھ ہی گیا +

ایک گروہ کثیر بادشاہوں کی ذیل میں آیا۔ سب جبہ و عمامہ اور طیلسان و دمامہ رکھتے تھے۔ مگر باہر رہ گئے۔ کیونکہ ہر چند ان کے جبے دامن قیامت سے دامن باندھے تھے۔ اور عمامے گنبد فلک کا نمونہ تھے۔ مگر اکثر ان میں طیلسان تہی کی طرح اندر [illegible] تھے۔ چنانچہ دو شخص اندر آنے کے لئے منتخب ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک گروہ کثیر علماء و فضلاء کا ہو لیا۔ تعجب یہ کہ **روم و یونان** کے فلسفی ٹوپیاں اتارے اُن کے ساتھ تھے۔ بلکہ چند ہندو بھی تقویم کے پترے لئے شیراز کہتے آتے تھے۔ پہلا بادشاہ اُن میں **ہارون رشید** اور دوسرا **مامون رشید** تھا +

تھوڑی دیر نہ گذری تھی۔ کہ ایک اور تاجدار سامنے سے نمودار ہوا۔ ولایتی اسخوان ولایتی لباس تھا۔ اور جامہ خون سے قلمکار تھا۔ ہندوستان کے بہت گراں بہا زیور اس کے پاس تھے۔ مگر چونکہ ناواقف تھا۔ اس لئے کچھ زیور ہاتھ میں لئے تھا۔ کچھ کندھے پر پڑے تھے۔ ہر چند یہ جواہرات اپنی آب داری سے پانی ٹپکاتے تھے۔ مگر جہاں قدم رکھتا تھا۔ بجائے غبار کے آنکھوں کے دھوئیں اٹھتے تھے وہ **محمود غزنوی** تھا۔ بہت سے مصنف اُس کے استقبال کو بڑھے۔ مگر وہ کسی اور کا منتظر اور مشتاق معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک نوجوان حور شمائل آیا اور **فردوسی** کا ہاتھ پکڑ کر محمود کے سامنے لے گیا۔ محمود نے نہایت اشتیاق اور شکر گزاری سے ہاتھ اُس کا پکڑا۔ اگرچہ برابر بیٹھ گئے۔ مگر دونو کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں نوجوان ایک عجیب انداز سے مسکرایا۔ اور چلا گیا وہ **ایاز** تھا۔ اسی عرصہ میں ایک اور شخص آیا۔ کہ لباس اہل اسلام کا رکھتا تھا۔ مگر چال ڈھال یونانیوں سے ملاتا تھا۔ اس کے داخل ہونے پر شعرا تو الگ ہو گئے۔ مگر تمام علماء و فضلا میں تکرار اور قیل و قال کا غل ہوا اُس سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا۔ اور ارسطو کے مقابل میں ایک کرسی بچھی تھی۔ اُس پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ **بو علی سینا** تھا +

ایک انبوہ کثیر ایرانی تورانی لوگوں کا دیکھا۔ کہ سب معقول اور خوش وضع لوگ تھے۔ مگر انداز ہر ایک کے جدا جدا تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں اجزا اور بعض کی بغل میں

کتاب تھی۔ کہ اوراق ان کے نقش و نگار سے گلزار تھے۔ وہ دعوے کرتے تھے کہ ہم معانی و مضامین کے مصور ہیں۔ ان کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں۔ آخر یہ جواب ملا۔ کہ تم مصوّر بے شک اچھے ہو۔ مگر بے اصل اور غیر حقیقی اشیاء کے مصوّر ہو۔ تمہاری تصویروں میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ نہیں۔ البتہ انتخاب ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے۔ چنانچہ **انوری۔ خاقانی۔ ظہیر فاریابی** وغیرہ چند اشخاص منتخب ہو کر اندر آئے۔ باقی سب نکالے گئے۔ ایک شاعر کے کان پر قلم دھرا تھا۔ اُس میں سے آب حیات کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ مگر کبھی کبھی اس میں سے سانپ کی زبانیں لہراتی نظر آتی تھیں۔ اس لئے اُس پر پھر تکرار ہوئی۔ اس نے کہا۔ کہ بادشاہوں کو خدا نے دفع اعدا کے لئے تلوار دی ہے۔ مگر ملک مضامین کے حاکم سوائے قلم کے کوئی حربہ نہیں رکھتے۔ اگر چند بوندیں زہر آب کی بھی نہ رکھیں۔ تو اعدائے بدنہاد ہمارے خون عزت کے بہانے سے کب چوکیں۔ چنانچہ یہ عذر اس کا قبول ہوا۔ یہ **انوری** تھا جو باوجود گل افشانی فصاحت کے بعض موقع پر اس قدر ہجو کرتا تھا۔ کہ کان اس کے سننے کی تاب نہیں رکھتے۔ **خاقانی** پر اس معاملہ میں اس کے استاد کی طرف سے دعوے پیش ہوئے۔ چونکہ اس کی بنیاد خانگی نزاع پر تھی۔ اس لئے وہ بھی اس کی کرسی نشینی میں خلل انداز نہ ہو سکا۔ اسی عرصہ میں **چنگیز خاں** آیا۔ اس کے لئے گو علماء اور شعرا میں سے کوئی آگے نہ بڑھا۔ بلکہ جب اندر لائے۔ تو خاندانی بادشاہوں نے اسے چشم حقارت سے دیکھ کر تبسم کیا۔ البتہ مورخوں کے گروہ نے بڑی دھوم دھام کی۔ جب کسی کی زبان سے نسب نامے کا لفظ نکلا تو اُس نے فوراً شمشیر جوہر دار سند کے طور پر پیش کی۔ جس پر خونیں حرفوں سے رقم تھا "سلطنت میں میراث نہیں چلتی" علماء نے غل مچایا۔ کہ جس کے کپڑوں سے لہو کی بو آئے۔ وہ قصاب ہے بادشاہوں میں اس کا کام نہیں۔ شعرا نے کہا۔ کہ جس تصویر کے رنگ میں ہمارے قلم یا مصوران تصانیف کی تحریر نے رنگ بقا نہ ڈالا ہو۔ اُسے اس دربار میں نہ آنے دیں گے۔ اس بات پر اس نے بھی تامل کیا۔ اور اس بات پر متاسف معلوم ہوتا تھا۔ اُس وقت ہاتف نے آواز دی۔ کہ اے **چنگیز** جس طرح ملک کو شمشیر کے جوش کو قوم کے خون میں حرکت دی۔ اگر علوم و فنون کا بھی

خیال کرتا۔ تو آج قومی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اُٹھاتا۔ اتنے میں چند مورخ آگے بڑھے۔ انہوں نے کچھ ورق دکھائے کہ ان میں **طویرہ چنگیز خانی** یعنی اُس کے ملکی انتظام کے قواعد لکھے تھے۔ آخر قرار پایا۔ کہ اُسے دربار میں جگہ دو۔ مگر ان کاغذوں پر کچھ لہو کے چھینٹے دو۔ اور ایک سیاہی کا داغ لگا دو۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی۔ کہ ایک جوان اسی شکوہ و شان کا اور آیا۔ اس کا نام **ہلاکو خاں** تھا۔ اُس کے لئے چند علماء نے بھی مورخوں کا ساتھ دیا۔ جس وقت اندر لائے۔ تو اس کے لئے بھی تکراروں کا غل ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک مرد بزرگ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا جس کی وضع متشرع عالموں کی تھی۔ لیکن کمر میں ایک طرف اصطرلاب دوسری طرف کچھ اقلیدس کی شکلیں لٹکتی تھیں۔ بغل میں فلسفہ اور حکمت کے چند اجزا تھے۔ ان کا نام **محقق طوسی** تھا۔ چنانچہ انہیں دیکھ کر کوئی بول نہ سکا۔ اُسے تو بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی۔ **محقق** کو شیخ **بوعلی سینا** نے یہ کہہ کر پاس بٹھا لیا۔ کہ آپ نے میری کلاہ شہرت میں بقائے دوام کے آبدار موتی ٹانکے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی۔ کہ **امیر تیمور** کی نوبت آئی۔ بہت سے مؤرخوں نے اس کے لانے کی الجھا کی۔ مگر وہ سب کو دروازہ پر چھوڑ گیا۔ اور اپنا آپ رہبر ہوا۔ کیوں کہ وہ مورخ تھا۔ رستہ جانتا تھا۔ اور اپنا مقام پہچانتا تھا۔ لنگڑاتا ہوا گیا۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ **تیمور** کرسی پر بیٹھتے ہی تلوار ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہا۔ کہ اے اہل تصنیف میں تم سے سوال کرتا ہوں۔ کہ ہماری شمشیر کے عوض جو خدا نے تمہیں قلم تحریر دیا ہے سو اس سے اظہار واقعیت اور خلائق کی عبرت اور نصیحت کے لئے کام میں لانا چاہئے۔ یا اغراض نفسانی اور بدزبانی میں؟ تمام مورخ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کہ یہ کس پر اشارہ ہے؟ اس وقت **تیمور** نے **ابن عرب شاہ** کے بلانے کو ایما فرمایا۔ معلوم ہوا۔ کہ وہ کہیں پیچھے رہ گیا۔ چنانچہ اس کا نام مصنفوں کی فہرست سے نکالا گیا۔

اسی حال میں دیکھتے ہیں۔ کہ ایک بزرگ آزاد وضع قطع تعلق کا لباس بر میں۔ خاکساری کا عمامہ سر پر۔ آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں۔ تمام علما و صلحا۔ مورخ اور

شاہ سر جھکائے اُن کے ساتھ ہیں۔ وہ دروازہ پر آکر ٹھیرے۔ سب نے آگے بڑھنے کو التجا کی۔ تو کہا۔ معذور رکھو۔ میرا ایسے مقدموں میں کیا کام ہے۔ اور فی الحقیقت وہ معذور رکھے جاتے۔ اگر تمام اہل دربار کا شوق طلب اُن کے انکار پر غالب نہ آتا۔ وہ اندر آئے۔ ایک طلسمات کا شیشہ مینائی ان کے ہاتھ میں تھا۔ کہ اس میں کسی کو دودھ کسی کو شربت۔ کسی کو شراب شیرازی نظر آتی تھی۔ ہر ایک کرسی نشین انہیں اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا۔ مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھ کر کہیں نہ بیٹھے۔ فقط اس سرے سے اُس سرے تک ایک گردش کی۔ اور چلے گئے۔ وہ حافظ شیراز تھے۔ اور شیشۂ مینائی اُن کا دیوان تھا۔ جو فلک مینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے۔ لوگ اور کرسی نشین کے مشتاق تھے۔ کہ دور سے دیکھا۔ بیشمار لڑکوں کا غول غل مچاتا چلا آتا ہے۔ بیچ میں اُن کے ایک پیر مرد نورانی صورت جس کی سفید ڈاڑھی میں شگفتہ مزاجی کے کنگھی کی تھی۔ اور خندہ جبینی نے ایک طرہ سر پر آویزاں کیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ۔ دوسرے میں ایک میوہ دار ٹہنی پھلوں پھولوں سے ہری بھری تھی۔ اگرچہ مختلف فرقوں کے لوگ تھے۔ جو باہر استقبال کو کھڑے تھے۔ مگر انہیں دیکھ کر سب نے قدم آگے بڑھائے کیونکہ ایسا کون تھا۔ جو شیخ سعدی اور ان کی گلستاں۔ بوستاں کو نہ جانتا تھا۔ انہوں نے کمرہ کے اندر قدم رکھتے ہی سعد زنگی کو پوچھا۔ اس بیچارے کو ایسے دربارو میں بار بھی نہ تھی۔ لیکن اور کرسی نشین کہ اکثر اُن سے واقف تھے۔ اور اکثر اشتیاق فائجانہ رکھتے تھے۔ وہ ان کے مشتاق معلوم ہوئے۔ باوجود اس کے یہ ہنسے۔ اور اتنا کہہ کر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے گئے۔ "دنیا دیکھنے کے لئے ہے برتنے کے لئے نہیں"۔

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک اولوالعزم شخص آیا۔ جس کے چہرہ سے خودسری کا رنگ چمکتا تھا۔ اور سینہ زوری کا جوش بازوؤں میں بل مارتا تھا۔ اُس کے آنے پر تکرار ہوئی۔ اور مقدمہ یہ تھا۔ کہ اگر علما کی نہیں تو موزخوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہئے ہے۔ بلکہ چنتائی خاندان کے مورخ صاف اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔ اُس نے باوجود اس کے ایک کرسی جس پر تیموری تمغہ

بھی لگا تھا۔ گھسیٹ لی اور بیٹھ گیا **ہمایوں** اسے دیکھ کر شرمایا۔ اور سر جھکا لیا۔ مگر پھر تاج شاہی پر انداز کج کلاہی کو بڑھا کر بیٹھا۔ اور کہا کہ بے حق بے استقلال ہے اس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ میرے دشمن کی اولاد میرے رستے پر قدم بقدم چلے گی اور فخر کرے گی +

تھوڑی دیر کے بعد ایک خورشید کلاہ آیا۔ جس کو انبوہ کثیر ایرانی - تورانی - ہندوستانیوں کے فرقہ ہائے مختلفہ کا بیچ میں لئے آتا تھا۔ وہ جس وقت آیا۔ تو تمام اہل دربار کی نگاہیں اُس کی طرف اٹھیں اور رضامندیٔ عام کی ہوا چلی۔ تعجب یہ ہے۔ کہ اکثر مسلمان اس کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ہندو اسے ہندو جانتے تھے۔ آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا۔ نصاریٰ اُس کو نصاریٰ سمجھتے تھے۔ مگر اس کے تاج پر تمام سنسکرت حروف لکھے تھے اُس نے اپنے بعض ہم قوموں اور ہم مذہبوں کی شکایت کر کے **بداونی** پر خون کا دعویٰ کیا۔ کہ اس نے میری حیات جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا تھا۔ اور وہ فتح یاب ہوتا۔ اگر چند منصف مصنفوں کے ساتھ **ابوالفضل** اور **فیضی** کی تصنیف میری مسیحائی نہ کرتی۔ سب نے کہا۔ تیت کا پھل ہے +

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود مخمور نشہ میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اُس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی۔ اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا۔ اُس کے نور جمال سے دیکھتا تھا۔ اور جو کچھ کہتا تھا۔ اسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا۔ اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے۔ مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا۔ اس لئے بادمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں۔ تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ **جہانگیر** اور **بیگم نورجہاں** تھی +

شاہجہاں بڑے جاہ وجلال سے آیا۔ بہت سے مورخ اس کیساتھ کتابیں بغل میں لئے تھے۔ اور شعراء اس کے آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ میر عمارت ان عمارتوں کے فوٹوگراف ہاتھ میں لئے تھے۔ جو اس کے نام کے

کتابے دکھاتی اور سینکڑوں برس کی راہ تک اس کا نام روشن دکھاتی تھیں۔ اُس کے آنے پر رضامندیٔ عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک نوجوان آنکھوں سے اندھا۔ چند بچوں کو ساتھ لئے آیا۔ کہ اپنی آنکھوں کا اور بچوں کے خون کا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ شہریار شاہجہان کا چھوٹا بھائی تھا۔ اور بچے اس کے بھتیجے تھے۔ اس وقت وزیر اس کا آگے بڑھا۔ اور کہا۔ کیا گیا بدنیتی اور خودغرضی سے نہیں کیا۔ بلکہ خلق خدا کے امن اور ملک کا انتظام قائم رکھنے کو کیا۔ بہرحال اسے دربار میں جگہ ملی۔ اور سلاطین چغتائیہ کے سلسلہ میں معزز درجہ پر ممتاز ہوا +

ایک تاج دار آیا۔ کہ جبہ اور عمامہ سے وضع زاہدانہ رکھتا تھا۔ ایک ہاتھ سے تسبیح پھیرتا جاتا تھا۔ مگر دوسرے ہاتھ میں جو فرد حساب تھی۔ اُس میں غرق تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کی میزان کو پڑتالتا ہے۔ سب نے دیکھ کر کہا۔ کہ انہیں خانقاہ میں لے جانا چاہئے۔ اس دربار میں اس کا کچھ کام نہیں۔ لیکن ایک ولایتی کہ بظاہر مقطع اور معقول نظر آتا تھا۔ وہ دونو ہاتھ اُٹھا کر آگے بڑھا۔ اور کہا کہ اے اراکین دربار ہمارے ظلّ سبحانی نے اس کمبخت سلطنت کے لئے بھائی سے لے کر باپ تک کا لحاظ نہیں کیا۔ اس پر بھی تمہارے اعتراض اُسے اس دربار میں جگہ نہ دیں گے۔ یہ لطیفہ اُس نے اس مسخرہ پن سے ادا کیا۔ کہ سب مسکرائے اور تجویز ہوئی۔ کہ تیموری خاندان کے سب سے اخیر میں انہیں بھی جگہ دے دو۔ معلوم ہوا۔ کہ وہ **عالمگیر** بادشاہ اور ساتھ اُس کے **نعمت خاں عالی** تھا

اس کے ساتھ ہی ایک بینڈا جوان سرد کھنی وضع۔ جنگ کے ہتیار لگائے راجگی کے سکے تمغے سے سجا ہوا آیا۔ اُس کی طرف لوگ متوجہ نہ ہوئے۔ بلکہ عالمگیر کچھ کہنا بھی چاہتا تھا۔ مگر وہ کرسی کھینچ کر اُس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ اور بولا کہ صاحب ہمت کو جگہ دو یا نہ دو۔ وہ آپ جگہ پیدا کرلیتا ہے۔ یہ **سیواجی** تھا جس سے مرہٹہ خاندان کی بنیاد قائم ہوئی ہے +

تھوڑی دیر کے بعد دور سے گانے بجانے کی آواز آئی اور بعد اس کے ایک بادشاہ آیا۔ اس کی وضع ہندوستانی تھی۔ مصنفوں اور مورخوں میں سے کوئی اس کے ساتھ نہ تھا۔ البتہ چند اشخاص تھے۔ کہ کوئی ان میں گویا اور کوئی بھانڈ کوئی مسخرہ

نظر آتا تھا۔ یہ سب گھبرائے ہوئے آتے تھے۔ کیوں کہ ایک ولایتی دلاور ان کے پیچھے پیچھے شمشیر برہنہ عَلم کئے تھا۔ اُس کی اصفہانی تلوار سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں مخمل رومی کی کلاہ تھی۔ جس پر ہندوستان کا تاج شاہی نصب تھا۔ اور اسپ بخارائی زیر ران تھا۔ وہ ہندوستانی وضع بادشاہ **محمد شاہ** تھا۔ اُسے دیکھتے ہی سب نے کہا۔ کہ نکالو نکالو۔ ان کا یہاں کچھ کام نہیں۔ چنانچہ وہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے۔ ولایتی مذکور نادرشاہ تھا۔ جس نے سرحد روم سے بخارا تک فتح کر کے تاج ہندوستان سر پر رکھا تھا۔ اسے چنگیز خاں کے پاس جگہ مل گئی +

تھوڑی دیر ہوئی تھی۔ جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مرقع بغل میں دبائے تھا۔ کوئی گلدستہ ہاتھ میں لئے تھا۔ انہیں دیکھ دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے۔ اور وجد کر کے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ ان میں ایک شخص دیکھا۔ کہ جب بات کرتا تھا۔ اس کے منہ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے۔ کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا تھا۔ وہ **مرزا رفیع سودا** تھے +

میر بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ شعر پڑھتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ درد کی آواز درد تک دنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کئے دیتی تھی۔ **میر حسن** اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔ **میر انشاء اللہ خاں** قدم قدم پر نیا بہروپ دکھاتے تھے۔ دم میں عالم ذی وقار متقی۔ پرہیزگار دم میں ڈاڑھی چٹ بنگ کا سونٹا کندھے پر +

جرأت کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ مگر جب وہ میٹھی آواز سے ایک تان اڑاتا تھا۔ تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے **ناسخ** کی گلکاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی۔ اور اکثر جگہ قلم کاری اس کی عینک کی محتاج تھی۔ مگر **آتش** کی آتش زبانی اسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ **مومن** کم سخن تھے۔ مگر جب کہتے تھے جرأت

کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔

ایک پیر مرد دیرینہ سال **محمد شاہی** دربار کا لباس۔ جامہ پہنے کھڑکی دار پگڑی باندھے جریب ٹیکتے آتے تھے۔ مگر ایک لکھنو کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔ بانکے صاحب ضرور ان کے دست و گریبان ہو جاتے۔ لیکن چار خاکسار اور پانچواں تاجدار ان کے ساتھ تھا۔ یہ بچا لیتے تھے۔ بڈھے **میر امن** دہلوی چار درویش کے مصنف تھے۔ اور بانکے صاحب **مرزا سرور** فسانہ عجائب والے تھے۔ **ذوق** کے آنے پر پسند عام کے عطر سے دربار مہک گیا۔ انہوں نے اندر آکر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سودا نے اٹھ کر ملک الشعرائی کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ **غالب** اگرچہ سب سے پیچھے تھے۔ پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا۔ مگر سب واہ وا اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے +

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے۔ اور بس۔ اتنے میں آواز آئی کہ **آزاد** کو بلاؤ۔ ساتھ ہی آواز آئی۔ کہ شاید وہ اس جگہ میں بیٹھنا قبول نہ کرے۔ مگر وہیں سے پھر کوئی بولا۔ کہ اُسے جن لوگوں میں بٹھاؤ گے بیٹھ جائیگا۔ اتنے میں چند اشخاص نے غل مچایا۔ کہ اس کے قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ رکھی ہے۔ اسے دربار شہرت میں جگہ نہ دینی چاہیئے۔ اس مقدمہ پر قیل و قال شروع ہوئی۔ میں چاہتا تھا۔ کہ نقاب چہرہ سے الٹ کر آگے بڑھوں۔ اور کچھ بولوں کہ میرے ہادی ہمدم یعنی فرشتۂ رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اور چپکے سے کہا کہ ابھی مصلحت نہیں اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ میں اس جھگڑے کو بھی بھول گیا۔ اور خدا کا شکر کیا۔ کہ بلا سے دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی۔ مُردوں سے زندوں میں تو آیا +

فیلالوجیا

لغات اور زبانوں کی فلسفی تحقیقات کے اصول

یہ ایک قدیمی فن فلاسفہ یونان کا ہے۔ اس سے مختلف زبانوں کی اصلیں اور ان کا تعلق ایک دوسرے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ عرب اور فارس جہاں سے پہلے ہمیں علوم کے ذخیرے ملے، اُن میں اُس کے اصول و فروع کا پھیلاؤ بہت نہیں ہوا۔ اور جس قدر ہوا۔ گم ہو گیا۔ اب جو کچھ ہے۔ انگریزی میں ہے۔ وہ اُسے فلولوجی کہتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی رسالہ اس کا ترجمہ ہو تو امید نہیں کہ ہم وطن بھائیوں کا دل روشن کر سکے۔ کیونکہ انگریزی کے مصنف کئی کئی زبانوں کے ماہر ہوتے ہیں وہ ہر زبان کی طاقت اُس میں خرچ کرتے ہیں۔ اور انگریزی۔ یونانی۔ لاطینی۔ عبرانی وغیرہ پر بنیاد رکھتے ہیں۔ یہاں ان طرفوں میں اندھیرا ہے۔ ہم لوگوں کو کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لئے میں فارسی اور سنسکرت لفظوں کی چقماق سے آگ نکالونگا امید ہے۔ کہ کچھ نہ کچھ اجالا ہوگا۔ ایشیائی زبانوں میں تحقیقات فلولوجی کا ابھی تک رواج نہیں ہوا۔ اہل یورپ نے اسے یونان سے لیا تھا۔ اسی واسطے علم مذکور کا نام فلولوجی چلا آتا ہے۔ (فلسفۃ اللسان) اب میرے دوست مجھے چند منٹ کے لئے اجازت دیں کہ اول چند مطالب بیان کروں جن سے معلوم ہو کہ زبان جس سے تقریر یا گویائی مراد ہے وہ کیا شے ہے؟

وہ اظہار خیال کا وسیلہ ہے۔ کہ متواتر آوازوں کے سلسلہ میں ظاہر ہوتا ہے جنہیں تقریر یا سلسلہ الفاظ یا بیان یا عبارت کہتے ہیں۔ اسی مضمون کو ایک شاعرانہ لطیفہ میں ادا کرتا ہوں۔ کہ زبان (خواہ بیان) ہوائی سواریاں ہیں۔ جن میں ہمارے خیالات سوار ہو کر دل سے نکلتے ہیں۔ اور کانوں کے رستے اَوروں کے دماغوں میں پہنچتے ہیں۔ اس سے رنگین تر مضمون یہ ہے۔ کہ جس طرح تصویر اور تحریر قلم کی دستکاری ہے۔ جو آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ اسی طرح تقریر ہمارے خیالات کی زبانی تصویر

ہے۔ جو آواز کے قلم نے ہوا پر کھینچی ہے۔ وہ صورت ماجرا۔ کام۔ مقام۔ اور ساری حالت کانوں سے دکھاتی ہے +

خیالات کا مرتبہ زبان سے اول ہے۔ لیکن جب تک وہ دل میں ہیں۔ ماں کے پیٹ میں لوتھڑے بچے ہیں۔ تقریر میں آکر پورے ہوتے ہیں۔ اور تحریر کا لباس پہن کر بھرپور۔ لوگ جو خیالات سے مطلب نگاری۔ اور نکتہ پردازی میں جان کھپاتے ہیں۔ اس نکتہ کو انہی کا دل جانتا ہے +

دنیا میں اظہار مراتب کی کارروائی تین طرح سے ہوسکتی ہے۔ اشارات۔ تقریر۔ تحریر۔ ان میں زبان یعنی تقریر اپنی توضیح کی زیادتی اور محنت کی کمی سے اول نمبر ہوگئی ہے۔ اور حق پوچھو۔ تو کارروائی کے لئے سب برابر ہیں۔ اب یہ کہو۔ کہ زبان کیوں کر پیدا ہوئی؟ سبحان اللہ! ہر مذہب کی کتاب یہی خبر دیتی ہے۔ کہ ہماری زبان خاص خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ یہ ہمیں ساتھ لے کر بہشت میں جائیگی۔ اور اسی کے ذریعے سے ہم اہل جنت سے باتیں کریں گے۔ لیکن غور کرکے دیکھو تو صانع مطلق نے اپنی صنعت کاملہ سے انسان ایک ایسا طلسم قدرت بنایا ہے کہ وہ خود زبان پیدا کرسکتا ہے۔ اور یہ راز خیال کو وسعت دینے سے کھلتا ہے ؎

ہے انسان صانع قدرت کا اک صندوق سربستہ
ولیکن یہ نہیں کھلتا کہ اس میں بولتا کیا ہے

راہ تہذیب کے مسافرو! ذرا ابتدائے آفرینش کی طرف مڑکر نگاہ کرو۔ کہ انسان پیدا ہوا ہے۔ اس میں دل ہے۔ دماغ ہے۔ خیالات ہیں اور سب طرح کی ضرورتیں بھی ہیں۔ مگر اظہار مطلب کا اوزار نہیں۔ وہ کیونکر گذارہ کرتا ہوگا؟ اچھا آج جو انسان بے زبان ہیں۔ اور پہلے سے سودرجہ ضرورتیں رکھتے ہیں۔ انہیں دیکھو کیا کرتے ہیں؟ وہ کون؟ گونگے۔ کہ اپنے اشاروں میں دنیا کی کوئی بات نہیں چھوڑتے۔ سب کچھ کہہ دیتے ہیں۔ اور گونگوں پر کیا منحصر ہے۔ تم خود اکثر نہیں بولتے سر کو آگے کو ہلا کر ہاں ظاہر کر دیتے ہو۔ دو نو شانوں کی طرف ہلا کر نہیں۔ اور غور کرو۔ تو یہ طبعی حرکت ہے۔ گھوڑے ہاتھی وغیرہ چارپائے جب مالک کا ارادہ ماننا نہیں چاہتے۔ تو کس طرح سر جھٹک جھڑا کر سرکشی سے انکار دکھاتے ہیں۔ شوق سیاحت مجھے خود کئی

ملکوں میں لے گیا۔ جہاں میں گونگا تھا۔ کیونکہ نہ میں کسی کی سمجھتا تھا۔ نہ کوئی میری۔ وہاں گذارہ کا وسیلہ اشارے ہی تھے۔ انسان جوش ہائے مختلف کا پتلا ہے جب کسی بات میں ناراض یا خفا ہوتا ہوگا۔ تو اس کی طبیعت سخت آواز نکالتی ہوگی۔ نہیں۔ غراتا ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ سمجھ بھی اپنے اپنے درجہ میں ہر جاندار کو ملی ہے۔ کتے۔ بلی کو دیکھو۔ جب تمہیں خوش کرنا چاہتے ہیں۔ تو کن کن حرکتوں اور جنبشوں سے لگاوٹ کرتے ہیں۔ اور کیسی مہین مہین نرم نرم آوازیں سناتے ہیں۔ اسی طرح ابتدائی انسان بھی دوسرے کا غصہ دھیما کرنے کو عجز و نیاز کی حرکات کام میں لانے لگا ہوگا۔ گونگوں کو بھی دیکھ لو اپنے اشاروں کو رنگ برنگ کی آوازوں سے مدد پہنچاتے ہیں +

تم اب بھی کتے۔ بلی۔ سانپ وغیرہ جانوروں کے ڈرانے یا ہٹانے کے لئے لکڑی کھٹ کھٹا کر کام لیتے ہو۔ کبھی دوسرے شخص کو ہشیار یا آگاہ یا اپنی طرف متوجہ کرنے کو تالی بجا کر۔ چھچکار کر۔ کھنکھار کر آگاہ کرتے ہو۔ آواز کا سمجھ جانا جاندار مخلوق کی طبیعت میں داخل ہے۔ جو جو بولیاں بول کر آپس میں سمجھتے سمجھاتے ہونگے سو تو خدا ہی جانے۔ مگر بلی کو دیکھو۔ کسی ملک کی ہو۔ خواہ غافل سوتی ہو۔ خواہ کسی طرف جاتی ہو۔ جب پھش پھش کر کے آواز دو گے۔ فوراً دیکھنے لگے گی۔ کتا کسی ولایت کا ہو۔ جب تم چس چس کر کے آواز دو گے۔ ضرور چوکنا ہو کر دیکھنے لگے گا۔ بلکہ محبت کی دم بھی ہلانے لگے گا۔ یہ عموماً بازاری کتوں کا حال ہے۔ اور جو تربیت یافتہ ہیں۔ ان کا کیا کہنا!

جب یہ بات قرین قیاس ٹھیری کہ انسان بھی ابتدائے آفرینش میں اشاروں سے سمجھتا سمجھاتا تھا۔ تو یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ سوچنے اور ایجاد کرنے کی لیاقت اسے خدا نے دی تھی۔ برس دو برس کے بچوں کو دیکھو۔ فقط چیخیں ہی مارتے ہیں۔ یا مہمل آوازیں کام میں لاتے ہیں۔ جس بات کو جی چاہتا ہے یا کچھ چیز مانگتے ہیں یا نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ تو انگلیوں کے اشاروں سے سر کے ہلانے سے اور آنکھ اٹھانے نے کر کے تمہیں اپنی خواہشیں جتا دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ کچھ کچھ اور آوازیں بھی ٹھیرا لیتے ہیں مثلاً پانی کے لئے مم مم اور کھانے کو پپہ پپہ یا ہپہ وغیرہ وغیرہ۔ تم نے دیکھا! اعضائے تکلم میں ہونٹ سب سے زیادہ نرم ہیں۔ ذرا سے ارادہ میں ہل جاتے ہیں۔

انہی سے یہ صدائیں نکلی ہیں۔ نہ کہ مسوڑوں سے یا ناک سے یا کان سے۔ رفتہ رفتہ کچھ اور آوازیں نکالنے لگتے ہیں۔ یا سیکھ جاتے ہیں۔ البتہ ان کے استاد یا رہنما بھی ہوتے ہیں۔ (وہ کون؟ یہی گھر والے) اور یہ آوازیں بھی اوّل ان چیزوں اور اُن آدمیوں پر کام آتی ہیں۔ جو اُن کے آس پاس ہوتے ہیں +

اسی طرح فرض کرو کہ آفرینش عالم طفولیت میں ہے اور ایک جگہ دو چار ہی آدمی رہتے ہیں۔ اس وقت ان کے کیا معاملات؟ اور کیا سامان ہیں؟ ایک پہاڑ کے بن مانس یا صحرا کے حبشی پر خیال کرو۔ کہ اس کے پاس ایک ہڈی ہے۔ وہ اس میں سے گوشت نوچ نوچ کر کھا رہا ہے۔ فرض کرو۔ ایک ایسا ہی جنگلی اس پر ہاتھ بڑھا کر۔ آنکھیں نکال کر۔ گردن کو اینٹھا کر غرّایا۔ تو پہلا جنگلی ضرور سمجھ گیا ہوگا۔ کہ یہ ہڈی چھیننی چاہتا ہے۔ اگر برخلاف پہلی حالت کے اُوں اُوں کر کے نرم نرم مہین آواز نکالی۔ اور غریبی کا رنگ دکھا کر آنکھیں چند صیائیں۔ اور آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھایا۔ تو وہ سمجھ گیا ہوگا۔ کہ یہ بیچارہ بھی بھوکا ہے۔ عاجزی سے ہڈی مانگتا ہے + اور یہ حالتیں تم روز اکثر حیوانوں میں مشاہدہ کرتے ہو۔ بعد اس کے اس کے کھانے پینے کے علاوہ اور چیزوں کے لئے بھی آوازیں مقرر ہوگئی ہونگی۔ پھر رفتہ رفتہ لفظ پیدا ہو گئے ہونگے +

تاریخی لطیفہ۔ اکبر کے دربار میں گفتگو ہوئی۔ کہ انسان کی اصلی زبان کیا ہے؟ ایک مکان عالی شان شہر سے الگ تجویز ہوا۔ چند حاملہ عورتوں کو وہاں رکھا۔ گونگی انائیں مامائیں۔ گونگے خدمتگار باہر کے لئے نوکر کئے۔ جب بچے پیدا ہوئے۔ تو ماؤں کو الگ کر کے بے زبانوں گونگی اتاؤں کے سپرد کر دیا۔ پرورش کی ضروریات سب حاضر۔ اور حکم تھا۔ کہ کوئی بولتا آدمی ان کے پاس نہ پھٹکنے پائے جب بچے چار چار پانچ پانچ برس کے ہوئے۔ تو بادشاہ خود گئے۔ بچوں کو سامنے لا کر چھوڑ دیا۔ سب جنگلی جانوروں کی طرح غائیں پائیں کرتے تھے۔ ایک بات سمجھ میں نہ آتی تھی +

تم ننھے ننھے بچوں کو دیکھتے ہو؟ جو چیزیں انہیں نظر آتی ہیں۔ اور انہی سے کام پڑتے ہیں۔ انہی کے لئے سب سے پہلے اشارے اور آوازیں بھی قرار دیتے ہیں +

ان میں سب سے اوّل پیاری ماں۔ اور پیارا باپ ہوتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے بچوں کے اعضا کا جز جز قابو میں نہیں ہوتا۔ کہ حروف میں امتیاز اور فرق پیدا کرسکیں۔ سب سے آگے وہی ہونٹ ہیں۔ انہیں میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اور بچہ کہتا ہے مَ مَ بَ بَ اس بات کو میں بھی تسلیم کرتا ہوں۔ کہ اختلاف وطن اور آب وہوا کے فرق سے طبیعتوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ انسانیت کے لحاظ سے سب ایک تھے۔ اس لئے دیکھو! طبیعت کے استاد نے سب کو ایک ہی نام سکھایا۔ اگرچہ ذرا ذرا سا فرق ہوگیا ہے۔

لیکن تقریباً سب زبانوں میں ماں باپ کے نام جو بچہ سب سے پہلے سیکھتا ہے۔ ایسے اصوات سے مرکب ہیں۔ جن کا تلفظ ہونٹوں کی جنبش یا محض منہ کھول کر آواز نکالنے سے ہوتا ہے۔ مثلاً

انگریزی میں باپ کو پاپا کہتے ہیں - ماں کو ماما
عربی میں باپ کو اَب یا ابا کہتے ہیں - ماں کو اُم
فارسی میں باپ کو بابا کہتے ہیں - ماں کو مام

اشارات میں دیکھ لو۔ طبیعت انسانی کا اتحاد ہر ملک کے بچہ سے اشارہ کے لئے پہلے انگلی اٹھواتا ہے۔ پھر آواز سے کہلواتا ہے۔ یُہ یُہ۔ پھر پاس کے لئے یہ اور دور کے لئے وُہ ہوجاتا ہے۔

بچہ پہلے چیزوں کے نام یعنی اَسما سیکھتا ہے۔ اسی واسطے جب کوئی چیز لینی چاہتا ہے۔ تو فقط اُسی کا نام لے کر پکارتا ہے۔ بھوکا ہوتا ہے تو دُو دُو دُو دُو کہتا ہے۔ پیاسا ہوتا ہے۔ تو فقط مَم مَم کہتا ہے۔ مٹھائی کو جی چاہتا ہے۔ تو چیجی۔ بلکہ چی۔ کہتا ہے۔ جب گویائی میں ذرا زور رفتار پیدا ہوتا ہے۔ تو فعل بھی لگانے لگتا ہے۔ مگر غلط سلط۔ رفتہ رفتہ حروف لگا کر باتیں کرنے لگتا ہے زبان کے الجھن پردیسیوں کو دیکھا۔ اور خود سیاحتوں میں تجربہ ہوا۔ کہ غیر ملک میں جاکر لین دین۔ کام کاج میں پہلے فقط اسموں سے کام نکالنا پڑتا ہے۔ مثلاً روٹی چاہیئے۔ تو پیسے دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نان۔ یعنی پیسے موجود ہیں۔ روٹی دو۔ دکان دار روٹی دکھاتا ہے۔ اور اُنگلی کا اشارہ کرتا ہے۔ یعنی

ایک پیسہ یا دو پیسے - اسی طرح گھی - نمک وغیرہ - چند روز کے بعد کچھ فعل یاد ہو جاتے ہیں - حرف سیکھ لیتا ہے - اسی کہنے سُننے میں آدھے سارے جملے جوڑنے لگتا ہے - باعتبار ولادت کے اشارت کا نمبر اول تھا - لیکن کلام بہت اچھی کارگزاری کرتا ہے - اس لئے زبان اس پر چرب ہوئی - اور ادائے مطلب کا کام اٹھا لیا +

الفاظ جن سے زبان کا کام چلتا ہے کیونکر پیدا ہوئے؟

ایک گروہ کثیر ایک ہی دادا کی اولاد ہو - لیکن جب کنبہ کنبہ ایک ایک پہاڑی یا قطعہ قطعہ زمین پر الگ الگ بستے ہوں - تو ضرور ہے - کہ ضرورت وقت یا قدرتی اتفاق اُن میں نئی چیزیں پیدا کریں - اور ظاہر ہے - کہ ہر مقام میں ایک ہی چیز کا جدا جدا نام پکارا جاے گا - کچھ عرصہ کے بعد ایک ہی چیز کے لئے مختلف مقاموں کے نام جمع کریں - تو ہر چیز کے لئے کئی کئی نام ہونگے - پھر جب کہ سلطنت کا امن یا باہمی ارتباط آمد و رفت کے نئے جال پھیلائے - اور تعلیم و تربیت عام ہو جائے - تو بہت سے نام خود بخود گر جائیں گے - اور ہر شے کے لئے ایک نام رہ جائیگا - وہ کبھی تو مناسبت کے سبب سے زیبا و برجستہ ہوگا - اور کبھی جو بندھ گیا - وہی موتی - اس وقت یہ ضرور ہے کہ ہر شے کو نام خاص سے پکارنے کے لئے سب کا اتفاق ہوگا - اب اگر کوئی پوچھے کہ لفظ کیا شے ہے؟ - تو تم کہہ سکتے ہو - کہ وہ ایک زبانی تصویر ہے یا پکا نشان ہے کسی چیز کا - یا فعل کا +

دنیا ہمیشہ ترقی کے رستہ میں رواں ہے - کیسی ہی ابتدائی حالت ہو شائستگی پھیلے جائیگی - علوم اور فنون کی دستکاری نئی چیزیں پیدا کریگی - لین دین جسے ترقی نے تجارت کا خطاب دیا ہے - ایک جگہ کی چیزیں دوسری جگہ پہنچائیں گے اس سبب سے بھی نئے الفاظ ہر جگہ پیدا ہونگے - اور ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچیں گے - کیونکہ چیزیں اور کام نئے ہیں - دیکھو یہی سبب ہے کہ دیہات

میں الفاظ کم ہوتے ہیں۔شہروں میں بہت۔ اور شہری الفاظ کی خوش آوازی۔خوش ادائی۔ اور لطافت گاؤں والوں کو اپنی شاگردی پر مجبور اور مشتاق کرتی ہے۔اسی کو خاص و عام کا اتفاق کہتے ہیں۔اور اس سے الفاظ اور اصطلاحیں پیدا ہوتی ہیں +

اب کوئی پوچھے کہ تقریر کیونکر پیدا ہوئی ؟ تم صاف کہہ دو گے۔کہ انسان میں جو چیخنے یا چلّانے کی خاصیت ہے۔ دو باہمی ضرورتوں اور آپس کے برتاؤ سے اصلاح اور ترقی کرتے کرتے تقریر ہوگئی۔اور رفتہ رفتہ یہ رُتبہ پیدا کیا۔ کہ جس طرح ایک مصوّرِ کامل کسی انسان یا باغ یا محل کا نقشہ کھینچ کر اس کی کیفیت آنکھوں کے رستے سمجھاتا ہے۔ صاحب زبان اپنے مافی الضمیر اور حرکت اعضا کے مجموعہ کو آواز کے رنگ میں کانوں کے رستے سمجھاتا ہے۔پس گویائی گویا ایک عمدہ آلہ ادائے خیال کا ہے۔لیکن نامکمل۔کیونکہ کونسا قادرالکلام ہے۔جو دل کے خیال کو جوں کا توں پورا پورا اپنے لفظوں میں ادا کردے۔عمدہ سے عمدہ کلام دل کے خیالات کی تصویر ہے۔لیکن ایسے پانی میں ہے جو گدلا ہے۔یا عکس ہے ایسے آئینہ میں جو دھندلا ہے +

تم نے خیال کیا ؟ زبان یعنی تقریر گویا انسان کے دل۔انسان کی خواہش اور اُس کے حرکات اعضائی کا مجموعی خلاصہ ہے۔اسی خیال سے زبان عرب کے ابتدائی محققوں میں **عبادبن سلیمان ضمیری** نے کہہ دیا۔کہ "الفاظ اپنے حروف۔اعراب اور آوازوں کے ذریعے سے خود بخود اپنے معنی بتلاتے ہیں"۔ مگر یہ رائے عموماً درست نہیں۔ **اصفہانی** نے **شرح منہاج بیضاوی** میں لکھا ہے۔کہ جمہور اہل لغت اس پر اعتراض کرتے ہیں۔اور کہتے ہیں۔اگر یہی بات ہوتی۔تو ہر شخص ہر لفظ کے معنی سمجھتا۔بتانے اور لغت میں دیکھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔دوسرے اکثر دیکھا جاتا ہے۔کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوتے ہیں۔جو باہم مخالف ہیں۔اگر الفاظ بالطبع اپنے معنوں پر دلالت کرتے۔تو یہ کیونکر ہوسکتا تھا۔البتہ لفظ بھی بعض جگہ اپنے معنوں پر آپ اشارہ کرتا ہے۔دیکھو۔

تندرد (رعد) کو خیال کرو۔اس لفظ میں گرج زور و شور سنائی دیتا ہے یا نہیں ؟

دُرشت کو دیکھو۔ کرخت پر خیال کرو۔ سختی اور کھردراپن نہیں پایا جاتا؟
تیر کی ی کو مدّ کی کشش میں دیکھو۔ صاف نظر آتا ہے۔ کہ کوئی تیز چیز تیز رو ہے۔
کہ سیدھی چلی جاتی ہے +
خم یا خُنب بولنے میں بھی اپنی پھلاوٹ اور گلاوٹ کی تصویر دکھاتا ہے +
یورپ کے دانا کہتے ہیں۔ کہ پہلے طبیعت کی تاثیر نے حالت کے مناسب آوازیں
نکالی تھیں۔ پھر استعمال اور تہذیب نے انہی کو لفظ بنا دیا۔ یہ رائے قرین قیاس
معلوم ہوتی ہے +
چہچہہ بلبل کی آواز مسلسل کا نام ہؤا کو کو فاختہ کی آواز متواتر کا +
غرّش جانوروں کی خفگی کی آواز۔ قہقہہ انسان کی ہنسی +
غوغا۔ غُلغُلہ۔ غُلغُل۔ شور و غُل انسان کا ہؤا +
کوہستان خراسان و ایران کے کوے دیکھے۔ چیل سے ذرا چھوٹے ہوتے
ہیں۔ اور بولنے میں صاف کُلغ کُلغ آواز دیتے ہیں۔ کلاغ ان کا نام ہوگیا +
چغوک اسی آواز کے سبب سے چڑے کا نام ہؤا (یعنی چڑیا کا نر)
تم ضرور کہو گے۔ کہ اپنے رنگ آواز۔ اور ادا کے انداز اور دل کی حالت کو ملا
کر جو معنی چاہو۔ پیدا کر لو۔ اصلی لفظ میں تو ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بھی درست
ہے۔ لیکن میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ کہ زبان انسان کی آواز۔ دل اور اشارات اعضائی
کا مجموعہ ہے۔ اس صورت میں کسی جز کو روکنا نہیں چاہئے +
دلاوت زبان کی بنیاد تم نے دیکھ لی؟ پہلے کچھ اشارے تھے پھر کچھ آوازیں۔
پھر باہمی اتفاق سے کچھ الفاظ آپس کے سمجھنے سمجھانے کے لئے مقرر ہوگئے۔ پس
جب آفرینش بڑھے۔ اور آبادی پھیلے۔ تب بھی واجب ہے۔ کہ وہی الفاظ کام
میں لائیں۔ کہ سب کی سمجھ میں آئیں۔ اور عام فہمی کے سبب سے انہیں سب سے
پہلے کام میں لائیں +
زبان میں کسی کو اپنی طرف سے ایک لفظ بھی ایجاد کرنے کا اختیار نہیں ہے!
یہ ہو سکتا ہے۔ کہ میں شادمی کہوں اور اس کے معنی رکھوں آدمی۔ اسے شاید
میرے نوکر چاکر یا دوست آشنا سمجھنے بھی لگیں۔ مگر اور سب کب مانیں گے!

اور مانیں کیا ؟ اگر چند لفظ ایسے تصنیف کریں۔ تو کوئی میری بات بھی نہ سمجھے گا +

اسی بنیاد پر عرب کے اہل تحقیق نے کہا ہے۔ کہ **لغت** وہ ہے۔ کہ جس پر جمہور کا اتفاق ہو۔ **اصطلاح** وہ ہے۔ جس پر خاص گروہ کا اتفاق ہو۔ البتہ کوئی علمی مصنف یا صاحب ایجاد قادر الکلام شخص بھی الفاظ ایجاد کر سکتا ہے۔ لیکن اُن کے قیام عمر کے لئے اسے بھی جمہور کا حسن قبول حاصل کرنا پڑے گا +

عزیزان وطن ! ولادت الفاظ اور آفرینش زبان کے خیالات مجملاً آپ کے تصوّر میں آگئے ہونگے۔ اب یہ سنئے کہ فلسفی زبان کا منصب کیا ہے ؟ اُس کا منصب ہے تقریر کے ہر لفظ کو کریدنا جس سے کہ زبان مرکب ہے۔ اس سے شاید تم یہ سمجھے ہوگے۔ کہ فلسفی زبان کو اکثر زبانوں کے **لفظ** اور **معنی** خوب آتے ہونگے۔ وہ عبارت میں **مبتدا۔ خبر۔ مضاف۔ مضاف الیہ۔ صلہ۔ موصول** وغیرہ وغیرہ کو خوب سمجھتا ہوگا۔ نہیں ! یہ تو بہت ادنیٰ کام ہے۔ وہ لفظ کی اصل و نسل ولادت سے وقتِ موجود تک دریافت کرتا ہے۔ تم نے کسی نیا ریئے یا تیزابیئے کو دیکھا ہے ؟ جب ایک دھات کی ڈلی اُس کے ہاتھ میں آتی ہے۔ تو وہ اُسے دیکھتا ہے اور جانچتا ہے کہ ایک مادہ ہے یا کئی مادے گتھے ہوئے ہیں۔ تب کبھی تیزاب سے کبھی آنچ کے زور سے گلا کر اُن کا جوڑ جوڑ کھول لیتا ہے۔ کہ اُس کی اصل کہاں پہنچی ہے۔ اسی طرح ماہر زبان ایک لفظ کو لیتا ہے۔ وہ تیزاب یا آنچ کام میں نہیں لاتا۔ فقط عقل کے تیزاب سے حرفوں کے جوڑ بند کھولتا ہے اور معنوں کو سوچ کر اس کی ساری اصل نسل دریافت کر لیتا ہے +

میرے دوستو ! تم حیران ہوگے۔ کہ لفظ کی ولادت اور نسل کیا ؟ ہاں لفظ کی بھی ولادت اور نسل ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح معلوم ہوتی ہے۔ کہ فلسفی لفظ کے جزو جزو کو الگ کرتا ہے۔ اور دیکھتا ہے۔ کہ وقت بوقت اُن کی اصل کس کس ملک اور کس کس قوم میں پہنچتی آئی ہے۔ اُن میں کیا رشتے ہیں ؟ اور کیونکر وہ رشتے پیدا ہوئے ہیں ؟ اور ملک بملک اُن کے معنوں یا حرفوں میں کیا تغیر پیدا ہوئے ہیں۔ پھر اور زبانوں کے لحاظ سے اپنی باتوں پر غور کرتا ہے۔ اُن کے نتائج کو بھی جانچتا ہے۔ اور مطابقت اور مقابلہ کرتا ہے +

یعنی ایک زبان کے لفظ دوسری زبان سے کن کن باتوں میں متفق ہیں۔ اور کون ہی باتیں ہیں۔ کہ ایک ہی کے لئے خاص ہیں۔ پھر اُن سببوں کی جستجو کرتا ہے۔ جو زبان میں تبدیلی کا عمل کر رہے ہیں۔ اور یہ غیر منقطع کام ہے کبھی ترقی کے رنگ میں ہوتا ہے۔ کبھی تنزل میں۔ مگر جاری ہمیشہ رہتا ہے۔ اور اسی کو زبان کی اصل نسل کہتے ہیں۔ اب چند مثالیں توضیح مطلب کے لئے لکھتا ہوں :۔

گریبان کو فلسفی زبان نے دیکھا۔ **بان** پر جوڑ معلوم ہؤا۔ اس نے گرے کو دیکھا۔ تو فارسی قدیم میں بمعنی **گلو** پایا۔ سمجھ گیا۔ کہ اس جز و لباس کا گلے پر قبضہ ہے اس لئے اس کا نام گریبان رکھا ہوگا۔ کہ مالک گلو ہے سنسکرت میں دیکھا تو وہاں گریو (ग्रीव) انہی معنوں میں آیا ہے۔ اور **بان** سنسکرت میں **وان** (वान) ہے۔ ثابت ہوگیا۔ کہ ایک گھرانے کی نسل ہے۔ ملک اور مدت کے انقلاب سے آواز بدل گئی۔ یہاں مرگیا۔ وہاں جیتا ہے ۔

کلابتون کو سب پہنتے ہیں۔ اور خوش ہوتے ہیں۔ فلسفی زبان اُس کا بل کھولتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ **کلابہ**۔ کلاوہ (سوت کا لچھا) **آلتون** ترکی میں سونے کو کہتے ہیں۔ وہی سنہرا لچھا ہؤا ۔

نیلوفر کو بے خبر آدمی ایک گلِ خود رَو سمجھے گا۔ فلسفی زبان دیکھے گا۔ کہ **نیلوپر نیلوفل**۔ **نیلوپل**۔ **نیلپر** سب طرح مستعمل ہؤا ہے۔ تب ادھر اُدھر نظر دوڑائیگا اس وقت معلوم ہوگا۔ کہ سنسکرت میں نیل (नील) نیلا۔ اُت پل ( ) پنکھڑی ہے۔ یعنی نیلی پنکھڑی والا پھول۔ فارسی میں ادل بدل ہوکر کچھ سے کچھ ہوگیا۔

ناہار اور **نہار** ہندوستان میں بھی سب جانتے ہیں۔ فلسفی زبان نے دیکھا **تون** پر جوڑ معلوم ہؤا۔ **اہار** کو دیکھا۔ تو فارسی بلکہ سنسکرت میں بھی بمعنی خورش آیا ہے۔ سمجھ گیا۔ کہ صبح سے جب تک کچھ نہ کھایا ہو۔ اس وقت تک ناہار یا نہار ہے ۔

خربزہ کو سونگھا۔ تو بُو آئی کہ مرکب ہے۔ خر کو دیکھا بمعنی **کلاں** بھی آتا ہے۔ **بزہ** کو دیکھا۔ تو فارسی قدیم میں بمعنی ثمر ہے۔ سمجھ گیا۔ کہ بڑا پھل تھا۔ اس لئے **خربزہ** نام رکھا ہوگا۔ سنسکرت میں بھی بعینہٖ یہی دو جز۔ اور یہی معنی ہیں ۔

میرے دوستو! تم دل میں کہتے ہو گے۔ کہ اس توڑ جوڑ اور لفظوں کے رگ

پڑھے چیزنے سے کیا فائدہ ؟ جب ہم ایک زبان سیکھتے ہیں۔ تو اس میں یہی غرض ہوتی ہے کہ اور کی بات سمجھ لیں۔ اپنی بات سمجھا دیں۔ اس کے لئے اتنا کافی ہے۔ کہ لفظوں کے معنی آ گئے۔ عبارت کا مطلب معلوم ہو گیا۔ والسلام۔ میں بھی کہتا ہوں۔ بیشک زبان سیکھنی ہو۔ تو اس سے زیادہ کاوش کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ذرا خیال کر کے دیکھو۔ جب تم کوئی شکل اقلیدس کی حل کرتے ہو یا ایک حساب کے سوال کا جواب نکال لیتے ہو۔ یا ایک بچہ کوئی پہیلی بوجھتا ہے۔ تو کیا خوشی ہوتی ہے ! ہزاروں پھول۔ پھل۔ بوٹیاں۔ نباتات۔ جمادات ہیں۔ اگر ان کے مزے اور اصلی تاثیریں معلوم کر کے تمہیں خوشی حاصل ہوتی ہو گی۔ تو لفظوں کی اصلیت دریافت کر کے بھی ضرور خوشی ہو گی۔ جن الفاظ کی توضیح میں نے بیان کی۔ انہیں سن کر کس کے دل کو فرحت نہیں ہوئی ؟ البتہ بدمزہ۔ بے مغز ہے کہ الفاظ کو فقط منہ کی بھاپ یا پیٹ کا سانس سمجھتے ہیں۔ انہیں خبر بھی نہیں ہوتی۔ ہونٹ سے لفظ نکلے ہوا ہو گئے۔ اُن کے نزدیک کچھ بات ہی نہیں ؛

الفاظ ظاہر میں ہوائی جنبشیں ہیں لیکن حقیقت میں مستقل چیزیں ہیں تم ضرور پوچھو گے۔ کہ **الفاظ** مستقل چیزیں کیونکر ہو سکتے ہیں ؟ ہم کہتے ہیں کہ جب تمہیں کوئی چیز مثلاً چاکو یا قلم درکار ہوتا ہے۔ اگر ایک لڑکے سے بھی کہتے ہو۔ تو فوراً اُٹھا لاتا ہے۔ دور ہو یا پاس۔ حالانکہ تم نے فقط لفظ کہا تھا **چاکو یا قلم** کی تصویر بنا کر نہیں دی۔ دیکھو لفظ نے اس کے دل پر اصل شے کا کام دیا ؛

تم لفظوں میں فقط اتنا ہی نہ سمجھو کہ برائے نام خاص خاص چیزوں پر اشارے کرتے ہیں۔ غور کرو گے تو پاؤ گے۔ کہ وہ بھی اور چیزوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ ترقی و تنزّل کرتے ہیں۔ سفر کرتے ہیں۔ اور اس میں طبیعت اور رنگ بدلتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں۔ ان کے حالوں۔ چالوں اور انقلابوں کو دیکھو گے۔ تو معلوم ہو گا۔ کہ جس طرح قوموں کی تاریخیں اپنے حالات و مقالات سے کملائے ہوئے دلوں کو شگفتہ کرتی ہیں۔ لفظوں کی تاریخیں اپنے لطف و خوبی کے ساتھ اس سے زیادہ دماغوں کو شاداب کرتی ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا فائدہ ہو گا۔ کہ لفظوں ہی کے مقابلہ اور مطابقت میں قوموں۔ نسلوں اور اُن کے خاندانی رشتوں کے

سر رشتے نکل آئے +

الفاظ کے تغیرِ طبیعت اور اُن کے رنگ بدلنے پر تمہیں ضرور کھٹکا گزریگا۔ کہ اسما حقیقت میں اشیا کے نام ہیں۔ جب چیزیں نہیں بدلیں اور نام ان کے بدل گئے تو الفاظ اور معانی میں عجب خلط ملط پیدا ہوگا۔ میرے دوستو! یہ تغیر ضرور ہوتے ہیں۔ اور وہ قباحت نہیں پیدا ہوتی۔ جس کا تمہیں خطر ہے۔ دیکھو؟

جیب۔ عرب میں اول سینہ کو اور دل کو بھی کہتے تھے۔ پھر **گریبان** کو کہنے لگے کہ سینہ پر ہوتا ہے۔ بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ **جَوْب** بمعنی قطع ہے **گریبان** کترا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے اُس کا نام **جیب** رکھا۔ عرب کے لوگ **جبّہ** یا کرتہ کے گریبان میں ایک تھیلی ٹانک کر اس میں چیز رکھ لیا کرتے تھے۔ مدت کے بعد اسی کا نام جیب ہوگیا +

فارس میں وہ تھیلی گریبان سے ڈھلک کر کے نیچے آگئی۔ اور نام وہی جیب رہا۔ تماشا یہ کہ اب گھڑی کے شوقینوں نے چھاتی کے بائیں طرف جگہ دی۔ اور کوٹ پتلون والوں نے کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ پھر بھی وہ **جیب** ہے۔ اور عرب میں جیب وہی گریبان ہے +

جب عرب میں **علم ریاضی** کا چرچا اور **علم مثلث** کا یونانی سے ترجمہ ہوا۔ تو جو خط کسی **قوس** یا اُس کے زاویہ کا اندازہ بتائے اُسے **جیب** کہنے لگے۔ کیونکہ وہ بھی **قوس** کے لئے ایسا ہے جیسے سینہ کے لئے گریبان +

شمع عرب میں موم کو کہتے ہیں۔ پھر موم کی شمعیں بننے لگیں۔ ان کا نام بھی شمع ہی رہا۔ **فارس** میں آکر چربی کے قالب میں ڈھلیں۔ یہاں **شمع** عام ہوگئی۔ موم کی بتی ہو خواہ چربی کی۔ عرب میں شمع وہی موم ہے +

اسباب عربی میں جمع سبب کی ہے۔ فارسی میں اسباب خانہ داری کو کہتے ہیں +

شراب عرب میں پینے کو اور اس چیز کو کہتے ہیں۔ جو پینے میں آئے۔ فارس میں مرادف بادہ ہوگیا +

(۱) بعض الفاظ سفر کر کے آتے ہیں۔ اور ملک غیر میں بے عزت ہو جاتے ہیں۔

غلام۔ عرب میں نوخط لڑکے کو کہتے ہیں۔ فارس میں **لونڈی** کا نر **غلام** +

مہتر فارسی میں سردار کو کہتے ہیں۔ ہندوستان میں **چوڑھا** ہوگیا +
خلیفہ کا رتبہ عرب میں نائب پیغمبر اور خلیفۂ الٰہی تک پہنچا ہوا ہے۔ ہندوستان میں نائی کو کہتے ہیں + اس زمانہ میں لفظ ایجاد نہیں ہوتے۔ نئے خیالات کے ادا کرنے میں پرانے الفاظ مدد کرتے ہیں۔ مثلاً :-
نفط رال کا مرادف ہے۔ اب **مٹی کے تیل** کو بھی کہتے ہیں +
مداد پہلے سیاہی کو کہتے تھے۔ اب پنسل کو بھی کہتے ہیں۔ پہلے **قلم سرمہ** اور **کلک فرنگی** کہتے تھے۔ یہ لفظ مر گئے +
بوقلموں چند سال سے **فیل مرغ** (پیرو) وہاں پہنچا ہے۔ اُسے **بوقلموں** کہتے ہیں +
(۲) کبھی دو لفظ مرکب کر لیتے ہیں۔ مثلاً :-
سیب زمینی آلو کو کہتے ہیں۔ یہ بعینہ ترجمہ ہے **پومے ٹو** کا۔ پس معلوم ہوا کہ فرانس کے رستہ سے پہنچا ہے
آبجوش سوڈا واٹر کو کہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ ہزاروں لفظ پیدا ہو گئے ہیں +
(۳) کبھی مشتق کر لیتے ہیں۔ وہاں بھی اب برف کوزوں میں جماتے ہیں اُسے **بستنی** کہتے ہیں +
(۴) کبھی جو شے آتی ہے اپنا نام ساتھ لاتی ہے۔ **تلگراف** ایران میں تار کے پیغام کو کہتے ہیں۔ اس میں تصرف کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ ہشت روز است خط نوشتہ بودم۔ جواب نیامد۔ ناچار امروز **تیل** زدہ ام (آج میں نے تار دیا ہے)
منات نوٹ کو کہتے ہیں۔ روسی لفظ ہے +
پرتغال ایک قسم کا رنگترہ ہے۔ اس کا پودا پرتگال سے آیا تھا۔ وہی نام ہوگیا
کالسکہ بگی کو کہتے ہیں۔ یہ بھی روسی لفظ ہے۔ ایسے لفظ ایران میں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ اور اکثر چیزوں کے نام بدل گئے ہیں۔ پہلے ناموں کو سمجھو کہ مر گئے +
چاپ چھاپے کا کام ہندوستان سے گیا۔ اسی واسطے یہ نام پایا۔
(۵) علمی الفاظ اور علمی اصطلاحیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اکثر زندہ رہتی ہیں۔ اور

کارروائی کرتی ہیں۔ علم ہمیشہ ترقی کرتا ہے۔ اور اصلاح پاتا ہے۔ اس لئے بعض الفاظ جلد مرجاتے ہیں۔ نئے پیدا ہوجاتے ہیں۔ آج سے ۳۰ برس پہلے کی ریاضی یا جغرافیہ کی کتاب اردو زبان میں دیکھو تو یہ تعجب جاتا رہیگا +

(۶) خوش ایجاد نام بھی اکثر کم عمر اور ناپائدار ہوتے ہیں +

محمود غزنوی جب ہندوستان میں آیا۔ اور آم کھایا۔ تو بہت بھایا۔ مگر نام سن کر ہنسا اور کہا سخت ستم ہے کہ ایسا لطیف میوہ اور نام میں یہ نحش! اسے نغزک کہنا چاہئے کہ اسم با مسمّٰے ہو۔ چنانچہ بعض فارسی کتابوں میں نغزک بعض میں انبہ لکھتے ہیں۔ امیر خسرو نے قران السعدین میں ہندوستان کے میووں کی تعریف کرتے کرتے آم کے باب میں بھی چند اشعار لکھے ہیں ؎

نغزک خوش مغز کن بوستاں　　خوب تریں میوۂ ہندوستاں

نعمت خاں عالی نے اپنے دوست حسن خاں کو آموں کی رسید لکھی۔ اس کی نظم میں ایک شعر ہے کہ نہیں بھولتا ؎

ابنہ فرستاد حسن خان بمن　　اَنْبَتَہُ اللّٰہُ نَبَاتًا حَسَنًا

اکبر نے صدہا چیزوں کو ناموں کے خلعت دیے۔ کوئی باقی ہے کوئی پرانا ہو کر پھٹ گیا۔ ایک دن اصطبل خاصہ میں گھوڑوں کے دیکھنے کو آیا۔ حلال خور ٹوکرے بھر بھر کر کشافتیں اٹھا رہے تھے۔ فرمایا کہ بڑی محنت کی روٹی کھاتے ہیں انہیں حلال خور کہنا چاہئے۔ آج تک وہی نام چلا آتا ہے +

ہار کو کہا کہ سنگار کی چیز۔ اور مبارک چیز پر ہار کا نام آنا بدشگونی ہے۔ اسے پھل مال کہا کرو + یہ سرسبز نہ ہؤا +

اسی خیال سے گھوڑے کی اندھیری کا اُجیاری نام رکھا۔ پیش نہ گئی۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جسے اب ہم اندھیری کہتے ہیں۔ اس وقت اسے بھی اندھیاری کہتے تھے +

جہانگیر نے شراب کا نام رام رنگی رکھا۔ مگر رنگ نہ جما +

جمعرات کا نام مبارک شنبہ رکھا کہ جو خوشی ہمیں ہوتی ہے اکثر اسی دن ہوتی ہے۔ پیر کا نام گم شنبہ رکھا۔ لکھتا ہے کہ مجھے جو غم یا فکر ہوتا ہے۔ اسی دن ہوتا ہے

اس کا نام ایام ہفتہ سے گم ہونا چاہئے +

محمد شاہ نے بلبل ہندوستان کا نام گلدم رکھا تھا۔ اب تک اسی طرح چلا آتا ہے۔

رنگترہ کو پہلے سنگترہ کہتے تھے۔ محمد شاہ نے کہا کہ اس لطیف میوہ کو پتھر مارنا ستم ہے رنگترہ کہا کرو۔ کہ خوش رنگ بھی ہے۔ تر و تازہ بھی ہے +

شاہ عالم نے سرخاب کو گلسرہ کہا۔ مگر شہرت نے نامنظور کیا +

کنجر اور کنجری ہندی میں زن رقاصہ کو کہتے تھے اکبر نے ایک دن خوش ہو کر کہا۔ کہ انہیں کنچنی کہا کرو +

نواب سعادت علی خاں نے ملائی کا نام بالائی رکھا۔ اہل لکھنؤ اب بھی بالائی کہتے ہیں۔ اور شہروں میں شہرت نہ ہوئی +

عزیزان وطن! تم ضرور کہتے ہو گے۔ کہ زبان کی عمر کیا؟ اور اُس کی تاریخ کیا؟ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ عالم میں بہت سے ملک۔ بے شمار اہل ملک اور ہزاروں قومیں ہیں۔ اسی طرح زبانوں کا بھی عالم گروہ در گروہ سمجھو۔ کہ تھا۔ اور ہے۔ اور ہوتا رہیگا۔ جس طرح قومیں بڑھیں۔ چڑھیں۔ ڈھلیں اور فنا ہوگئیں اور ہونگی۔ اسی طرح زبانوں کا عالم ہے۔ کہ اپنے الفاظ کے ساتھ آباد ہے۔ وہ اور اس کے الفاظ پیدا ہوتے ہیں۔ ملک سے ملک میں سفر کرتے ہیں۔ حروف و حرکات اور معانی کے تغیّر سے وضع بدلتے ہیں۔ بڑھتے ہیں۔ چڑھتے ہیں۔ ڈھلتے ہیں اور مرجھی جاتے ہیں +

تغیرات مذکورہ اکثر تغیّر سلطنت کے صدمہ سے ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے۔ کہ کم ہوتے ہیں۔ پھر بھی ضرور ہوتے ہیں۔ کیونکہ عادت الٰہی اسی طریقے پر جاری ہے۔ اور رہیگی۔ اور میں عنقریب اس کی کیفیت دکھاونگا +

امن و عافیت کے زمانہ میں بھی تغیّر کی دستکاری الفاظ و عبارت پر اپنا کام کئے جاتی ہے۔ ان میں آفرینش۔ ترقی اور فنا کا عمل جاری رہتا ہے۔ اور بہت چپکے چپکے چلتا ہے۔ لیکن اسی طاقت اور اسی انداز سے۔ جیسے دریا کا بہاؤ یا ہوا کا رخ جس کا پھیر کسی کے اختیار میں نہیں۔ قوم اپنے گھر میں قائم اور ملک برقرار ہوتا ہے۔ پھر بھی تغیر مذکور اپنا کام کئے جاتا ہے۔ نثر میں شیخ بو علی سینا کی حکمت فارسیہ وغیرہ۔ نظم

ہیں دیوان شاہ ناصرخسرو۔ شاہنامہ وغیرہ۔ دیکھ لو۔ صدہا لفظ ہیں۔ کہ اب بولنے میں نہیں آتے۔ صدہا ہیں۔ کہ فرہنگوں میں دیکھے بغیر معنی نہیں معلوم ہوتے۔ صدہا ہیں کہ فرہنگوں میں بھی نہیں ملتے۔ اسی کو مرنا کہتے ہیں +

جب ایک زبان کی تصانیف مختلف کو عہد بعہد اور سال بسال برابر سجاتے ہیں۔ اور تغیرات مذکورہ پر نظر کرتے ہیں۔ تو زبان کا عالم ایک سرزمین معلوم ہوتی ہے۔ کہ فصل بہ فصل پرانے نباتات جل کر خاک ہوتے جاتے ہیں۔ اور نئے اُگ کر ان کی جگہ کو پُر کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے۔ کہ فلسفی زبان خواہ زمین کی طبیعت سے خواہ انسان کی ضروریات اور کارروائی پر نظر کر کے فقط تغیرات زبان کی تاریخ ہی نہیں جان لیتا بلکہ جس طرح ایک تجربہ کار مورخ یا سلطنت کا مدبّر سابق اور موجود حالت کو دیکھ کر آئندہ کے واقعات پر پیش بینی کرتا ہے۔ یہ زبان موجودہ کے حالات پر حکم لگاتا ہے اور بتاتا ہے۔ کہ آئندہ کس طرح اور کس انداز میں بڑھیگی۔ یا دب جائیگی چنانچہ فارسی پر ایک زمانہ میں عرب کی چڑھائی تھی۔ اب ممالک یورپ کا زور نظر آتا ہے + الفاظ جو سفر و سیاحت کر کے ملک غیر سے آتے ہیں۔ اور زبان میں گھر بناتے ہیں وہ اکثر تجارت کی وکالت یا قوموں کے ارتباط سے راہ پاتے ہیں۔ زبانوں میں عام دستور یہ ہے۔ کہ بعض لباس۔ بعض کھانے۔ بعض اجناس۔ بعض علمی مطالب اور اُن کے سامان ملک غیر سے آئے۔ وہ یا تو اپنے نام ساتھ لائے یا یہاں آکر یہیں کی زبان سے نام پائے۔ فارس میں عرب کا تسلط ہوا۔ اور ملک۔ مملکت۔ مذہب سکونت سب کو روک لیا۔ کہ یہی رستے زبان کے استقلال یا انقلاب کے تھے۔ اہل ملک بہت تو مسلمان ہو گئے۔ بہت سے آوارہ ہو گئے۔ اور جو بھاگنے کے قابل ہی نہ تھے۔ وہ گم نامی کے غاروں اور پہاڑوں میں بیٹھ رہے زبان قومی کی حفاظت کون کرتا؟ علوم۔ فنون۔ کتابیں اور علمی سامان جو یونان سے پہلو مارتے تھے۔ اس طرح فنا ہوئے۔ کہ نام و نشان تک نیست و نابود ہو گئے۔ پھر جو علم۔ ادب اور شائستگی نے رونق پھیلائی۔ وہ علما اور شرفاے عرب سے پھیلی۔ یا اُن نومسلموں سے جنھوں نے عربیت اور اسلام کا جامہ پہن لیا تھا۔ اور اسی کو فخر سمجھتے تھے۔ اقبال سلطنت ایک ایسی برکت

ہے۔ کہ جس قوم کے ہاتھ کو لگ جاتا ہے۔ اس کو ہر چیز بلکہ بات دیکھنے والوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔

زبان کا جینا اور مرنا

زبان اپنے کمال جوانی اور زندگانی پر شمار کی جاتی ہے۔ جب کہ اُس کے ذخیرہ میں ہر علم۔ ہر فن کی تصنیفات ہوں۔ اور ہر قسم کے حالات و مطالب کے ادا کرنے کے واسطے الفاظ و محاورات کے سامان حاضر ہوں۔ اُس کا مضائقہ نہیں کہ الفاظ مذکورہ خاص اسی کے ملک کی آفرینش ہوں۔ خواہ غیر ملکوں سے آئے ہوں۔ زبان کا استقلال اور آئندہ کی زندگی چار ستونوں کے استقلال پر منحصر ہے۔ (۱) قوم کا ملکی استقلال۔ (۲) سلطنت کا اقبال (۳) اُس کا مذہب (۴) تعلیم و تہذیب اگر یہ چاروں پاسبان پورے زوروں سے قائم ہیں۔ تو زبان بھی زور پکڑتی جائیگی ایک یا زیادہ جتنے کمزور ہونگے۔ اتنی ہی زبان ضعیف ہوتی جائیگی۔ یہاں تک کہ مرجائیگی۔ مرنا اس کا یہی کہ خواص و عوام کی زبانیں اس کے بولنے سے اور قلم اُس کے لکھنے سے منہ پھیر لیں۔ یعنی نہ کہیں بولی جاوے۔ نہ اس میں تصنیف کا رواج رہے۔ زبان کا انقلاب کلی اکثر انقلاب تاریخی سے ہوتا ہے۔ وہ طوفان اُسے چاروں طرف سے تہ و بالا کر دیتا ہے۔ اور اسی میں اکثر زبانیں فنا ہو جاتی ہیں۔

علم الاخلاق

جناب سید کرامت حسین صاحب سابق جج ہائی کورٹ (الہ آباد)

منطق۔ ریاضی۔ طبیعیات۔ طب وغیرہ دنیوی علوم صحیحہ سب آدمیوں کے لئے ایک ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ یہودی ہوں یا نصرانی۔ دہریہ ہوں یا لااوریہ۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ سالمات مادہ میں دہریہ کے نزدیک باہم میل طبیعی ہو اور لااوریہ کے نزدیک اُن کو نفرت ہو عالم کی تمام کائنات مقررہ اصول پر چل رہی ہیں۔ وہ سب کے لئے یکساں ہیں اور اُن کے دریافت کی راہیں اور قوتیں سب میں ایک قسم کی ہیں۔ مذہبوں کے اختلافوں سے عالم کی سچی معلومات میں اختلاف نہیں ہوسکتا۔ سچ ہمیشہ سچ ہے اور ہمیشہ سچ رہے گا۔ وہ سب کے لئے ایک ہے اُس میں اختلاف ممکن نہیں۔ اختلاف وہیں ہے جہاں غلطی ہے اور غلطی وہیں ہے جہاں استنباط اور قیاس ہیں۔ علوم صحیحہ کی معلومات سب کے لئے ایک ہونے کے سبب یہ ہیں۔ علوم صحیحہ واقعات پر مبنی ہیں۔ اُن میں تجربہ کرنے اور کلیات بنانے کے واسطے دنیا کے سب لوگ شخصی اور نوعی تجربہ اور عقل ہی سے کام لیتے ہیں۔ کسی اور ذریعہ کو دخل نہیں دیتے۔

علوم صحیحہ کے مسلمات مقرر ہیں۔ اُن کی تعریفیں اور موضوع معین ہیں۔ جن چیزوں سے اُن میں بحث ہوتی ہے وہ بھی معین ہیں جو غرضیں ان علموں کی ہیں وہ بھی معین ہیں۔ جن علت و معلول کے علاقوں سے اُن علموں میں بحث ہوتی ہے وہ بھی قابل ادراک ہیں فوق الطاقۃ البشریہ نہیں۔

علم الاخلاق کے مسلمات اگر معین ہوں۔ اس میں بھی صرف شخصی اور نوعی تجربہ اور عقل سے کام لیں۔ اُس کی تعریف اور موضوع کو مقرر کریں۔ جن چیزوں اور علاقوں سے اس میں بحث ہوگی وہ بھی معین کریں۔ اس کے علمی و عملی غرضیں مقرر کریں تو علم الاخلاق علوم صحیحہ میں داخل ہو جاوے۔ محققین یورپ سے خوشہ چینی کرکے میں اس رسالہ میں بیان کرتا ہوں کہ علم الاخلاق کے مسلمات معین ہیں۔ اُس کے اصول و کلیات تمام نوع انسان کے لئے ایک ہیں۔ اختلاف مذہب اس کے اصول و کلیات کو بدل نہیں سکتا۔ اس رسالہ میں صرف علم الاخلاق کا ذکر ہے مذہب سے بحث نہیں۔

ہر شخص اُس کا مذہب کچھ ہی ہو اصول رسالہ ہذا پر عمل کر کے راحت سے عمر طبیعی تک پہنچنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اور جہاں تک اُس کے ارادی افعال کو راحت میں دخل ہے کامیاب ہوگا۔

علم الاخلاق کے مسلّمات

جیسے اور علوم صحیحہ کے مسلمات ہیں۔ اور بے اُن کے اُن علوم کے کلیات نہیں بن سکتے ایسا ہی علم الاخلاق کے بھی مسلمات ہیں جن کے بغیر علم الاخلاق کے کلیات نہیں بن سکتے۔

پہلا مسلمہ یہ ہے کہ آدمی راحت سے زندہ رہنا چاہتا ہے مرنا نہیں چاہتا۔ نوعی تجربہ نے اس خواہش کو طبیعی کر دیا ہے اور سب ایسا ہی چاہتے ہیں جیسے آدمی زمان و مکان کے تعقل سے خالی نہیں ہو سکتا ہے اور دونوں اُس کے عقلی فطرت ہیں ایسا ہی آدمی راحت سے جینے کی خواہش سے خالی نہیں ہو سکتا اور وہ اُس کے لئے اخلاقی فطرت ہے کوئی آدمی دنیا میں ایسا نہیں جس کے نزدیک جینے کا مقصود ابدی اذیت ہو سکے۔

دوسرا مسلمہ یہ ہے کہ آدمی راحت پسند ہے چین سے بسر کرنا چاہتا ہے نوعی تجربہ نے زیست و لذت کو باہم کر دیا ہے اور موت اور اذیت کو۔ اس لئے ہر شخص آرام اور راحت چاہتا ہے تکلیف اور اذیت سے بچتا ہے جینے کے لئے راحت پسند ہونا ضرور ہے اور اسی وجہ سے طبیعی ہو گیا ہے جتنے استیثار کے کام آدمی اپنے لئے کرتا ہے راحت پسند ہونا اُن سب کی بنیاد ہے اور جتنے ایثار کے کام اوروں کے لئے کرتا ہے اُن میں بھی راحت پسندی کو دخل ہے۔

تیسرا مسلمہ یہ ہے کہ آدمی صحبت پسند ہے اور مدنی الطبع قانون قدرت نے اس کی ساخت اور اس کی ماحول کی خلقت ایسی بنائی ہے کہ تصاحب یعنی باہم رہنے سے اُس کے اسباب راحت بڑھ جاتے ہیں اور باہم رہنا اُس کے لئے ناگزیر ہے اور نوعی تجربہ نے اس باہم رہنے کی خواہش کو بھی طبیعی کر دیا ہے۔ جتنے ایثار کے کام آدمی اوروں کے واسطے کرتا ہے۔ وہ سب اسی باہم رہنے کی فطرتی خواہش پر مبنی ہیں۔ اور باہم رہنے کی خواہش اخلاقی شعور کی جڑ ہے۔

چوتھا مسلمہ یہ ہے کہ آدمی کے ارادی افعال کو آدمی کی راحت اور اذیت میں دخل

ہے وہ راحت یا اذیت کی علت تامہ نہیں مگر علت ناقصہ ضرور ہیں یہ خیال کہ ارادی افعال سے راحت مل ہی نہیں سکتی یا اذیت ہو ہی نہیں سکتی بالکل غلط ہے اگر ارادی افعال شخصی اور اہلی اور نوعی زیست اور اُن کی رقبوں کی علت نہ ہوں تو آدمی کو مکلف اور ذمہ دار کہنا بالکل غلط ہو اور تجربہ اور تربیت اور تعلیم اور علوم وفنون وقانون اور سیاست اور انتظام اور معاشرت سب کے سب عبث ہوں جب ارادی فعل کو زیست میں دخل ہی نہ ہو تو آدمی کا پھر کوئی فعل نہ اچھا رہے نہ بُرا۔ برائی بھلائی کی بنیاد تو اسی پر ہے کہ ارادی افعال کو زیست میں دخل ہے یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ آج انسان کے اعتبار سے صرف وہی چیزیں اچھی یا بری ہو سکتی ہیں جو راحت یا اذیت کے وسیلے ہوں بعض مضر ہیں بعض مفید۔

دخل کے معنی یہ ہیں کہ ارادی فعل آدمی کی زیست اور اس کے رتبے کی علت ناقصہ ہیں۔ علت تامہ نہیں اُس کے علاوہ اور بہت سی علتیں بھی درکار ہیں جب وہ سب جمع ہوں تب زیست باقی رہے یا اس کا رتبہ بڑھے۔ اگر تبریں زندہ آدمی کو بند کر دیں تو وہ کچھ ہی کرے زندہ نہ رہیگا۔ ایسا ہی اگر کسی گھر میں کھانا پانی نہ ہو تو اس میں کسی آدمی کو بند کر دیں تو وہ جتنے ارادی افعال چاہے کرے مگر آخر کو مر جائے گا۔

جیسے آدمی کے ارادی افعال زندہ رہنے کے تام علت نہیں ہیں ویسا ہی وہ اسباب راحت وغیرہ غرضوں کے حاصل کرنے کی بھی علت تام نہیں ہیں۔ لیکن جیسے وہ جینے کی علت ناقصہ ہیں ویسے ہی بہت سے اسباب راحت تو اغراض انسانی کی علت ناقصہ ہیں

اسی بات نے کہ ارادی افعال زیست وموت ولذت واذیت علم ودولت عزت وغیرہ اغراض انسانی کے حاصل ہونے کی علت ناقصہ ہیں۔ تدبیر وتقدیر کی لڑائی کو پیدا کیا ہے شاعر

قومی بجد وجہد نہادند وصل دوست ۔۔۔ قومے دگر حوالہ بتقدیر مے کنند

اگر انسان کے ارادی افعال مطلوبوں کے علت تامہ ہوتی تو تقدیر کی ضرورت نہ رہتی۔ سب کام تدبیر سے بن جایا کرتے ایسا ہی اگر ارادی افعال مطلوبوں کے علت ناقصہ بھی نہ ہوتے تو تدبیر سے کبھی کوئی مطلوب حاصل نہ ہوتا جو ہوتا صرف تقدیر سے ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ اُن صورتوں میں جن میں غرضیں ایسی ہوتی ہیں جن کے حاصل ہونے میں آدمی کے ارادی فعلوں کو دخل ہوتا ہے اور جن کے حاصل ہو جانے کی علت تامہ میں سے تمام علتیں سوا ارادی افعال کے موجود ہوتی ہیں تو وہ غرض افعال ارادی کرنے سے موجود

ہوجاتی ہے اور تدبیر سے کامیابی ہوتی ہے اگر غرض ایسی ہوتی ہے جس میں افعال ارادی کو دخل ہی نہیں یا افعال ارادی کو دخل تو ہے مگر افعال ارادی کے سوا باقی تمام علتیں موجود نہیں ہیں نہ وہ افعال ارادی سے موجود ہوسکتی ہیں تو وہ غرض افعال ارادی سے حاصل نہیں ہوتی اور محاورے میں کہیں گے کہ تقدیر میں نہ تھا۔

اگر پیاسا کنوئیں پر جاوے اور ڈول اور کافی مضبوط رسی موجود ہو اور اُس کے ہاتھ پاؤں میں پانی بھرنے کی طاقت ہو اور کنوئیں میں پانی ہو تو وہ کنوئیں میں سے ڈول رسی کے ذریعہ سے پانی بھر کر سیراب ہوگا۔ اور تدبیر غرض کے حاصل ہونے میں کافی ہوگی اگر کنوئیں تک جانا محال ہو یا رسی کافی لمبی یا مضبوط نہ ہو یا پیاسے میں پانی بھرنے کی طاقت نہ ہو تو وہ سیراب نہ ہوگا۔ اور کہینگے کہ تقدیر میں پانی نہ تھا۔

علم الاخلاق میں جبر و اختیار کے معنی

یہاں اس بحث کا لکھنا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ کہ علم الاخلاق میں جبر و اختیار کے کیا معنی ہونا چاہئے۔

یہ بات تنازع فیہ نہیں ہے کہ آدمی کو اگر ایسے کام کرنے کی خواہش ہو جو وہ کرسکتا ہے اور کوئی مانع نہ ہو۔ تو وہ اس کام کو کر دیگا۔ مثلاً قلم۔ دوات۔ کاغذ۔ وغیرہ سب ضروریات موجود ہوں اور پڑھے لکھے تندرست آدمی میں لکھنے کی خواہش پیدا ہو تو وہ لکھنا اس کے اختیار میں ہے وہ لکھ دیگا یعنی کسی ارادی فعل کی خواہش پیدا ہونے کے بعد اس کا کرنا آدمی کے اختیار میں ہے۔ بشرطیکہ اُس فعل سے کوئی اور مانع موجود نہ ہو۔ اختلاف اسباب میں ہے کہ آیا خواہشوں کا پیدا ہونا بھی آدمی کے اختیار میں ہے یا نہیں۔ اس زمانہ میں اہل تحقیق کی رائے یہ ہے کہ خواہش کا دل میں پیدا ہونا ایسے طبیعی اسباب کا نتیجہ ہے۔ جو آدمی کے اختیار میں نہیں کھانے کی خواہش جن اسباب سے پیدا ہوتی ہے وہ آدمی کے اختیار میں نہیں ایسا ہی پینے کی خواہش جن سے پیدا ہوتی ہے وہ بھی اس کے اختیار میں نہیں باقی ضروریات حیات کی یہی حالت ہے یہاں یہ عرض کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ کہ بعض اوقات خارجی اسباب انسان کو کسی ارادی فعل کے صادر کرنے پر

ایسا مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے ارادی فعل کے قانونی اور اخلاقی نتائج کا ذمہ دار نہیں رہتا۔ مثلاً اگر مسلمان کی گردن پر کوئی شخص تلوار رکھدے اور کہے کہ یا تم شراب چکھ لو یا میں تم کو جان سے مار ڈالونگا تو ایسی صورت میں شراب چکھ لینے کے اخلاقی نتیجہ کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ مذاہب اور علماء قانون و اخلاق درجہ مقرر کرتے ہیں جس تک پہنچ کر آدمی اپنے ارادی فعل کی ذمہ داری سے بری ہو جاتا ہے۔ لیکن اس حد کی تفصیل و تنقید کی ضرورت نہیں اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ فعل ارادی لازمی نتیجہ ہے خاص خواہش کا اور اگر وہ خواہش ایسے اسباب کا نتیجہ ہے جو اختیار سے باہر ہیں اور وہ خواہش علت تام اس فعل ارادی کی ہے تو وہ فعل گو فعل ارادی کی قسم ہے مگر اس صورت خاص میں اضطراری ہے۔ جیسے بھوکے کی خواہش کبھی اس حد تک پہنچتی ہے کہ نہ سونا محال ہو جاتا ہے جب چند قوتیں کسی جسم کے نقطۂ خاص پر عامل ہوتی ہیں تب وہ جسم علم جر تقبیل کے اصول کے موافق اس جہت میں حرکت کرتا ہے جس میں ان قوتوں کا حاصل اس جسم کو لے جاوے اور اگر ان قوتوں میں تقابل ہو اور حاصل صفر ہو تو وہ جسم کسی جہت میں حرکت نہیں کرتا بلکہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہتا ہے ایسا ہی انسان میں اگر متعدد خواہشیں پیدا ہوں تو اُن سب میں سے جو زیادہ قوی ہوگی فعل ارادی اس قوی خواہش سے صادر ہوگا اور اگر سب خواہشوں میں تقابل ہو کر صفر حاصل ہو تو اُن متعدد خواہشوں سے کوئی ارادی فعل صادر نہ ہوگا۔ یہ کہنا کہ آدمی میں خواہش کا پیدا کرنا اُس کے اختیار میں ہے کلیہ علت و معلول سے اس کو نکال دینا ہے اور یہ محال ہے کیونکہ خواہش انسانی حادث ہے اور حادث بے علل سابقہ کے موجود نہیں ہو سکتا مگر علم الاخلاق کو اس جبر و اختیار سے بحث نہیں ہے وہ علم النفس یا علم مابعد الطبیعہ میں ہونا چاہئے۔ علم الاخلاق کے لئے فاعل مختار ہے اور اپنے فعلوں کے اثر کا زیست پر ذمہ وار ہے اگر اس کے ارادی فعل سے شخصی یا اہلی یا نوعی زیست کو تصاحب اور تعامل کی حالت میں فائدہ ہو تو اخلاقاً وہ فعل اچھا ہے اگر ضرر ہو تو بُرا۔

پانچواں مسلمہ یہ ہے کہ کسی ایسی غرض کے حاصل کرنے کو جو زیست کے لئے ضرور ہو جب کوئی ذریعہ استعمال کیا جاتا ہے تب وہ ذریعہ رفتہ رفتہ خود لذت بخش ہو جاتا ہے اور لذت بخش ہونے کی وجہ سے مقصود بالذات ہونے لگتا ہے جسم کا پورا بالیدہ ہونا راحت سے عمر طبیعی تک پہنچنے کو مفید ہے اور کھیل کود سے جسم بالیدہ ہوتا ہے اس لئے کھیلنا کودنا

جو ذریعہ ہے جسم کے بالیدہ ہونے کا بچوں کو لذت بخش ہوتا ہے اور اصلی مقصود سے قطع نظر کرکے کھیل کود ان کا مقصود اصلی ہو جاتا ہے ماحول میں جو چیزیں موجود ہوں اُن کے مضر اور مفید اثر کو جاننا راحت سے زندہ رہنے کا ذریعہ ہوتا ہے اور وہ ذریعہ یعنی شوق طلب علم بچوں کو فی نفسہ لذت بخش ہوتا ہے گو اُن کو اس وقت نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کیوں دریافت کرتے ہیں ؛

ذریعہ کے لذت بخش اور اس لئے مقصود اصلی ہو جانے کی وجہ سے آدمی مختلف ماحولوں میں رہ سکتا ہے اور وہ وسیلے جو شروع میں اُسکو پسند نہیں آتے شدہ شدہ مرغوب ہو جاتے ہیں اور جینا آسان ہوتا ہے ؛

چھٹا مسئلہ یہ ہے کہ جس مادہ اولی سے انسان بنا ہے اس میں ایک حد تک اِس بات کی قوت ہے کہ جیسے ماحول میں رہے رفتہ رفتہ اس کے مناسب ہونے کے لئے ترقی کرے اگر آدمی کی ساخت میں ماحول سے مناسبت کی طرف ترقی کرنے کی قوت نہ ہوتی تو ایسے ماحول میں پیدا ہونے کے بعد جس میں اُس کو زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کرنا پڑتا ہے اور مفید کے حاصل کرنے اور مضر سے بچنے کی کوشش کرنا پڑتی ہے زندہ رہنا محال ہو جاتا۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ جد للبقا میں بعضوں کو زیادہ کامیابی ہوتی ہے اور بعض کو کم جو اپنے تغیرات باطنیہ کو خارج کے تغیرات سے زیادہ مناسب کر لیتے ہیں وہ زندہ رہنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور جو ماحول سے مناسبت پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے وہ حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹ جاتے ہیں جو لوگ اپنے اندرونی تغیرات میں ایسی اصلاح کر سکتے ہیں کہ وہ خارجی تغیرات کے مناسب ہو جاویں صرف وہی جیتے ہیں اور جو اصلاح نہیں کر سکتے وہ مر جاتے ہیں۔ اصلاح کرکے زندہ رہنے کے واقعہ کو حکیم سپنسر نے خلافۃ الاوفق اور ڈاروِن نے انتخاب طبیعی کہا ہے خلافۃ الاوفق کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ اپنے ماحول کے سب سے زیادہ موافق ہوتے ہیں وہی زندہ رہتے ہیں اور خلیفہ یا قائم مقام ہوتے ہیں اُن کے جو ناموافق ہونے سے فنا ہو گئے انتخاب طبیعی کے یہ معنی ہیں کہ فطرت اُن فردوں اور نوعوں کو چُن چُن کر زندہ رکھتی ہے جو اپنے ماحول سے مناسب ہوں اور جو مناسب نہیں ہوتے اُن کو ہلاک کر دیتی ہے ممکن ہے کہ آیۂ شریفہ

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون (تحقیق کہ وارث ہوں گے زمین کے میرے صالح بندے) نے اسی کلیہ خلافۃ الاوفق کو باحسن وجوہ بیان فرمایا ہو بشرطیکہ "صالح" کے معنی "مناسب ماحول" کے ہوں۔ اگر آیت مذکور میں خلافۃ الاوفق کی طرف اشارہ ہے تو وجد کے قابل بات ہے دنیا میں اب تک جتنی قومیں پیدا ہوئیں انہوں نے عروج پایا اور فنا ہوگئیں اور آئندہ جتنی قومیں پیدا ہونگی عروج کریں گی اور نابود ہوں گی وہ سب کی سب یرثھا عبادی الصالحون کی مثالیں ہونگی اور آیت شریفہ نے ایسے قانون قدرت کو بیان فرمایا ہوگا جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اور جس میں کبھی تبدیلی نہ ہوگی۔

ساتواں مسلمہ یہ ہے کہ جیسے بچے اپنے والدین کے مال و دولت کے قانوناً وارث ہوتے ہیں ایسا ہی ایک حد تک نسبتاً وہ اپنے اسلاف کے جسمانی اور عقلی اور اخلاقی قوتوں کے بھی وارث ہوتے ہیں گورے رنگ کے والدین کی اولاد گوری ہوتی ہے اور سیہ فام والدین کے بچے کالے۔ ذہین اور محنتی ماں باپ کے بچے بھی ذہین اور محنتی ہوتے ہیں کمینہ ماں باپ کی اولاد کمینہ ہوتی ہے۔ اچھے اور برے تمام عادات جو اسلاف میں فطرتی ہوتے ہیں۔ اُن کی اولاد میں بھی ضرور پائے جاتے ہیں۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ اخلاقی بلندی اور پستی میں تعلیم اور ترتیب کو دخل تو ہے مگر صرف وہی فردوں کی اخلاق کو سانچے میں نہیں ڈھال دیتے اُن کے علاوہ فطرتی اور موروثی قابلیت بھی ہوتی۔ تربیت اور فطرت کی مثال صورت اور مادہ کی سی ہے ایک ہی مادے سے مختلف صورت کی چیزیں بنتی ہیں جیسے سونے کی انگوٹھی زنجیر کڑی پازیب وغیرہ اور ایک ہی صورت کی چیزیں مختلف مادوں سے بنتی ہیں جیسے سونے کی انگوٹھی چاندی کی انگوٹھی پیتل کی انگوٹھی لوہے کی انگوٹھی وغیرہ صورت میں سب انگوٹھی ہیں مگر حقیقت میں اختلاف ہے یہی حال تربیت اور فطرت کا ہے تربیت صورت ہے۔ اور فطرت حقیقت زنگی۔ عربی۔ ایرانی۔ ارمنی۔ ہندی۔ جاپانی۔ مصری۔ یونانی۔ روسی وغیرہ فردوں کو تربیت سے سپاہی بنا سکتے ہیں۔ مگر اُن کی فطرتی بہادری۔ کفایت شعاری ہمدردی۔ راستبازی وغیرہ میں فرق ہوگا۔

آٹھواں مسلمہ یہ ہے کہ لذت و اذیت اضافی ہیں ایسا نہیں ہے کہ ہر جاندار کے لئے ایک ہی حالت ہمیشہ لذیذ ہو نہ ایسا ہے کہ ہر جاندار کے لئے ایک ہی حالت سدا موذی ہو جب انسان کے حواس اور ماحول کی چیزوں میں علاقہ پیدا ہوتا ہے تو کبھی یہ علاقہ

لذیذ ہوتا ہے اور کبھی مولم۔ لذت حاصل کرنے کو اول تو جسم میں ایسے آلات ہونا چاہئے جو متلذذ ہونے کا ذریعہ ہوں دوسرے ان کی ایسی حالت چاہئے کہ متلذذ ہونے کو جتنے عمل کی ضرورت ہے وہ عمل اُن آلات سے صادر ہو سکے تیسرے شے لذیذ میں وہ اثر چاہئے جو لذت بخش ہو جن جانداروں میں قوت ذائقہ موجود نہ ہو وہ شیر و شکر کی لذت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے اگر قوت ذائقہ نے شکر سے لذت پانے میں افراط کی ہو تو شکر چکھنے سے بجائے لذت کے اذیت ہوگی اگر کسی قوت ذائقہ کی ساخت ایسی ہو کہ اس کو شکر تلخ معلوم ہو تو بھی اس کو شکر چکھنے سے لذت نہ ہوگی جو حالت ذائقہ کی ہے وہی حالت دوسرے حواس کی ہے حواس کے اختلاف سے اور اُن کے عمل کے افراط و تفریط سے لذت و اذیت میں بڑا اختلاف ہو جاتا ہے اسی وجہ سے مختلف نسلوں کے فردوں کا بلکہ ایک ہی نسل کے مختلف فردوں کا اور ایک ہی نسل کے ایک ہی فرد کا مختلف اوقات میں راحت کا معیار بدلتا رہتا ہے واقعی اذیت اور واقعی ضرر اور واقعی لذت اور واقعی نفع میں ضرور ذاتی لزوم ہے تاہم افراد لذت و راحت و اذیت و ضرر میں اضافی نسبت ہے بہت سی ایسی حالتیں ہیں جن سے زنگی کو لذت ملتی ہے اور روسی کو اذیت یا ہندی کو لذت ملتی ہے اور یونانی کو اذیت یا بچے کو لذت ملتی ہے اور بوڑھے کو اذیت یا ایک ہی شخص کو اُس سے جاڑوں میں لذت ہوتی ہے اور گرمیوں میں اذیت۔

خلاصہ مسلمات گذشتہ کا یہ کہ دنیا کے سب آدمیوں میں زیست۔ راحت۔ نصاحب کی خواہش طبیعی ہے اُن کے ارادی افعال زیست اور راحت کی علت ناقصہ ہیں بعض ارادی افعال سے زیست و راحت کو فائدہ ہوتا ہے بعض سے ضرر جس ماحول میں آدمی رہتا ہے طبعاً اس میں اس ماحول کے موافق ہو جانے کی قوت ہے آدمیوں میں زیست و راحت کی خواہش ہونا اُن کے ارادی افعال سے زیست و راحت کا گھٹنا۔ بڑھنا علم الاخلاق کی جڑ ہے۔ نسترا راحت پسند ہونا علم الاعتدال کی اصل ہے اور صحبت پسند اور مدنی الطبع ہونا علم العدل اور علم الاحسان کی جڑ ہے۔

اصول اخلاق فطرتی ہیں

مسلمات گذشتہ پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم الاخلاق کی بنا ایسے طبیعی واقعات

پر ہے جن کو انسان دیکھ سکتا ہے اور جن کے مشاہدے اور تجربے سے ایسے اصول اور کلیات بنا سکتا ہے جو آدمیوں کے ارادی افعال میں اور لذت اور اذیت وحیات و ممات میں علت و معلول کے استوار علاقے کو بتا دیں وہ اصول اور کلیات اپنی صحت اور سرمدیت میں مانند کلیات ہندسہ وطب وغیرہ علوم صحیحہ کے ہونگے اتنا فرق ہے کہ ہندسہ کے مقدمات سادہ اور کم ہونے کی وجہ سے اس کے کلیات کی صحت اور سرمدیت کا سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ علم الاخلاق کے مقدمات کثیر اور بہت پیچیدہ ہیں۔ اس وجہ سے ارادی افعال اور لذت و حیات واذیت و ممات میں علاقہ علت و معلول کا پتہ لگانا مشکل ہوتا ہے اور جب علت و معلول ہونے کا پتہ لگ بھی جاتا ہے تب اس میں وہ مقداری صحت جو کلیات ہندسہ میں ہوتی ہے نہیں ہوتی۔ اگر دس کو نو میں ضرب دیں تو حاصل نوّے ہوگا نوّے سے نہ کچھ زیادہ نہ کم مقدمات چونکہ بالکل مقداراً معین ہیں اس لئے نتیجہ بھی مقداراً معین ہے لیکن جب علم الاخلاق میں کہیں کہ ظلم سے قوم تباہ ہوتی ہے تب ظلم کی مقدار معین نہیں کر سکتے کہ کتنے ظلم سے ضرور تباہ ہوگی نہ تباہی کو بتا سکتے ہیں کہ کتنی تباہی ہوگی نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کتنی مدت میں ہوگی۔ مقدمہ ظلم کی مقدار صحیح نہ معلوم ہونے سے نتیجہ تباہی کی مقدار معین نہیں ہو سکتی ہے ظلم و تباہی فی نفسہ ایسی چیزیں بھی تو نہیں کہ اُن کو مقداراً مقرر کر سکیں صرف یہ کلیہ ہوگا کہ ظلم اور تباہی میں علت و معلول کا علاقہ ہے اور اگر موانع ظلم کے اثر کو روک نہ دیں تو تباہی لازمی نتیجہ ہے آدمیوں کے ارادی فعلوں کو قانون قدرت نے لذت اور زیست اور اذیت اور موت میں اسی طرح سے اثر دیا ہے جیسے دواؤں کو انسان کی صحت و مرض میں جیسے اہل طب تجربہ سے دوا کا اثر دریافت کر کے بیماریوں کا علاج کرتے ہیں ایسا ہی اہل اخلاق ارادی فعلوں کے اثر کو زیست اور موت پر دریافت کر کے بعض کے کرنے کا اور بعض سے بچنے کا حکم دیتے ہیں علم الاخلاق کا فطرتی اسباب پر موقوف ہونا ایسا مہم مسئلہ ہے کہ اگر تھوڑی اور تفصیل کر دوں تو بیجا نہ ہوگا قانون قدرت نے تمام عالم کو اصول مقررہ کا پابند فرمایا ہے دن رات کا ہونا فصلوں کا بدلنا اقلیموں کا اختلاف ایسے واقعات نہیں ہیں کہ گاہ بیگاہ جب چاہیں ہوں یا نہ ہوں وہ ایسے استوار قاعدوں کی پابند ہیں جن میں بال بھر بھی فرق نہیں ہوتا۔ حرکت ہمیشہ اس جہت میں ہوگی جس میں اقل مزاحمت ہو۔ مادیات حادثہ میں (جو قوت اور مادے سے بنتے ہیں) ہمیشہ

کون وفساد ہوگا۔ مادے کے اجزا میں باہم کشش ہوگی اور اُن کا حجم اور بُعد اسکو معین کریگا۔
سورج چاند زہرہ مشتری وغیرہ اجرام سماویہ کا اپنے اپنے مقررہ مداروں پر معین رفتاروں سے چلنا بھی نامربوط اور غیر منتظم نہیں بلکہ وہ معین شاہراہ پر اصول مقررہ کی پابندی سے چلتے ہیں۔

درختوں کا اوگنا بالیدہ ہونا بارور رہونا۔ اجل مقرر کے بعد نیست و نابود ہونا بھی چند مقرر اصول کا پابند ہے اُس کے خلاف نہیں ہوتا جانوروں کا پیدا ہونا جوان ہونا بوڑھا ہو کر مرنا بھی ایسے اصول کے موافق ہے جن میں فرق نہیں آتا۔

جیسے ہر جاندار کے پیدا ہونے جوان ہونے تندرست رہنے بیمار پڑنے بوڑھا ہونے مرنے کے اصول مقرر ہیں ایسا ہی ہر قوم کے پیدا ہونے عروج کرنے ترقی پانے تندرست رہنے یا بیمار ہونے اور نیست و نابود ہونے کے بھی اصول مقرر ہیں۔ علم القوم میں اُن کو اصول معینہ کہتے ہیں اور مذہباً انہیں کو ایسے احکام الٰہی سے تعبیر کر سکتے ہیں جو ہمیشہ سے تھے اور جب تک قومیں رہینگی ہمیشہ رہیں گی۔ اہل دنیا ان سرمدی احکام الٰہی کی تعامل اور تعاطر میں جتنا ہی متابعت کرتے ہیں اتنا ہی قوموں میں صحت اور عافیت اور راحت اور فلاح اور ثروت اور دولت اور عزت اور آزادی ہوتی ہے اور جتنا ہی اُن سرمدی احکام کی مخالفت کرتے ہیں۔ اتنا ہی قوموں میں نکبت۔ ذلت۔ فقر۔ فاقہ۔ جرائم۔ امراض۔ جدال و قتال اور غلامی وغیرہ آفتیں آتی ہیں کلیۃ الکلیات ان اصول کا آزادی محدودہ بآزادی دیگران ہے اور اخلاق کے تمام اصول اُسی کے جزئیات ہیں۔ جس کا بیان آئندہ کرونگا۔

قانون قدرت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی خاص اقلیم و آب و ہوا و حیوانات و نباتات و معدنیات وغیرہ یعنی ماحول میں واقع ہوا۔ وہ اُن اصول صحت کی پابندی نہ کرے جو تندرستی کے واسطے لازم ہیں تو وہ بیمار پڑیگا اور زیادہ مخالفت اصول صحت کی کرے تو مرجاوے گا۔ ایسا ہی قانون قدرت نے مقرر فرمایا ہے کہ جو لوگ قوم بن کر دنیا میں رہنا چاہیں اُن کو قوم کی تمام فردوں کے جان و دل کو ضرر پہنچانے سے پرہیز کرنا چاہئے اور جو وعدے معاملات میں کئے ہوں وفا کرنا چاہیئے۔ اگر قوم پر بیرونی یا اندرونی دشمنوں سے حملہ ہو تو روکنا چاہیئے باہم راحت سے زندہ رہنے میں راستبازی سے تعامل اور تعاون کرنا چاہیئے اگر قوم کی فردیں ان احکام الٰہی کی پابند نہ ہوں گی تو قوم پہلے ذلت۔ فقر۔ مصیبت۔ امراض۔ چوری۔ قتل۔ ڈاکہ۔ کشت و

خوں غلامی وغیرہ میں مبتلا ہوگی اور آخر کو نیست و نابود ہو جائے گی۔ قوم بن جانے کے بعد افراد قوم کو ان الٰہی احکام کی پابندی اگر قوم کو زندہ رکھنا ہو تو ضرور ہے اُن کا مدار فطرت انسانی پر ہے اور شخصی اور نوعی تجربہ سے اُن کا پتہ لگتا ہے یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اخلاقی دستور العمل محض مصنوعی اختراع اور اصلاح ہے جس فعل کو چاہا باہم اصطلاح کر کے بُرا کہنے لگے اور جس کو چاہا آپس کے قرارداد سے اچھا کہدیا۔

فعلوں کی اچھائی اور برائی اُس علاقہ علت و معلول پر موقوف ہے جو قانون قدرت نے فعل اور زیست و لذت اور موت و اذیت میں مقرر فرما دیا ہے اُس علاقہ فطرتی کے دریافت میں چونکہ خطا ہوتی ہے اس لئے کبھی وہ فعل جس کو کوئی ماہر علم الاخلاق اچھا کہتا ہے اچھا نہیں ہوتا یا جس کو برا کہتا ہے وہ برا نہیں ہوتا اسی خطائے اجتہادی نے حکما اور مصلحوں کی رائے میں حسن قبح افعال اولی کی بابت بڑا اختلاف پیدا کر دیا ہے دوسرا سبب اختلاف کا یہ ہے کہ زمانی اور مکانی اور بشری اور ماحولی حالتوں کے بدلنے سے افعال کا حسن و قبح اضافی ہونے کی وجہ سے بدلتا رہتا ہے اور مصلحین کی نظر تمام پہلوؤں پر نہیں جاتی۔

علم الاخلاق کی بنیاد فطرت انسانی پر ہونے کا بہت اچھا پتہ اس بات سے لگتا ہے کہ کوئی شخص اور کوئی فرقہ کبھی دنیا میں ایسا نہیں ہوا کہ اُس نے راحت اور صحت کے منافی افعال کو اختیار کیا ہو اور اذیت نے اُس کی عمر طبیعی کو کم کر کے نیست و نابود نہ کر دیا ہو۔ قانون قدرت نے آدمی کے جسم اور قوتوں اور خواہشوں اور عقل کو اور اُس کے ماحول کی چیزوں اور علاقوں کو ایسا ہی بنایا ہے کہ بے راحت اور تصاحب کے اُس کو عمر طبیعی تک راحت سے پہنچنا محال ہے اگر اخلاق کی بنیاد فطرت انسانی پر نہ ہوتی تو ہندو۔ بودھ۔ گبر۔ یہودی۔ نصرانی۔ مسلمان دہریہ۔ لا ادریہ باوجود بہت سے اور اختلافوں کے عدل پر متفق نہ ہوتے کوئی فرقہ تو ظلم جلی و خفی کو اچھا جانتا اور جھوٹ بولنے یا امن کی حالت میں پرایا مال چھین لینے کو ثواب سمجھتا اصول اخلاق کا ہر مذہب کے ساتھ جمع ہو سکنا اور تمام مذہبوں سے جدا ہو سکنا بہترین ثبوت اس بات کا ہے کہ مذہب اور خلق میں تلازم ذاتی نہیں ہے تلازم کیسا وہ دونوں بالکل الگ ہیں مذہب کی بنا ایسی چیز پر ہے جو انسان کی حد ادراک سے بالاتر ہے اور اخلاق کی بنا انسان کے شخصی اور نوعی تجربہ پر ہے پھر دونوں کیونکر ایک ہو سکتے ہیں جیسے مذہب اور طب ایک نہیں ویسا ہی مذہب اور اخلاق ایک نہیں علاوہ بریں مذہب میں آدمی کو

معبود سے واسطہ ہے اخلاق میں آدمیوں کے آپس کے تعلقات سے بحث ہے مذہب کا مقصود نجات اُخروی ہے اور اخلاق کا مقصود راحت دنیوی مگر لحاظ رہے کہ مذہب اور اخلاق کی تمیز جس کا میں نے ذکر کیا اُسی وقت ہو سکتی ہے جب مذہب بالمعنی الخاص لیا جاوے اگر مذہب کے معنی کو اتنا وسیع اور عام کریں کہ اس میں بین العباد کا تعامل داخل ہو جاوے تو اخلاق مذہب کا ایک جز ہوگا اور مذہب کو اخلاق سے وہی نسبت ہوگی۔ جو درخت کو شاخ سے یا کتاب کو اس کے ایک باب سے یا کسی کل کو اپنے جزو سے ۔

غالب کی اُردو نثر

شمس العلما جناب مولانا الطاف حسین حالی

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے مگر سنہ مذکور میں جبکہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور ہمہ تن مہر نیمروز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے اُس وقت بضرورت ان کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی وہ فارسی نثر میں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوت متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب اُن کی ہمت مہر نیمروز کی ترتیب و انشا میں مصروف تھی ضرور ہے کہ اُس وقت ان کو فارسی زبان میں خط و کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرز خاص میں شاق معلوم ہوئی ہوگی۔ اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ انہوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد اردو زبان میں خط لکھنے شروع کئے ہیں چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے۔

مضمحل ہو گئے قویٰ اے غالب ۔۔۔ اب عناصر میں اعتدال کہاں"

غالباً اردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اوّل اوّل اپنی شان کے خلاف سمجھا ہوگا۔ مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے وہی اس کی شہرت اور قبولیت کا باعث ہو جاتا ہے جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُن کی اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی اگرچہ لوگ عموماً مرزا کو فارسی کا بہت بڑا شاعر جانتے تھے۔ اور اُن کے اردو دیوان کو بھی ایک عالی رُتبہ کلام عام افہام سے بالاتر سمجھتے تھے، مگر لوگوں کا ایسا خیال کرنا محض تقلیداً تھا نہ تحقیقاً۔ وہ خود اپنے ایک مرتبہ دان اور پایہ شناس دوست کو خط میں لکھتے ہیں "میرے فارسی قصیدے کہ جن پر مجھ کو ناز ہے کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا۔ مگر بطریق اذعان کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا ہے داد سخن کہاں اور ادراک پایۂ معنی کہاں؟ تاریخ تمریہ (یعنی مہر نیمروز) کے پانچ سات جزو جو آپ کے پاس بھیجے ہیں میری خاطر سے کیجئے

انصاف سے کہئے کہ یہ نثر کہیں اور ہے؟ اور پھر اس نثر کا کوئی مشتاق نہ ہو"

اگرچہ مرزا کی اردو نثر کی قدر بھی جیسی کہ چاہئے ویسی نہیں ہوئی چنانچہ بعض اوقات تحریروں میں دیکھا گیا کہ اردوئے معلّٰی اور بوستانِ خیال کی عبارت کو ایک مرتبے میں رکھا گیا ہے، لیکن پھر بھی مرزا کی اُردو نثر کے قدر دان بہ نسبت ناقدر دانوں کے ملک میں بہت زیادہ نکلینگے۔

مرزا کی اردو نثر میں زیادہ تر خطوط درقعات ہیں؛ چند تقریظیں اور دیباچے ہیں؛ اور تین مختصر رسالے ہیں جو برہان قاطع کے طرفداروں کے جواب لکھے ہیں؛ لطائفِ غیبی، تیغ تیز اور نامۂ غالب اس کے سوا چند اجزا ایک ناتمام قصّے کے بھی ہیں۔ جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اور لطف انگیز اُن کے خطوط ہیں۔ جن میں سے زیادہ تر اردوئے معلّٰی میں اور اس سے کم عود ہندی میں جمع کر کے چھپوائے گئے ہیں اور بہت سے خطوط ان دونوں کتابوں کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئے ہیں جو اب تک شائع نہیں ہوئے مگر عنقریب بعض احباب کا ارادہ اُن کے چھپوانے کا ہے۔

مرزا کی اُردو خطوط کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے نہ مرزا سے پہلے کسی نے خطوط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا، اور نہ اُن کے بعد کسی سے اُس کی پوری پوری تقلید ہو سکی۔ انہوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جن کو مترسلین نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا مگر درحقیقت فضول اور دور از کار تھیں سب اڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی برخوردار، کبھی بھائی صاحب، کبھی مہاراج، کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں، اس کے بعد مطلب لکھتے ہیں اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

ادائے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں مثلاً اُن کو یہ لکھنا تھا کہ "محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گذرا۔ میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ اس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں میں نے پوچھا کیا آج نہ جائیگی؟ اُس نے کہا آج ضرور جائیں گی۔ تیاری ہو رہی ہے" اس مطلب کو انہوں نے اس طرح ادا کیا ہے محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ۔ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائیں گی؟ آج ضرور جائیں گی تیاری ہو رہی ہے۔

میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے، اُس میں لکھنا یہ ہے کہ میر صاحب آئے اور اُن سے یہ باتیں ہوئیں مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے بلکہ اُس کو اس طرح شروع کرتے ہیں "اے میر صاحب السلام علیکم۔ حضرت آداب۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؛ حضور میں کیا منع کرتا ہوں؛ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میر صاحب اُس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوتا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہوں گے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ۔ اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز رکھتے یا نہیں رکھتے مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور خط اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنج شنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھئے گا۔ میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اُسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ" اس کے بعد میر مہدی سے مخاطب ہو کر اصل مطلب لکھتے ہیں۔

بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اُس کو غائب فرض کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے اندازِ بیان سے واقف نہیں وہ اُس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں "میر مہدی جیتے رہو۔ آفرین صد ہزار آفرین اُردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے یعنی دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی؛ سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اُس کو بخل کیا؛ اللہ برکت دے"

ظاہر ہے کہ اس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں؛ کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلہ مذکور میں کئی سال مقیم رہے تھے مگر جو لوگ مرزا کی انگلیلی چالوں سے ناواقف ہیں وہ غلطی سے اُس کے دوسرے معنی سمجھ جاتے

ہیں۔ اکثر لوگوں کو اس خیال سے کہ راقم بھی پانی پت انصاری محلّے کا رہنے والا ہے۔ ان الفاظ سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے۔ لطف یہ ہے کہ میں نے جس قدر ان کو سمجھایا کہ یہ خود میر مہدی ہی کی نسبت لکھا ہے، میری نسبت نہیں لکھا؛ اُسی قدر اُن کو اس بات کا زیادہ خیال ہوا کہ میں ازراہ کسرِ نفسی دیا کہتا ہوں۔

مغربی طریقے پر جو قصّے لکھے جاتے ہیں اُن میں اکثر اس قسم کے سوال و جواب ہوتے ہیں۔ جیسے کہ مرزا کی تحریروں میں ہم اوپر دکھا چکے ہیں مگر وہاں ہر سوال و جواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا اُن کے ناموں کی کوئی علامت لکھ دی جاتی ہے۔ ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ سوال کہاں تمم ہوا، اور جواب کہاں سے شروع ہوا؛ مرزا ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے۔ اور نہ اُن کے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے، اور جواب کیا؛ شاید قصّے یا ناول میں یہ بات نہ چل سکے، مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ راہ بالکل صاف کر دی ہے۔

مرزا کی طرزِ تحریر کی جو خصوصیتیں اُوپر مذکور ہوئیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اس کی پیروی نہ کر سکیں مگر وہ چیز جس نے اُن کے مکاتبات کو ناول اور ڈرامہ سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخیِ تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے خطوط کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور اپنے مکاتبات کی بنیاد مذاق سنجی و ظرافت پر رکھنی چاہی ہے مگر اُن کی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوتے ہیں۔ اور قوتِ متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے۔ اُس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوتِ پرواز کو طائر کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثرِ اُردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی، اخلاقی، پولٹیکل، سوشل، اور دلچسپ مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیئے ہیں، بائیوگرفی اور ناول میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں، باوجود اس کے مرزا کی تحریر خط و کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطفِ بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا اُس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے مثلاً ایک خط اپنے دوست کو لکھا ہے اُس میں اُن کی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے بعد دعا کے لکھتے ہیں "کیوں بھئی اب ہم اگر کول آئے بھی تو تم کو کیونکر دیکھیں گے؟ کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟ یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں کو جواب رقعے لوٹا رہے ہیں۔ اُن کے بچپن کے زمانے میں ان کے رقعے کا جواب۔ جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا۔ اس طرح لکھتے ہیں "اے مردم چشم جہاں بین غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو یعنی چشم جہاں بین غالب کی پُتلی چشم جہاں بین تمہارا باپ مرزا علاء الدین احمد خاں بہادر۔ اور پتلی تم۔ میاں تمہارے دادا تو نواب امین الدین خان بہادر ہیں میں تو صرف تمہارا دل دادہ ہوں۔

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے اُنہوں نے اُس کا جواب ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو خط بھیجا اُس کے جواب میں اُن کو اس طرح لکھتے ہیں "دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائیگا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔

ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا ہے؛ اُس میں لکھتے ہیں "دھوپ بہت تیز ہے روزہ رکھتا ہوں؛ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

جس زمانے میں برہان قاطع پر اعتراض لکھے ہیں اور لوگوں نے مرزا کی سخت مخالفت اور مؤلف برہان کی حمایت کی ہے ایک خط میں صاحب برہان کا ذکر کرنے کے بعد اُس کی اور اُس کے طرفداروں کی نسبت لکھتے ہیں "ان فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے۔ جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھدیا نظامی و سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اُسکو مانیں؛ ہندیوں کو کیونکر مسلم الثبوت جانیں۔ ایک گائے کا بچہ بزور سحر آدمی کی طرح کلام کرنے

لہ یہ اشارہ صاحب برہان قاطع کی طرف ہے۔"

گاؤ بنی اسرائیل اُس کو خدا سمجھے"

ایک خط کے آخیر میں جو نواب علاء الدین خاں کو لکھا ہے لکھتے ہیں" اُستاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھپھی اُن کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ دعا۔ اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی و بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے۔ سلام۔ اور اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں بندگی۔ اور اس نظر سے کہ سید ہیں۔ درود۔ اور موافق مضمون اس مصرع کے "سوے اللہ و اللہ مافی الوجود" سجود"

ایک خط میں برسات کی شدت کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں" دیوانخانے کا حال مجلس سرائے سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں چھت چھلنی ہو گئی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے"

نواب علاء الدین خاں اور اُن کے والد نواب امین الدین خاں میں کچھ شکر رنجی ہے۔ باپ دلی آئے ہیں اور بیٹے کو لوہارو چھوڑ آئے ہیں۔ مرزا نواب علاء الدین خاں کو خط میں لکھتے ہیں" سنا گیا کہ نواب امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزول اجلال کیا۔ پیر دن ہے از راہ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے تمہیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے؟ بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اتنا ہی؟ تبا تم اُس کو چاہتے ہو ہنسنے لگے۔ غرضکہ میں نے بظاہر اُن کو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے (یعنی احمد بخش خانیوں کے) دلوں کا اللہ مالک ہے"

ایک دفعہ کثرتِ اخراجات سے تنگ آکر بعضے ضروری خرچ بند کر دیئے ہیں یہاں تک کہ شراب پینا بھی چھوڑ دیا ہے۔ نواب علاء الدین خاں نے اپنے والد کے اشارے سے اس کا سبب دریافت کیا ہے اور مولوی حمزہ خاں کی طرف سے بطور نصیحت کے مرزا صاحب کو یہ شعر لکھا ہے، جس پر سیکڑے حافظ از میکدہ بیرون شوالخ اُس کا جواب اس طرح لکھتے ہیں" بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں ہے۔ کہ ادھر سے ہنڈوا اُس سے قرض لیا، اُدھر درباری مل کو جا مارا، ادھر خوب چندہ چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی ہر ایک پاس تسک ٹھہری موجود، شہد لگاؤ اور چاٹو نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھپھی کے سر، بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دیدیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے کچھ

آگرے سے بھیجدیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپے رام پور کے، قرض دینے والا ایک میرا مختار کار، وہ سود ماہ بماہ لیا جاتا ہے، مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ نکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایکسو بیس، بیٹھ تنگ آگیا، گذارہ مشکل ہوگیا، روز مرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہر درویش بجان درویش۔ صبح کی تبرید متروک چاشت کا گوشت آدھا۔ رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینہ بچا، روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینہ پورا نہیں گذرا تھا کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آگیا قرض مقسط ادا ہوگیا۔ متفرق رہا، خیر رہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہوگئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی نے وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی۔ اُن کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو لعد سلام کہنا"

اے بے خبر لذت شرب مدام ما، دیکھا ہم کو یوں بلاتے ہیں۔ دریبے کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا، رسولی مشہور ہونا اور رسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے، اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ موحدت وجود کو اپنے دل نشیں کرنا اور ہے مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ وہ مشرک ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ اُن لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں؛ اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھا ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ قطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہیں۔

ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام "بریں زیستم ہم بریں بگذرم" ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالینگے تو میرا جانا مقصود نہ ہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا۔ اور دوزخ کی آگ تیز کروں گا تاکہ مشرکین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اُس میں

جلیں سنو: مولوی صاحب تم نے کئی فاقوں میں۔ ایک شعر حافظ کا حفظ کیا۔ چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون شو الخ اور پھر پڑھتے ہو اُس کے سامنے کہ اُس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے۔ مجموعۂ نثر بداگانہ؛ اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اُس کے مخالف ہیں"

ایک خط میں تعلقات خانہ داری کی اس طرح شکایت کرتے ہیں "سنو! عالم دو ہیں؛ ایک عالمِ ارواح، اور ایک عالمِ آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے" لمن الملک الیوم" اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے" للہ الواحد القہار" ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں؛ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیجکر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۳ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا (یعنی پیدا ہوا) تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوام حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا؛ اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیلخانے سے بھاگا تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے؛ اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے۔ دو ہتکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں؛ سال گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ، مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا؛ میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا تو پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی حکم رہائی دیکھئے کب صادر ہو؛ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذالحجہ میں چھوٹ جاؤں، بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بعد نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤنگا۔ فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بردم ۔ سوی شہر خود ازیں دردی ویراں بردم ۔

ایک خط مرزا حاتم علی بیگ مہر کو اُن کی محبوبہ چناں جان کی تعزیت میں لکھا ہے اُس میں لکھتے ہیں، آپ کا غم فزا نامہ پہنچا۔ یوسف علیخاں عزیز کو پڑھوا دیا۔ اُنھوں نے جو میرے سامنے اُس مرحومہ کا اور آپ کا معاملہ بیان کیا یعنی اس کی اطاعت اور تمہاری

اس سے محبت سخت ملال ہوا۔ سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور نثرا میں حسنؒ بصری اور عشاق میں مجنوں یہ تین آدمی تین فن میں سرونتر اور پیشوا ہیں شاعر کا کمال یہ ہے۔ کہ فردوسی ہو جائے فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسنؒ بصری سے ٹکر کھائے عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہمطرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری بھتیجی مثل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اُس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مثل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک ۔۔۔ کو میں نے بھی مار رکھا ہے خدا اُن دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے یا آنکہ یہ کوچہ چھوٹ گیا؛ اس فن سے میں بیگانہ محض ہو گیا ہوں؛ لیکن کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں اُس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولونگا۔ جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گذرتی ہوگی صبر کرو اور ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑو سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی عشق محمدؐ بس ست و آلِ محمدؐ اللہ بس ماسوائے ہوس۔

ایک اور خط مرزا صاحب موصوف کو اسی چناں جان کی تعزیت میں اس طرح لکھا ہے۔ مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں پینسٹھ برس کی عمر ہے پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی تھی۔ کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ؛ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو، سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے کسی کے مرنے کا وہ غم کرے اور آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی؟ کہاں کی مرثیہ خوانی! آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ، اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنّا جان نہ سہی منّا جان سہی۔ مَیں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی؛ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے؛ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور آجیرن ہو جائیگی؛ طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی وہی زمرّدیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ چشم بد دور وہی ایک حور بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ

زنِ نو کن اے دوست ہر نو بہار کہ تقویم پارینہ ناید بہ کار

مرزا حاتم علی بیگ مہر نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی ہے اس کی رسید اس طرح لکھتے

ہیں "حلیۂ مبارک نظر افروز ہوا ... تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اُس کی ستائش کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی گھٹی ہوئی ہے وہ مزے یاد آ گئے کیا کہوں جی پر کیا گذری؛ بقول شیخ علی حزین

"تا دُستر سم بود زدم چاک گریباں شرمندگی از عرقِ پشمینہ ندارم"

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے؛ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے؛ اس سے بڑھکر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے؛ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں اک دڑی ہے عام؛ ملاحظہ۔ بسا طی نیچہ بند، دھوبی سقا، بھٹیارہ، مُنہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اُسی دن سر منڈایا"

الغرض مرزا کے خطوط و رقعات میں ایسے خطوط بہت کم نکلیں گے جن میں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں مندرج نہ ہوں یہاں تک کہ رنج و افسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں ہوتا۔

منشی نبی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں "بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا؛ یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت میری وہ بھتیجی کہ میں نے بچپن سے آج تک اُس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی، مر گئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے؛ تین بھتیجیاں، اور تین چچا، اور ایک باپ اور ایک دادی، اور ایک دادا، یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مر گئے"

ایسے ہی تحریر میں نواب امین الدین خاں کو لکھتے ہیں "آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو ہیں لعمری ولعمر لولٰی ہوں۔

مرزا قربان علی بیگ سالک کو خط میں لکھتے ہیں "یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق

لہ یہاں اس شعر کے لکھنے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب تک مجھے موقع ملا برابر ڈاڑھی کا حق ادا کرتا رہا۔ پس اُس سے میں کسی طرح شرمندہ نہیں ہوں ۱۲۔

کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی، اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہِ تعظیم (جیسا بادشاہوں کو بعد اُن کے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں) چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا مقرر اور ہا و یہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ اے نجم الدولہ بہادر!! ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرضدار بھوک سنا رہا ہے میں اُن سے پوچھ رہا ہوں" اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغلا نصاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو آکسو۔ کچھ تو بولو۔ بولے کیا بیجا۔ بے عزت؛ کوٹھی سے شراب۔ گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا۔ میوہ فروش سے آم، صراف سے دام؛ قرض لئے جاتا ہے یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دونگا"

فتح دہلی کے بعد جو شہر میں سناٹا ہو گیا ہے اُس کی کیفیت ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو اس طرح لکھتے ہیں" صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کئے اُسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے۔ کہ وہ ہمارے تمہارے دوست تھے اور منشی نبی بخش اُن کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط! بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اُس کا جواب مجھ کو آیا۔ اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں۔ اُس کا نام بھی دلی اور اُس کے محلے کا نام بھی بلی ماروں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈھے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا کیا امیر کیا غریب، کیا اہل حرفت اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں"

ایک خط میں نواب علاء الدین خاں کو لکھتے ہیں "کل تمہارے خط میں دوبارہ یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے، ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے، وہ دلی نہیں ہے جس میں میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلی نہیں ہے۔ جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کیمپ ہے جس میں مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود، بادشاہ کے ذکر جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ امرائے اہل اسلام میں اموات گنو تو حسن علیخاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشندار، ستو روپے مہینے کا روزینہ دار بن کر نامردانہ مرگیا۔ میرنا صرالدین باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علیخاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے بیمار پڑا نہ دوا نہ غذا، انجام کار مرگیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احیا کو پوچھو تو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی معتوبوں میں آیا اُس کے پاس ایک پیسہ نہیں، ٹکے کی آمد نہیں، مکان اگرچہ رہنے کو ملگیا ہے۔ مگر دیکھئے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر اور نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپیہ کرائے کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی، تباہ و خراب لاہور گیا، وہاں پڑا ہوا ہے، دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڈھ اور بلبھ گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے جو حکما کا حال کل لکھا ہے وہ بیان واقع ہے۔ صلحا اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے اُس کو بھی سچ جانو۔"

بعض خطوں میں یاس و حسرت و افسردگی اور دنیا کی بے ثباتی و بے اعتباری کا بیان نہایت مؤثر طریقے میں کیا ہے جس سے اُن کے خیالات معلوم ہوتے ہیں مثلاً:-

ایک خط میں لکھتے ہیں "ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے ضعف سستی کاہلی گراں جانی رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور دراز راہ درپیش ہے زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر، اور اگر باز پرس

ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ ہم مر جائینگے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

ایک اور خط میں منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں "تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گمنام جئے تو کیا۔ کچھ معاش ہو کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے۔ اے یارجانی ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں اسی پایہ پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے، اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گذر جاؤں۔ عالم بیرنگی میں گذر پاؤں جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیئے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے سراب ہے ہستی نہیں ہے پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہوئے ان کو حسرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو تم کو ہوگا"

مرزا نے بعض اُردو خطوں میں اور خاصکر اردو تقریظوں میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تکلفات بارده میں شمار کیا جاتا ہے خصوصاً اُردو جو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان ہے وہ اس قسم کے تصنع اور بناوٹ کی متحمل نہیں معلوم ہوتی مگر مرزا نے جس قسم کی مسجع عبارت اُردو خطوں اور تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے اُس پر یہ گرفت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کی مسجع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ نخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے تو اس میں تصنع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اس لئے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ بسبب لزوم مالایلزم کے کم وزن ہو جاتا ہے۔ مگر مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرے میں اور یہ بات اُسی شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجے کا کمال رکھتا ہو اور وزن و قافیہ کی جانچ اور تولی میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اس کی مثالیں لکھنے کی کچھ ضرورت

نہیں ہے۔ مرزا کے اردو رقعات میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں مگر یہ معلوم رہے کہ متقفیٰ عبارت مرزا خاصکر اُن خطوں میں لکھتے تھے جن سے ہنسی، ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادھی نثر عاری میں کرتے تھے مثلاً سید یوسف مرزا کو اُن کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں ؎

"یوسف مرزا کیونکر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو۔ مگر صبر یہ ایک شیوۂ فرسودۂ انبائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں صبر کرو۔ ہائے! ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں۔ تو میں کہونگا یوسف مرزا کو۔ تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہوچکا تھا اگر یہ بات سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا، نہ قید حیات رہی نہ قید فرنگ"

اُنہیں کو بیٹے کی تعزیت اِس طرح لکھتے ہیں "اے میری جان! اے میری آنکھ

زہجران طفلے کہ در خاک رفت چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا؟ ہرگز غم نہ کرو اور اگر ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے، اولاد بہت، نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو وہ اپنی اجل سے مرے ہیں بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے۔ ہاں مظفر الدولہ کا غم منجملہ واقعات کربلائے معلیٰ ہے۔ یہ داغ جیتے جی نہ مٹے گا۔

مرزا نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اردو زبان میں لکھے ہیں اور ان سب میں مسجع و متقفیٰ عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے اردو خطوں میں پائی جاتی ہے وہ ان تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے، خصوصاً سجع کی رعایت نے اُن میں آورد اور تصنع کا رنگ زیادہ پیدا کردیا ہے۔ لیکن مرزا کو اُس میں معذور سمجھنا چاہئے، جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے وہ بغیر ان متکلفات بارودہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے اُس کو اب بھی بہت کم

لوگ پسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

بااین ہمہ ان میں سے بعض نثریں مرزا کی روش خاص میں نہایت ممتاز ہیں خصوصاً وہ دیباچہ جو انھوں نے مفتی میر لال صاحب کی کتاب سراج المعرفتہ پر لکھا ہے اُس میں جس خوبی اور متانت سے تصوف کے اعلےٰ خیالات ظاہر کئے ہیں اُس کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان میں تصوف کے اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ اُس کے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی نے نہیں لکھے۔

کتاب سراج المعرفتہ جس پر مرزا نے یہ دیباچہ لکھا ہے اُس میں مفتی میر لال نے مرحوم بہادر شاہ کے ایما سے تمام اشغال و اذکار۔ جو آنحضرت کے زمانے سے اُس وقت تک سینہ بسینہ یا سفینہ بسفینہ چلے آتے تھے۔ ایک جگہ جمع کئے تھے۔ مرزا نے اپنے دیباچہ میں دکھایا ہے کہ ان اشغال و اذکار کو معرفتِ الٰہی میں کیا دخل ہے، اور کیونکر ان کے ذریعے سے توحید وجودی تک سالک کی رسائی ہو سکتی ہے دیباچہ مذکور کا اوّل و آخر کا حصّہ چھوڑ کر صرف وہ مقام جس میں مرزا نے مذکورۂ بالا مقصد کو بیان کیا ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مرزا لکھتے ہیں کہ "حق یوں ہے کہ حقیقت از روئے مثال ایک نامۂ درہم پیچیدہ و مہر بستہ ہے کہ جس کے عنوان پر لکھا ہے "لا موثر فی الوجود الا اللہ" اور خط میں مندرج ہے "لا موجود الا اللہ"، اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور اور نام آور ہے کہ جس پر رسالت ختم ہوئی۔ ختمِ نبوت کی حقیقت اور اس معنی فامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں: آثاری، افعالی، صفاتی، ذاتی۔ انبیائے پیشین صلوات اللہ علیٰ نبینا و علیہم اعلان مدارج سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیاء کو حکم ہوا کہ حجابِ تعینات اعتباری اٹھا دیں۔ اور حقیقت بے رنگی ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھاویں اب گنجینۂ معرفت خواص امتِ محمدی کا سینہ ہے، اور کلمۂ لا الہ الا اللہ مفتاحِ باب گنجینہ ہے۔ زہے عاقبۂ مومنین کہ وہ اس کلام سے صرف نفی شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں اور نفی شرک فی الوجود جو اصل مقصود ہے اُن کی نظر میں نہیں۔ مگر جب لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کہیں گے اُسی توحید ذاتی کے اعتقاد کی قدمگاہ پر آ رہیں گے۔ یعنی ہماری اس کلمے سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت ہے شفاعت محمدی کی اور یہی معنی ہیں رحمۃ اللعالمین ہونے کے۔

اور اسی مقام سے ناشی ہے ندائے روح افزائے "من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ"

قلم اگرچہ دیکھنے میں دو زبان ہے لیکن وحدت حقیقی کا راز دان ہے۔ گفتگوی توحید میں وہ لذت ہے کہ جی چاہتا ہے کہ کوئی سو بار کہے اور سو بار سنے۔ نبی کی حقیقت دو جہتین ہے۔ ایک جہت خالق کہ جس سے اخذ فیض کرتا ہے اور ایک جہت خلق کہ جس سے فیض پہنچاتا ہے۔

نبی را دو وجہ ست دل جوئے خلق — یکے سوئے خالق یکے سوئے خلق

بداں وجہ از حق بود مستفیض — بدیں وجہ بر خلق باشد مفیض

یہ جو صوفیہ کا قول ہے کہ "الولایۃ افضل من النبوۃ" یعنی اس کے صاف اور از روئے انصاف یہ ہیں کہ ولایت نبی کی کہ وہ وجہ الی الحق ہے افضل ہے نبوت سے کہ وہ وجہ الی الخلق ہے۔ نہ یہ کہ ولایت عام افضل ہے نبوت خاص سے۔ جس طرح نبی مستفیض ہے حضرت الوہیت سے اسی طرح ولی مستنیر ہے انوار نبوت سے۔ مستنیر کی تفضیل منیر پر اور مستفیض کو ترجیح مفیض پر ہرگز معقول اور عقلا کے نزدیک مقبول نہیں۔ اب وہ ولایت کہ خاصۂ نبی تھی نبوت کیساتھ منقطع ہو گئی مگر وہ فروغ کہ اخذ کیا گیا ہے مشکوۃ نبوت سے ہنوز باقی ہے نقل و تحویل ہوتی چلی آتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے اور یہ سراج ایزدی تا صبح ظہور قیامت روشن رہے گا۔ اور اب اسی کا نام ولایت اور یہی مشعل طریق ہدایت ہے۔ ولایت و ہدایت وہی حقیقت توحید ذاتی ہے کہ جو از روئے کلمہ لا الہ الا اللہ مشہود عیون اعیان امت اور منظور نظر اکابر ملت ہوئی ہے مگر وہ بات اب کہاں کہ ایجاد لا الہ الا اللہ کہے اور دل اور معرفت سے منور ہو جائے۔ اور وہ ضامن زبردست کہاں کہ قائل لا الہ الا اللہ کو اگرچہ اس کے معنی اچھی طرح نہ سمجھا ہو قدمگاہ توحید پر قائم کرے۔ یعنی رسول مقبول واجب التعظیم قائل انا احمد بلا میم علیہ التحیۃ والتسلیم۔ اب سعادت بقدر ارادت ہے اور راحت بعد جراحت ہیچ بھی تو یہ ہے؛ آدمی کیونکر سمجھ سکے اور بطلان بدیہیات کے جواز پر اس کو کیونکر تسلی ہو، یعنی اس مجموع موجودات کو کہ افلاک و انجم و بحار و جبال اسی میں ہیں نیست و نابود محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود مان لے؛

اے کردہ بہ آرائش گفتار بسیج — در زلف سخن کشودہ راہ خم و پیچ

عالم کہ تو چیز دیگرش میدانی — ذاتیست بسیط منبسط و دیگر ہیچ

جب اولیاء اللہ نے۔ کہ وہ اطباء روحانی ہیں۔ دیکھا کہ نفوس بشری پر وہم غالب ہے۔

اور بسبب استیلاء وہم کے مشاہدۂ وحدتِ ذات سے محروم رہے جاتے ہیں؛ ہر چند ان کو سمجھائیں گے، راہ پر نہ آئیں گے۔ ناچار اشغال واذکار وضع کئے تا قوت متخیلہ اس میں بھی رہے اور رفتہ رفتہ بیخودی طاری ہو جاوے۔ وحدت وجود اس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہو اور ہم اس کو بجبر یا بہ تکلف ثابت کیا چاہتے ہوں۔ دانی ہمہ اوست ورنہ دانی ہمہ اوست۔

وہم صورت گری اور پیکر تراشی کر رہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے پس جب وہ وہم شغل و ذکر کی طرف مشغول ہو گیا بے شبہہ اپنے کام سے یعنی صورت گری اور پیکر تراشی سے معزول ہو گیا۔ بے خبری اور بے خودی چھا گئی اور وہ کیفیت جو موحدین کو بجرد فہم حاصل ہوتی ہے اس شاغل کے نفس کو بے خودی میں آ گئی۔ ایک دریا میں بہا کر کو دا؛ ایک کو کسی نے غافل کر کے دھکیل دیا۔ انجام دونوں کا ایک ہے وہ لوگ جو وحدت وجود کو سمجھ لیں یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں؛ مگر ہاں کم ہیں؛ اور مخفی ہیں، اور کہیں کہیں ہیں اور ایسے نفوس کو جو کسب حالت بیخودی کے واسطے محتاج اشغال واذکار ہیں؛ بہت ہیں بلکہ بے شمار ہیں +

مذہب اور عقل

شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب

بلاشبہ مبدأ فیاض نے انسان کو ظاہری اور باطنی جتنی قوتیں دی ہیں سب میں عقل بڑی زبردست ہے اور وہی مدار تکلیف شرعی ہے لیکن بیش بریں نیست۔ کہ عقل بھی ایک قوت ہے اور جس طرح انسان کی دوسری قوتیں محدود اور ناقص ہیں اسی طرح عقل بھی محدود اور ناقص ہے۔ مثلاً آنکھ۔ کہ خاص فاصلے پر دیکھ سکتی ہے۔ اُس سے باہر نہیں پھر بے روشنی کے کام نہیں دیتی۔ اجسام کثیف میں نفوذ نہیں کرتی اگر دیکھنے والا متحرک ہو (مثلاً فرض کرو۔ کہ کشتی یا ریل میں ہو) تو وہ الٹا ٹھہری ہوئی چیزوں کو متحرک دیکھتا ہے اور اپنے تئیں ٹھہرا ہوا۔ تیز حرکت متشکل معلوم ہوتی ہے جیسے لڑکے لٹو سے کھیلتے ہیں۔ پیالے میں تھوڑا سا پانی بھر کر لکڑی کھڑی کریں تو لچکی ہوئی دکھائی دے گی۔ شفاف پانی کی تہ کی چیزیں اُوپر کو اُبھری ہوئی نظر آتی ہیں اور اسی طرح کی اور بہت سی غلطیاں نظر سے ہوتی ہیں۔ جن کی تفصیل علم مناظر میں موجود ہے۔ غرض جس طرح مثلاً ہماری قوتِ باصرہ محدود اور ناقص ہے اُسی طرح عقل کی رسائی کی بھی ایک حد ہے وہ بھی نقصان سے بری نہیں اور اس سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ غلطی کے واسطے اختلاف رائے کی دلیل کافی ہے ہندسے کے علاوہ جس کے اصول بدیہیات پر مبنی ہیں اور اسی وجہ سے اس میں اختلاف ہو نہیں سکتا۔ ڈاکٹر۔ فلسفی۔ جج۔ ہیئت داں۔ مدبرانِ ملک۔ اہلِ مذہب وغیرہ وغیرہ سبھی کو دیکھتے ہیں۔ کہ ایک دوسرے سے لڑتے مرتے ہیں۔ منطق کے قاعدے مضبط ہوئے مناظرے کے اصول ٹھہرائے گئے مگر اختلاف نہ کم ہوا اور نہ تا قیامت کم ہوگا۔

جب ہست و نیست کا اختلاف ہو تو ضرور ایک برسرِ غلط ہے اگرچہ عقل انسانی کا نقصان اختلاف رائے سے بھی مستنبط ہو سکتا ہے۔ مگر ہم ذرا اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ دو ڈھائی سو برس کے عرصے میں اہل یورپ کو سینکڑوں باتیں ایسی دریافت ہوئیں کہ کسی کو کیمیا کا حکمی نسخہ مل گیا ہوتا اور وہ اُس کو عام بھی کر دیتا۔ تو اتنا فائدہ نہ پہنچتا جتنا کہ ان ماڈرن ڈسکوریز یعنی زمانہ حال کی دریافتوں سے ہوا۔

اور جن اقبالمندوں کو خدا نے واقعات اور موجودات نفس الامری میں غور و خوض کرنے کی دُھن لگا دی ہے۔ خدا ان کی کوششوں کو مشکور و کامیاب کرتا ہے بحر بے پایاں موجودات میں غوطے لگا رہے ہیں۔ اور معلومات جدیدہ کے بے بہا موتی ہیں کہ برابر نکلے چلے آتے ہیں ان ماڈرن ڈسکوریز میں سے زیادہ نہیں صرف ایک چیز عام فہم تو جس سے انگریزوں کے طفیل میں ہم بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں ریل ہے اب ہم پوچھتے ہیں کہ دنیا میں گھر گھر آگ تھی۔ گھر گھر ہنڈیاں پکتی تھیں۔ ہر ہر متنفس بھاپ سے بخوبی واقف تھا سینکڑوں ہزاروں برسوں پہلے سٹیم (بھاپ) کی طاقت کیوں معلوم نہیں ہوئی اور یہی سوال ہر ڈسکوری کی بابت ہو سکتا ہے۔ جواب تک ہوئی یا آئندہ کسی وقت میں ہو۔

سر اسحاق نیوٹن جس کو سب سے پہلے مسئلہ کشش کا الہام ہوا کہتا تھا۔ کہ "خدا کی بے انتہا قدرت کے سمندر میں بے شمار موتی بھرے پڑے ہیں اور میں تو ابھی کنارے پر بیٹھا ہوا سیپیاں اور گھونگھے جمع کر رہا ہوں" یہ مقولہ تھا۔ اُس شخص کا جس نے زمین اور آسمان کے قلابے ملا کر نظام بطلیموس کی جگہ اپنا نظام قائم کیا۔ اور آج سارا یورپ اُس کے نام پر فخر کر رہا ہے۔

جس کو خدا نے عقل دی ہے وہ تو یوں اپنی عقل کی نارسائی کا اعتراف کرتے ہیں اور ایک ہمارے زمانے کے انگریزی خواں ہیں کہ سیدھی سی اقلیدس کی تھیوریم پوچھو تو بغلیں جھانکنے لگیں۔ اور لن ترانیاں یہ۔ کہ ہیچ ماو بیگرے نیست۔ پس جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے عقلِ انسانی کا قصور ہے کہ کھلتا چلا جاتا ہے۔ آپ سے زیادہ نہیں صرف ڈیڑھ سو برس پہلے کسی کی عقل میں یہ بات آسکتی تھی کہ مہینوں کی مسافت ہم گھنٹوں میں طے کر سکیں گے یا ہزار ہا کوس کا حال چند لمحے میں معلوم کر لیا کرینگے۔ یا آگ سے برف جما لینگے یا کپڑے کی کل میں کپاس بھر کر اچھے خاصے دُھلے دُھلائے تہ کئے ہوئے تھان نکال لیا کرینگے۔ اور ابھی کیا معلوم کہ ہم کیا کیا کر سکینگے۔ مگر پھر بھی رہینگے آدمی عاجز۔ ناچیز۔ بے حقیقت۔ بھلا آدمی کیا عقل پر ناز کرے گا جب کہ اُس کو پاس کے پاس اتنا تو معلوم ہی نہیں کہ رُوح کیا چیز ہے؟ اور اُس کو جسم کے ساتھ کس طرح کا تعلق ہے؟

وقت کے ازلی ابدی ہونے پر خیال کرتے ہیں تو انسان کی ہستی ایسی بے ثبات دکھائی دیتی ہے۔ جیسے دن رات میں ایک طرفۃ العین بلکہ اس سے بھی کم۔ اور اس

ہستی پر انسان کے یہ ارادے اور یہ حوصلے۔ کہ گویا زمین اور آسمان میں سمانا نہیں چاہتا۔ پھر کیسے کیسے لوگ ہو گذرے ہیں کہ اس سرے سے اُس سرے تک ساری زمین کو ہلا مارا اور مر گئے تو کچھ بھی نہیں ایک تودۂ خاک! آخر وہ کیا چیز تھی جو اُن میں سے نکل گئی حیوانات نباتات لاکھوں قسم کی مخلوقات کا ایک چکر سا بندھا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے پیدا ہوتے اور اسی میں فنا ہو جاتے ہیں۔ کسی کی عقل کام کرتی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔؟ اور کس غرض سے ہو رہا ہے؛ جان تو ایک قسم کی نباتات میں بھی ہے۔ مگر جانوروں کے بہت سے افعال انسان سے ملتے ہوئے ہیں۔ بلکہ بعض حیوانات بعض باتوں میں انسان پر بھی شرف رکھتے ہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں تو اُن کے تمام کمالات وہبی اور فطری ہیں۔ پھر وہ کون سی تکمیل ہے جس کے لئے ان کو یہ ہستی دی گئی؟

انگریزوں نے تحقیقات کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مگر شروع سے اب تک کسی ایک جگہ یا کسی ایک چیز یا کسی ایک بات کا مسلسل پتہ نہ چل سکا۔ زمانۂ حال سے جس قدر پیچھے کو مڑ کر ہوتے جاتے ہیں۔ نظر تاریخ دھندلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اب سے چار پانچ ہزار برس پہلے کا کسی کو کچھ حال ہی نہیں معلوم کہ دنیا کا کیا رنگ تھا؛ عقل انسانی کی رسائی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی۔ کہ آج تک کسی پر کسی چیز کی ماہیت ہی منکشف نہیں ہوئی جانا تو کیا جانا؛ اعراض۔ وہ بھی شاید فی صد دو مثلاً پانی کہ ہم اُس کا اتنا ہی حال جانتے ہیں۔ کہ سیال (بہنے والا) ہے۔ جو شکل چاہو۔ آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ آمیزش سے پاک ہو۔ تو شفاف ہے۔ نشیب کی طرف کو بہتا ہے۔ وزن مخصوص کے قاعدے سے ۳۲ فٹ سے زیادہ ہوا میں بلند نہیں ہو سکتا۔ حرارت کے اثر سے ہوا بن جاتا ہے۔ یا اگر علم طبعی کے کسی ماہر سے پوچھو تو شاید دو چار خواص اور بیان کر سکے گا۔ مگر یہ سب آثار ہیں نہ ماہیت ماہیت کا نام آیا اور عقل گم ہو گئی۔

بات کیا ہے۔ کہ دنیا ہے عالم اسباب۔ یہاں واقعات کا ایک سلسلہ ہے۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا واقع ہوتا رہتا ہے۔ ہم واقعۂ متقدم کو سبب اور علت کہتے ہیں۔ اور واقعۂ متأخر کو مسبب اور معلول نتیجہ۔ اگرچہ سبب کے قرار دینے میں غلطی بھی نہ کریں۔ تاہم سبب اور مسبب میں جو علاقہ ہے۔ آج تک اُس کا راز کسی پر نہیں کھلا۔ مثلاً جلانا آگ کا خاصہ ہے۔ مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔ مگر

کوئی نہیں بتا سکتا کہ کیوں؟ ذرا آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھو۔ تو روئے زمین کے سارے ریگستانوں میں اتنے ذرّے نہ ہوں گے۔ جتنے ستارے آسمان میں بھرے پڑے ہیں۔ پھر یہ ستارے دیکھنے میں چھوٹے چھوٹے نقطے سے نظر آتے ہیں۔ اور درحقیقت ایک ایک بجائے خود ایک جہان ہے۔ کہ ہماری زمین کی اُس کے سامنے کچھ بھی حقیقت نہیں۔ غرض سوچنے سمجھنے والے کو دنیا سرتاسر طلسمِ حیرت ہے۔

جب دنیاوی امور میں عقلِ انسانی کی نارسائی کا یہ حال ہو کہ کسی بات کی کُنہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ تو دین میں وہ کیا ہماری رہبری کرے گی۔

تو کارِ زمیں را نکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی

یہ دنیا تو پھر بھی عالمِ شہود ہے ہم اِس میں موجود ہیں اور اِس کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور تھوڑا بہت اس میں تصرف بھی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ دین خبر دیتا ہے کہ اِس دُنیا کے سوائے ایک جہاں اور ہے یہ ظاہر ہے وہ غائب۔ یہ فانی ہے وہ باقی۔ یہ مجاز ہے وہ حقیقت۔ یہ تمہید ہے وہ نفسِ مطلب۔ یہ امتحان ہے وہ نتیجہ۔ یہ سفر ہے وہ منزلِ مقصود۔ یہ خواب ہے وہ تعبیر۔ یہ افسانہ ہے وہ حق الامر۔ ظاہر ہے کہ عقلِ انسانی کو اُس جہان کے متعلق کچھ بھی نہیں جاننا چاہئے۔ کیونکہ اس کی انتہائے رسائی سے بہت دور پر ہے۔ لیکن خدا کی بے انتہا مہربانی سے بعید تھا کہ انسان جو اس کی مخلوقات میں سب سے افضل ہے اُس جہان سے بالکل بے خبر رہے اور جس طرح اُس نے اور چیزوں کو دوسرے خواص بخشے ہیں۔ عقلِ انسانی کو نیک و بد کی تمیز عطا فرمائی کہ جاہل سے جاہل اور وحشی سے وحشی بھی بھلائی کی طرف راغب ہے، نہ کسی دنیاوی مفاد کی طمع سے۔ اور برائی سے ہارب (بھاگنے والا) ہے نہ کسی نقصان کے خوف سے۔ بلکہ گویا انسان کا دل مقناطیسی سوئی ہے۔ اور نیکی شمال کی سمت۔ پس اُس جہاں کے متعلق رسائی معلومات۔ واقفیت جو کچھ سمجھو۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ آدمی بالطبع نیکی کو پسند اور بدی کو ناپسند کرتا ہے۔ پھر انسان کی عقل اپنی طرف سے کچھ کمی نہیں کرتی۔ بہتیرا زور مارتی ہے۔ کہ وہاں کی حقیقت دریافت کروں۔ مگر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ؎

حالِ عدم نہ کچھ کھلا گذرے ہے رنگاں پہ کیا کوئی حقیقت آن کر کہتا نہیں بُری بھلی

نیکی بدی کے امتیاز کے ساتھ اس کو اتنی بات اور بھی سوجھتی ہے۔ کہ انسان کے ہر ایک فعل کو ایک نتیجہ لازم ہے۔ اگرچہ بسا اوقات بعض افعال کے نتائج اِسی دنیا میں واقع ہو

جاتے ہیں۔ مگر بعض کے نہیں بھی ہوتے اور ہم دیکھتے ہیں کہ دنیاوی نتائج کے علاوہ طبیعتیں کسی اور نتیجے کی بھی منتظر رہتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک جہاں اور ہونا چاہئے اور اس کی ضرورت ہے اور نہیں معلوم کیا سبب ہے کہ دل خود بخود اندر سے گواہی دیتا ہے۔ کہ مرنے سے تو ہمارا پیچھا چھوٹتا ہوا نظر نہیں آتا۔ مرے پیچھے ہم کسی حالت میں رہیں۔ مگر رہیں گے ضرور۔ پس یہاں تک عقل کی پرواز تمام ہوئی ؎

اگر یک سرِ موئے برتر پرم ؎ فروغ تجلی بسوزد پرم ؎

مگر اس سے تو کچھ بھی کشود کار نہ ہوا۔ دل جو اُس جہاں کے تفصیلی حالات کے مشتاق تھے۔ بدستور جُویا کے جُویا رہے۔ اب دین کی سرحد میں آگے بڑھنا چاہتے ہو۔ تو چراغِ عقل کو گُل کرو۔ اور آفتاب جہاں تاب کلام الٰہی کو اپنا ہادی اور راہ نما قرار دو ؎

ہماری تعلیم

کچھ خبر بھی ہے۔ کہ علم نے اس زمانے میں دوسری شان اختیار کی ہے۔ ہم جو اپنے علوم پر نظر کرتے ہیں تو اُن کے دو ہی نتیجے پاتے ہیں۔ یا تو زبان کی تکمیل یا ذہن کی تیزی۔ سو زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ دونوں نتیجے بے کار ہو گئے۔ جن زبانوں کی تکمیل کے پیچھے ہم عُمر کا بڑا حصہ صرف کیا کرتے تھے۔ اَب اُن زبانوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ رہی ذہن کی تیزی یعنی حکمت نظری۔ اس کا بھرم حکمتِ عملی نے اٹھا دیا۔ اور ہم علم کے اعتبار سے بالکل کورے کے کورے رہ گئے۔ زبان کی تکمیل سے جو اغراض دنیوی متعلق ہو سکتے ہیں۔ وہ اب انگریزی کی طرف منتقل ہو گئے ہیں۔ لیکن ہم میں سے اکثر اُن اغراض کے سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ لوگوں نے اسی کو انگریزی کی غرض و غایت سمجھ رکھا ہے۔ اور اسی لئے اس کو سیکھتے ہیں۔ کہ حکامِ وقت کی زبان ہے اور اسی کے ذریعے سے ہم حکام کے ساتھ بآسانی خیالات کا مبادلہ یعنی عرضِ مطلب۔ فہم مافی الضمیر کر سکتے ہیں بلاشبہ حاکم اور محکوم میں بآسانی خیالات کا مبادلہ بڑی ضروری اور بکار آمد چیز ہے۔ لیکن میں انگریزی کی ٹون کو ذرا اونچی لے جانا چاہتا ہوں۔ حکام کے ساتھ خیالات کا مبادلہ تو انگریزی کے ادنیٰ ترین اور خسیس ترین فائدوں میں سے ہے۔ انگریزی کا اصلی اور عمدہ فائدہ جو مدِ نظر ہونا چاہئے یہ ہے۔ کہ زبان انگریزی علومِ مفیدہ کی کلید ہے یہ علوم یا تو میرے سے ایشیائی زبانوں میں ہیں ہی نہیں

یا ہیں بھی تو زمانہ حال کی تحقیقات کے مقابلے میں تقویم پارینہ کا حکم رکھتے ہیں۔ انگریزی زبان قوم اور ملک کو اُسی وقت مفید ہوگی جب یہ مقصود پیش نظر رکھ کر اُس کو حاصل کروگے غرض یہ ہے کہ علم مقصود بالذات اور زبان انگریزی کو اُس کا آلہ سمجھا جائے۔ افسوس ہے کہ اس گُر کو ابھی تک لوگوں نے سمجھا ہی نہیں۔ یا سمجھا ہے تو اس پر عمل نہیں کیا اور سمجھا اور اُس پر عمل کیا ہوتا۔ تو اتنے ہی دنوں میں ہندوستان کی کایا پلٹ گئی ہوتی تحقیقات مزید اور ترقی اور ایجاد کا تو کیا مذکور ہے جو علوم زبان انگریزی میں مُدوّن ہیں اور جس درجے تک وہ پہنچ چکے ہیں۔ اتنے ہی پر کسی نے کچھ عمل کرکے دکھایا ہوتا۔ ہمارے بدنصیب ہندوستان میں میٹیریل کی تو کمی نہیں۔ کمی ہے تو اس کی ہے۔ کہ کوئی میٹیریل کا استعمال کرنے والا نہیں ایک تو نوکری کی لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں۔ اور نوکری کیمیا اور کبریت احمر ہوتی جاتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً سو بی۔ اے پاس ہوتے تو نو ۹۰ روٹیوں کے لئے سرگرداں پڑے پھرتے ہیں اور نوّے بھی اب ہیں یا کوئی دن جاتا ہے کہ سو پاس۔ اور سو کے سو پاس حیراں و یاس انگریزی پڑھ کر کچھ فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو پہلے نوکری کے خبط کو سر سے نکالو۔ یہ جنوں تمہیں نہیں پنپنے دے گا۔ کبھی ان باتوں پر بھی غور کیا کرو۔ کہ مثلاً تمہارے اسی شہر میں کتنے آدمی ہیں اور اُن میں کتنے ہیں جو نوکری سے معاش پیدا کیا کرتے ہیں۔ حساب لگاؤ گے تو فی صدی کوئی مچھتے پانچویں درجے کا ڈسمل نکلے گا۔ پھر مردم آزاری کے مواقع پاکر شیخی بگھارنے کی تو بات اور ہے۔ خوشحالی کا ایک اسٹنڈرڈ قرار دے لو۔ مثلاً میں سمجھتا ہوں کہ جس کی سو روپیہ ماہوار کی آمدنی ہو۔ اُس کو اس زمانے میں خوشحال سمجھنا چاہئے اب دیکھو کہ خوشحالی کے اسٹنڈرڈ کے لحاظ سے نوکری پیشوں میں فی صد کتنے ہیں اور دوسرے پیشوں میں کتنے تو پاؤ گے۔ کہ اس نسبت میں نوکری پیشہ چھتے پانچویں درجے کے ڈسمل سے بھی دور ہٹے ہوئے ہیں۔ پس تم انگریزی پڑھ کر جو ایک نوکری پر دھتا دو تو اُس کے یہ معنی ہوں گے۔ کہ اس عمارت کو جو برسوں کی محنت سے بنائی ہے اپنے ہاتھوں ڈھاتے ہو۔ عقلاً شرعاً کوئی سا پیشہ بھی متبذل نہیں۔ متبذل اگر ہے تو وہ آدمی ہے جو دغا بازی، بے ایمانی سے پیشہ کو بدنام کرتا ہے۔ دل پر دینداری اور نیکی کا پرتو پڑا ہو تو جانو۔ کہ اصلی عزت کیا ہے خدا کے نزدیک بڑا بزرگ وہ ہے۔ جو بڑا پرہیزگار ہو" لوگ نہ اِس لئے نوکری کے گرویدہ ہو رہے ہیں۔ کہ اس پیشہ میں تموّل اور خوشحالی زیادہ ہے۔ نہیں بلکہ اس لئے کہ انکو اپنے

ابنائے جنس پر حکم چلانے اور اُن کو ستانے اور ایذا دینے کا موقع ملتا ہے لوگوں نے اسی کو عزت سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ نیک دل اور دیندار آدمی کی نظر میں اس سے بڑھ کر کوئی بے عزتی کی بات نہیں تم تو نصیحت کی بات کو اس کان سُنتے اور اُس کان نکال دیتے ہو۔ تحکم اور مردم آزاری کو عزت سمجھو۔ تو نوکری ذریعہ عزت ہے اور پرائی تابعداری کے اعتبار سے دیکھو۔ تو وہ ایک طرح کی غلامی ہے۔ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو آخر کسی نہ کسی کی محکومی تو اُس میں ہو ہی گی غرض نوکری کو عموماً پیشہ معزز سمجھنا محض خیالی بات ہے۔ عزت اور ذلت کسی پیشے پر موقوف نہیں۔ بلکہ عزت اور ذلت کا مدار انسان کا اپنا کردار ہے اگر کوئی شخص کسی بڑی خدمت پر مامور ہے اور وہ آدمی بھی معقول رکھتا ہے اور بڑی شان سے زندگی بسر کرتا ہے۔ حکومت بھی ہے۔ اختیارات بھی ہیں اور سرکار میں رسائی ہے تو وہ ناحق بندگانِ خدا کو ایذا دیتا۔ اور اُن کے حقوق تلف کرتا۔ اور رشوت لیتا ہے حقیقت میں وہ سب سے زیادہ ذلیل ہے نہ صرف پبلک کی نظر میں بلکہ خود اپنی نظر میں اور خدا کے نزدیک۔ لیکن ایک غریب آدمی جو محنت مزدوری سے جائز طور پر معاش پیدا کرتا۔ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہیں کوئی اس کا شاکی نہیں۔ ایسا شخص اصلی عزت رکھتا اور اُس کا مستحق ہے۔

اس وقت جو اس تعلیم کے ساتھ تعلیم ہو رہی ہے۔ اور تعلیم کو اس سے بھی زیادہ عام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اچھی طرح طالب علموں کے ذہن نشین کر دینا چاہئے کہ نوکری کے خبط کو سر میں نہ آنے دیں۔ ورنہ تعلیم سے فائدے کی جگہ اُلٹا نقصان اٹھائینگے۔ اور ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی اور نہ صرف اپنی زندگی بلکہ اور بہت سی زندگیاں جو اُن کے ساتھ وابستہ ہیں سب کو تلخ کر دینگے۔ میرے اس بیان سے کوئی صاحب ایسا نہ سمجھیں کہ میں تعلیم کی طرف سے لوگوں کے دلوں کو اُچاٹ کرتا ہوں میرا مقصود ہرگز یہ نہیں۔ میں تو تعلیم کو اور اسی تعلیم کو جو ان دنوں ہو رہی ہے۔ ہر فرد بشر کے لئے نہایت ضروری خیال کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھ کو وہ دن آتا ہوا دکھائی دے رہا ہے (اگرچہ جب تک وہ آئے آئے میں دنیا سے رخصت ہو جاؤنگا) جب کہ یہی تعلیم شرط زندگی ہونے والی ہے۔ اور زندگی سے میری مراد ہے۔ معزز اور مطمئن ہیں +

میرا مطلب صرف اس قدر ہے۔ کہ جو لوگ تعلیم پا رہے ہیں۔ اور تعلیم تو سبھی کو پانی چاہئے غرض سارے تعلیم یافتہ اگر ایک ہی پیشے پر جھک پڑیں گے گو وہ پیشہ فی حدِّ ذاتہ کیسا ہی وسیع

کیوں نہ ہو یہ اُس کا ضروری اور بدیہی نتیجہ ہے کہ سب بھوکوں مریں۔ لوگوں کی ضرورتیں متنوع ہیں۔ اور اس سے دنیا میں متنوع پیشے چل پڑے ہیں۔ انسانی ضرورتوں اور پیشوں کے تنوع سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ دنیا میں روزی کی کمی نہیں مگر ہم ایک پیشۂ خاص سے مقید ہو کر روزی کو تنگ کر لیتے ہیں۔ اب یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ نوکری کے علاوہ دوسرے پیشوں کے لئے تعلیم ہی کی کیا ضرورت ہے؟ جواب یہ ہے کہ تعلیم سے تو کبھی کوئی ادنےٰ پیشہ بھی بے نیاز نہیں ہوا۔ ہاں تعلیم سینہ بہ سینہ ہوتی رہتی ہے۔ یا نقل و تقلید سے اس زمانے میں یہ نئی بات پیدا ہوتی ہے۔ کہ ایک ایک چیز اور ایک ایک کام علم مستقل قرار پایا ہے۔ مثلاً موسیقی۔ کہ ہمارے یہاں سینہ بہ سینہ اُس کی تعلیم ہوتی ہے یا نقل و تقلید سے لوگ اُس کو حاصل کرتے ہیں۔ مگر تم نے انگریزی بینڈ بجتے دیکھے ہوں گے کہ اونچی اونچی میزوں کا ایک حلقہ ہے لوگ مزامیر لئے اُس کے گرد کھڑے ہیں۔ ہر ایک کے آگے ایک کتاب دھری ہے۔ صدر مقام پر بینڈ ماسٹر کھڑا ہوا باجے بجوا رہا ہے۔ انگریزوں کی ولایت میں تو یہ حال ہو گیا ہے کہ درزی اور حجام اور موچی اور لوہار تک اپنا پیشہ نہیں چلا سکتا۔ تاوقتیکہ اُس نے سبقاً سبقاً اپنے پیشے کی کتابی تعلیم نہ پائی ہو۔ اور یہ بات سب پر روشن ہے۔ کہ یہ ہندوستان کل باتوں میں یورپ کی تقلید کرتا چلا جا رہا ہے اور تقلید کے بدون اُس کو کوئی چارہ نہیں یہ تعلیم گو کسی خاص پیشے کی نہ بھی ہو۔ تاہم اس سے اتنی آگاہی تو انسان کو ضرور ہو جاتی ہے کہ وہ جس کام کو اختیار کریگا اُس کو کر دکھائے گا اور سلیقے کے ساتھ کر دکھائے گا۔

شاعری کے ضروری عناصر

(شمس العلماء مولینا شبلی نعمانی)

شاعری کی حقیقت شاعری چونکہ وجدانی اور ذوقی چیز ہے اس لئے اس کی جامع و مانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جاسکتی، اس بنا پر مختلف طریقوں سے اس کی حقیقت کا سمجھانا زیادہ مفید ہوگا۔ کہ ان سب کے مجموعہ سے شاعری کا ایک صحیح نقشہ پیش نظر ہو جائے۔

خدا نے انسان کو مختلف اعضا اور مختلف قوتیں دی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے فرائض اور تعلقات الگ ہیں، ان میں سے دو قوتیں تمام افعال اور ارادات کا سرچشمہ ہیں۔ ادراک اور احساس، ادراک کا کام، اشیا کا معلوم کرنا اور استدلال اور استنباط سے کام لینا ہے، ہر قسم کی ایجادات، تحقیقات، انکشافات، اور تمام علوم و فنون اسی کے نتائج عمل ہیں۔

احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا، یا کسی مسئلہ کا حل کرنا۔ یا کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہیں ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی مؤثر واقعہ پیش آتا ہے، تو وہ متاثر ہو جاتا ہے، غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے، خوشی میں سرور ہوتا ہے، حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے، یہی قوت جس کو احساس، انفعال، یا فیلنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ شاعری کا دوسرا نام ہے یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے۔ تو شعر بن جاتا ہے۔

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہو جاتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

مثلاً شیر گونجتا ہے، مور چنگھاڑتے ہیں۔ کویل کوکتی ہے، طاؤس ناچتا ہے، سانپ لہراتے ہیں، انسان کے جذبات بھی حرکات کے ذریعے سے ادا ہوتے ہیں۔ لیکن اسکو جانوروں سے بڑھ کر ایک اور قوت دی گئی ہے یعنی نطق اور گویائی، اس لئے جب اس پر کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں اسی کا نام شعر ہے۔

اب منطقی پیرایہ میں شعر کی تعریف کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ "جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں"۔ اور چونکہ یہ الفاظ، سامعین کے جذبات پر بھی اثر کرتے ہیں۔ یعنی سننے والوں پر بھی وہی اثر طاری ہوتا ہے جو صاحب جذبہ کے دل پر طاری ہوا ہے اس لئے شعر کی تعریف یوں بھی کر سکتے ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریک میں لائے وہ شعر ہے،

ایک یورپین مصنف لکھتا ہے کہ "ہر چیز جو دل پر استعجاب، یا حیرت، یا جوش یا اور کسی قسم کا اثر پیدا کرتی ہے شعر ہے"۔ اس بنا پر فلک نیلگوں، انجم درفشاں، نسیم سحر، گلگونۂ شفق، تبسم گل، خرام صبا، نالۂ بلبل، ویرانی دشت، شادابی چمن، غرض تمام عالم شعر ہے۔ یہ آج کل کا خیال ہے لیکن عجیب بات ہے کہ حضرت خواجہ فریدالدین عطار نے آج سے چھ سو برس پہلے کہا تھا ؎

پس جہاں شاعر بود چوں دیگراں

جو چیزیں دل پر اثر کرتی ہیں، بہت سی ہیں۔ موسیقی، مصوری، سنگتراشی وغیرہ۔ لیکن شاعری کی اثر انگیزی کی حد سب سے زیادہ وسیع ہے۔ موسیقی صرف قوت سامعہ کو محظوظ کر سکتی ہے۔ سامعہ نہ ہو تو وہ کچھ کام نہیں کر سکتی، تصویر سے متاثر ہونے کے لئے بینائی شرط ہے، لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے؛ باصرہ، ذائقہ، شامہ، لامسہ سب اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں، فرض کرو۔ شراب آنکھوں کے سامنے نہیں ہے اس لئے آنکھ اس وقت اس سے حظ نہیں اٹھا سکتی لیکن جب ایک شاعر اس کو آتش سیال سے تعبیر کرتا ہے تو ان الفاظ سے ایک مؤثر منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، اسی طرح بوسہ کو شاعرانہ انداز میں تنگ شکر کہہ دیتے ہیں تو کام و زبان کو مزہ محسوس ہوتا ہے ؛

کسی چیز کی حقیقت اور ماہیت کے تعین کرنے کا آسان علمی طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کا کوئی نمایاں وصف لے لیا جائے پھر یہ دیکھا جائے کہ اس وصف میں اور کیا کیا چیزیں اس کے ساتھ شریک ہیں۔ پھر ان صفات کو ایک ایک کرکے متعین کیا جائے جن کی وجہ سے یہ چیز اپنی اور ہم جنس چیزوں سے الگ اور ممتاز ہوتی گئی ہے ؛

اس قدر سب تسلیم کرتے ہیں کہ شعر کا نمایاں وصف جذبات انسانی کا برانگیختہ کرنا

ہے۔ یعنی اس کو سن کر دل میں رنج، خوشی یا جوش کا اثر پیدا ہوتا ہے، یہ خصوصیت، شاعری کو سائنس اور علوم و فنون سے ممتاز کر دیتی ہے، شاعری کا تخاطب جذبات سے ہے اور سائنس کا یقین سے۔ سائنس، استدلال سے کام لیتا ہے۔ اور شاعری محرکات کو استعمال کرتی ہے۔ سائنس عقل کے سامنے کوئی علمی مسئلہ پیش کرتا ہے، لیکن شاعری احساسات کو دلکش مناظر دکھاتی ہے۔ لیکن یہ خاصیت، موسیقی، تصویر بلکہ مناظر قدرت میں بھی پائی جاتی ہے، اس لئے کلام یا الفاظ کی قید لگانی چاہیئے کہ یہ چیزیں بھی اس دائرہ سے نکل جائیں۔ تاہم خطبہ (لکچر) تاریخ، افسانہ، اور ڈراما، شاعری کی حدمیں داخل رہیں گی۔ ان میں اور شعر میں حد فاصل قائم کرنا مشکل ہے۔ زیادہ دقت اس لئے ہوتی ہے کہ اکثر اعلیٰ نظمیں افسانہ کی شکل میں ہوتی ہیں۔ اور اکثر افسانوں میں شاعری کی روح پائی جاتی ہے، اس لئے دونوں جب باہم ملجاتی ہیں۔ تو ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ افسانہ اسی حد تک افسانہ ہے۔ جہاں تک اس میں خارجی واقعات اور زندگی کی تصویر ہوتی ہے۔ جہاں سے اندرونی جذبات اور احساسات شروع ہوتے ہیں۔ وہاں شاعری کی حد آجاتی ہے۔ افسانہ نگار بیرونی اشیاء کا استقصا کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے، بخلاف اس کے شاعر اندرونی جذبات اور احساسات کی نیرنگیوں کا ماہر بلکہ تجربہ کار ہوتا ہے۔

شاعری کے اصلی عناصر کیا ہیں؟ ایک عمدہ شعر میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں وزن ہوتا ہے۔ محاکات ہوتی ہے یعنی کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ خیال بندی ہوتی ہے، الفاظ سادہ اور شیریں ہوتے ہیں۔ بندش صاف ہوتی ہے، طرز ادا میں جدت ہوتی ہے۔ لیکن کیا یہ سب چیزیں، شاعری کے اجزاء ہیں؟ کیا ان میں سے ہر ایک ایسی چیز ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو شعر شعر نہ ہوتا۔ اگر ایسا نہیں ہے۔ اور قطعاً نہیں ہے تو ان تمام اوصاف میں خاص اُن چیزوں کو متعین کر دینا چاہیئے۔ جن کے بغیر شعر، شعر نہیں رہتا۔ عام لوگوں کے نزدیک یہ چیز وزن ہے۔ اس لئے عام لوگ کلام موزوں کو شعر کہتے ہیں۔ لیکن محققین کی یہ رائے نہیں۔ وہ وزن کو شعر کا ایک ضروری جزء سمجھتے ہیں۔ تاہم ان کے نزدیک وہ شاعری کا اصل عنصر نہیں ہے۔

ارسطو کے نزدیک یہ چیز محاکات یعنی مصوری ہے۔ لیکن یہ بھی صحیح نہیں، اگر کسی شعر میں تخیل ہو۔ اور محاکات نہ ہو تو کیا وہ شعر نہ ہوگا؟ سینکڑوں اشعار ہیں۔ جن میں محاکات

کے بجائے صرف تخیل ہے اور باوجود اس کے وہ عمدہ اشعار خیال کیے جاتے ہیں۔ شاید یہ کہا جائے کہ محاکات ایسا وسیع مفہوم ہے کہ تخیل اس کے دائرہ سے باہر نہیں جا سکتی۔ اس سے تخیل بھی محاکات ہے لیکن یہ زبردستی ہے۔ آگے چل کر جب ہم محاکات اور تخیل کی تعریف لکھیں گے تو واضح ہو جائیگا کہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، گو یہ ممکن ہے کہ بعض مثالوں میں دونوں کی سرحدیں مل جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے، محاکات اور تخیل ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا، باقی اوصاف یعنی سلاست، صفائی حسن بندش وغیرہ وغیرہ شعر کے اجزائے اصلی نہیں۔ بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں۔

محاکات کی تعریف۔ محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، تصویر اور محاکات میں یہ فرق ہے کہ تصویر میں اگرچہ مادی مشیاء کے علاوہ، حالات یا جذبات کی بھی تصویر کھینچی جا سکتی ہے چنانچہ اعلےٰ درجہ کے مصور۔ انسان کی ایسی تصویر کھینچ سکتے ہیں۔ کہ چہرہ سے جذباتِ انسانی مثلاً رنج خوشی، تفکر، حرکات، اضطراب پریشانی۔ بیتابی ظاہر ہو۔ جہانگیر کے سامنے ایک مصور نے ایک عورت کی تصویر پیش کی تھی۔ جس کے تلوے سہلائے جا رہے ہیں۔ تلووں کے سہلاتے وقت چہرہ پر گدگدی کا جو اثر طاری ہوتا ہے وہ تصویر کے چہرہ سے نمایاں تھا تاہم تصویر ہر جگہ محاکات کا ساتھ نہیں دے سکتی سینکڑوں گوناگوں واقعات حالات اور واردات ہیں۔ جو تصویر کی دسترس سے باہر ہیں۔ خلاقانی ایک موقع پر بہار کا سماں دکھاتا ہے،

نسیم، زیرِ گلاں می خزد — شغب ایں می مکد، عارض آں می مزد،
سنبل ایں می کشد، گردن آں می گزد — گہ بر ایں می چمد، گہ بہ سمن می وزد
گاہ بشاخ درخت گہ بہ لبِ جوئبار

یعنی "ملکی ملکی ہوا آئی پھولوں میں گھسی، کسی پھول کا گال چوم لیا، کسی کی ٹھوڑی چوس لی، کسی کے بال کھینچے، کسی کی گردن دانت سے کاٹی، کیاریوں میں کھیلتے کھیلتے چنبیلی کے پاس پہنچی اور درخت کی ٹہنیوں میں سے ہوتی ہوئی نہر کے کنارے پہنچ گئی۔ اس سماں کو مصور تصویر میں کیونکر دکھا سکتا ہے۔

تصویر کا اصلی کمال یہ ہے۔ کہ اصل کے مطابق ہو اور اگر مصور اس امر میں کامیاب ہو گیا تو اس کو کامل فن کا خطاب مل سکتا ہے لیکن شاعر کو اکثر موقعوں پر دو مشکل مرحلوں کا

ہوتا ہے۔ یعنی نہ اصل کی پوری پوری تصویر کھینچ سکتا ہے۔ کیونکہ بعض جگہ اس قسم کی پوری مطابقت احساسات کو برانگیختہ نہیں کر سکتی، نہ اصل سے زیادہ ہو سکتا ہے ورنہ اس پر اعتراض ہوگا کہ صحیح تصویر نہیں کھینچی۔ اس موقع پر اس کو تخئیل سے کام لینا پڑتا ہے، وہ ایسی تصویر کھینچتا ہے جو اصل سے آب تاب اور حسن و جمال میں بڑھ جاتی ہے لیکن وہ قوت تخئیل سے سامعین پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے۔ لوگوں نے اس کو امعان نظر سے نہیں دیکھا تھا اس لئے اس کا حسن پورا نمایاں نہیں ہوا تھا۔

تخئیل تخئیل کی تعریف **ہنری لوئیس** نے یہ کی ہے، وہ قوت جس کا یہ کام ہے کہ ان اشیاء کو جو مرئی نہیں ہیں۔ یا جو ہمارے حواس کی کمی کی وجہ سے ہمکو نظر نہیں آتیں، ہماری نظر کے سامنے کر دے۔ لیکن یہ تعریف پوری جامع اور مانع تعریف ہو بھی نہیں سکتی۔

تخئیل دراصل قوت اختراع کا نام ہے، عام لوگوں کے نزدیک منطق یا فلسفہ کا موجد صاحب تخئیل نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اگر خود کسی فلسفہ دان کو اس لقب سے خطاب کیا جائے۔ تو اس کو عار آئے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ اور شاعری میں قوت تخئیل کی یکساں ضرورت ہے یہ ہی قوت تخئیل ہے جو ایک طرف فلسفہ میں ایجاد اور اکتشاف مسائل کا کام دیتی ہے۔ اور دوسری طرف شاعری میں شاعرانہ مضامین پیدا کرتی ہے، چونکہ اکثر سائنس دان شاعری کا مذاق نہیں رکھتے اور شعرا، فلسفہ اور سائنس سے نامانوس ہوتے ہیں اس لئے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ قوت تخئیل کو فلسفہ اور سائنس سے تعلق نہیں، لیکن یہ صحیح نہیں، بے شبہ عام سائنس یا فلسفہ جاننے والے جن میں قوت ایجاد نہیں۔ قوت تخئیل نہیں رکھتے، لیکن جو لوگ کسی مسئلہ یا فن کے موجد ہیں۔ ان کی قوت تخئیل سے کون انکار کر سکتا ہے۔ **نیوٹن** اور **ارسطو** میں اسی قدر زبردست قوت تخئیل تھی۔ جس قدر **ہومر** اور **فردوسی** میں، البتہ دونوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں۔ اور دونوں کی قوت تخئیل کے استعمال کا طریقہ الگ الگ ہے۔ فلسفہ اور سائنس میں قوت تخئیل کا استعمال اس غرض سے ہوتا ہے۔ کہ ایک علمی مسئلہ حل کر دیا جائے، لیکن شاعری میں تخئیل سے یہ کام لیا جاتا ہے کہ جذبات انسانی کو تحریک ہو فلسفی کو صرف اُن موجودات سے غرض ہے جو واقع میں موجود ہیں۔ بخلاف اس کے شاعر اُن موجودات سے بھی کام لیتا ہے جو مطلق موجود نہیں، فلسفہ کے دربار میں ہما، سیمرغ، گاؤزمین تخت سلیماں کی مطلق قدر نہیں۔ لیکن یہی چیزیں ایوان شاعری کے نقش و نگار ہیں۔ فلسفی

کی زبان سے اگر سیمرغ زریں پر کا لفظ نکل جائے تو ہر طرف سے ثبوت کا مطالبہ ہوگا، لیکن شاعر اس قسم کی فرضی مخلوقات سے اپنا عالم خیال آباد کرتا ہے۔ اور کوئی اس سے ثبوت کا طالب نہیں ہوتا کیونکہ فلاسفر کی طرح وہ کسی مسئلہ کی تعلیم کا دعوے نہیں کرتا بلکہ وہ ہم کو صرف خوش کرنا چاہتا ہے اور بے شبہ وہ اس میں کامیاب ہوتا ہے، ایک پھول کو دیکھ کر سائنس دان تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ کہ وہ نباتات کے کس خاندان سے ہے، اس کے رنگ میں کن رنگوں کی آمیزش ہے۔ اس کی غذا زمین سے کن اجزا سے ہے؛ اس میں نر و مادہ دونوں کے اجزاء ہیں یا صرف ایک کے؛ لیکن شاعر کو ان چیزوں سے غرض نہیں، پھول دیکھ کر بے اختیار اسکو یہ خیال پیدا ہوتا ہے ؎

اے گل بتو خرسندم تو بوے کسے داری

چاند کی نسبت ایک ہیئت دان کو ان مسائل سے غرض ہے کہ وہ کن عناصر سے بنا ہے؛ آباد ہے یا ویران؛ روشن ہے یا تاریک؛ سمندر کے مد و جزر سے اس کو کیا تعلق ہے؛ وغیرہ وغیرہ لیکن شاعر کو چاند سے صرف یہ غرض ہے کہ وہ معشوق کا روئے روشن ہے،

شاعر کے سامنے (قوت تخیل کی بدولت) تمام بے حس اشیاء جاندار چیزیں بن جاتی ہیں اس کے کانوں میں ہر طرف سے خوش آیند صدائیں آتی ہیں۔ زمین، آسمان، ستارے، بلکہ ذرہ ذرہ اُس سے باتیں کرتا ہے ؛

قوت تخیل کے ذریعہ سے اکثر شاعر ایک نیا دعوے کرتا ہے اور خیالی دلائل پیش کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک منطقی اس کی دلیل نہ تسلیم کرے۔ لیکن جن لوگوں کو وہ قوت تخیل کے ذریعہ سے معمور کر لیتا ہے۔ وہ اس کے تسلیم کرنے میں مطلق تامل نہیں کر سکتے۔ مثلاً ایک شاعر کہتا ہے،

دوشش از برم چو رفتی آگہ نگشتم آرے — عمرے در رفتن عمر آواز پا نہ دارد

یعنی معشوق جو گودی سے نکل کر چلا گیا تو مجھ کو خبر نہیں ہوئی، کیونکہ معشوق عاشق کی زندگی ہے، اور زندگی کے جانے کے وقت جانے کی آہٹ نہیں معلوم ہوتی۔ اس دلیل کے دو مقدمے اور ہیں ۔۔ معشوق عاشق کی زندگی ہے ،، زندگی کے جانے کی آہٹ نہیں معلوم ہوتی ،، ان دونوں میں سے تم کس کا انکار کر سکتے ہو ؛

فراق اور دھوکا

(مصوّرِ غم مولینا راشد الخیری کے خوں چکاں کے قلم سے)

افسانہ شاہین و دراج مولینا راشد الخیری کا ماسٹر پیس ہے۔ اس دلگداز افسانے کا وہ حصّہ جس میں مولینا موصوف کی طرزِ تحریر بے نقاب ہو جاتی ہے درج کیا جاتا ہے۔

(مرتب)

تارے چمکے اور چھپے۔ چاند گھٹا اور بڑھا۔ دن نکلے اور ڈھلے۔ راتیں آئیں اور گئیں! نظامِ عالم کے تغیّرات۔ کیا جاڑا کیا برسات۔ کیا دن اور کیا رات ہوئے اور کھلم کھلا ہوئے راتیں پھریں۔ موسم پلٹے۔ زمانہ بدلا۔ کلیاں پھول ہو ہو کر مرجھائیں۔ پھول کھل کھل کر کملائے۔ ہری بھری شاخیں سرسبز شاداب پودے دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنٹھ ہو گئے۔ اور سوکھی کھڑنگ ڈالیاں آناً فاناً میووں سے لد گئیں۔

کارخانۂ قدرت کا ہر ذرّہ متحرک اور حیاتِ انسانی کا ہر حال متغیر۔ مگر قیام تھا تو غریب دراج کی مصیبت میں ہر چند کوشش کرتا۔ کہ کسی طرح دل نو گرفتار کو تسکین ہو۔ لیکن شاہین کا فراق! بلائے کے درماں! ایسا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا۔ کہ چند ہی روز میں مُردوں کی سی صورت ہو گئی۔ دیوانہ وار ادھر اُدھر پھرتا۔ مضطرب و بے قرار ہر طرف جاتا۔ مگر خدا بھلا کرے جشنِ نوروز کا کچھ ایسی گھڑی کی آگ لگی کہ جتنا بجھاتا تھا اتنی ہی زیادہ بھڑکتی تھی۔ ماں بہنیں۔ دوست۔ آشنا۔ عزیز و اقارب۔ اپنی اپنی جگہ سب ہی نے سمجھایا۔ مگر کیسی درستی اور کس کی اصلاح کہاں کی۔ بہن اور کر دھر کا بھائی۔ وہ اس کو ایسے تھے جیسے گائے کو قصائی۔ محل کے نیچے جاتا۔ ٹھنڈے سانس بھرتا۔ جنگلوں کی سیر کرتا۔ میدانوں کی خاک اڑاتا۔ وحشیوں کی طرح رہتا۔ دیوانوں کی طرح پھرتا۔ زابستان کا وحشت خیز جنگل۔ دوپہر کا سنسان کا وقت۔ نصف النہار کا سورج سر پر! ببولوں کے زرد زرد پھول دائیں بائیں۔ دریائے ماموں آنکھ کے سامنے ہوتا۔ اور شاہین کا شیدائی دیوانہ و سودائی دراج خانہ برباد اپنی محبوبہ کی یاد میں صبح کو دوپہر اور دوپہر کو شام کرتا۔ آخری مہینے کی اندھیری راتیں اُن ہولناک دروں میں بسر ہو جاتیں۔ جہاں دن ہاتھے جاتے کلیجے دہلتے تھے۔ دوسرے تیسرے دن گھنٹہ آدھ گھنٹہ کو گھر جاتا تھوڑا بہت

کھا پی جدھر منہ اٹھا چمپت ہوا۔ وہی جو کسی وقت پکا سیر بھر اناج اس طرح نمٹاتا۔ کہ بورا تک نہ بچے اب دو دو تین تین وقت کے بعد آدھ پاؤ تین چھٹانک کھا لیتا ہوگا۔ وہ بھی کچھ عزیزوں کی زبردستی کچھ ہمجنسوں کا کہنا سننا۔ انجام یہ ہوا۔ کھانے سے کی لاپروائی غم سے پڑا پالا تسکین ہوئی نہیں طاقت تھی کہ دن بدن گھٹنے لگی سکت و توانائی رفو چکر کس بل غائب غلہ۔ ہاتھی جیسا ڈیل سوکھ کر کانٹا ہوگیا۔ انگوٹھی پر نشانہ رومال پہ قربان خیال پر فدا دو مہینے کا فراق قیامت کا سامنا تھا۔ جس نے ہوش و حواس سب کھو دیئے۔ ایک دفعہ رات کے وقت کنار دریا پر بیٹھا شاہین کے خیال میں غرقاب تھا نگاہ آسمان پر جا پہنچی چاند مدھم پڑ چکا تھا! تارے ٹوٹ ٹوٹ کر جھڑ رہے تھے۔ کچھ دیر دیکھتا رہا۔ اور پھر بے ساختہ چلا اٹھا +

ہاں ہاں! سات سہیلی کے جھگمگے نکل نکل چھپ چھپ کے نکل اور ماند ہو ہو کے چمک مگر شاہین کی صورت نہ دکھائیو" ابھی یہ الفاظ ختم نہ ہوئے تھے کہ ایک سانڈنی سوار روشنی ہاتھ میں لئے قریب آیا اور کہا +

"مرزا صاحب! میں صبح سے تلاش کر رہا ہوں یہ ملکہ بلند اقبال کا خط ہے" سانڈنی سوار خط دے کر رخصت ہوا۔ رات کا پچھلا پہر اندھیرا گھپ چاروں طرف خیال دوڑایا مگر شہباز خاں کے سوا کوئی ایسا سمجھ میں نہ آیا۔ جو اس راز میں شریک ہوتا۔ نہال نہال بشاش بشاش اچھلتا کودتا وہیں پہنچا۔ شہباز خاں ایک چلتا ہوا آدمی جھوٹوں کا بادشاہ بمکاروں کا پیر! اس نے پہلے ہی اصلی خط جو طلبی کا تھا تیر کر دیا۔ اور اس مضمون کا فرضی خط کہہ +

"میں آج کے چوتھے۔ وزیرا بلستان آتی ہوں" دراج کو پہنچوا دیا۔

خط کھولا پڑھا۔ خوشی کے مارے اچھلنے لگا۔ شاہین کے خط کا یقین ایک ایسی زبردست تسکین تھی۔ جس نے اس تمام رنج و الم کو فرحت و انبساط سے بدل دیا۔ جان میں جان آگئی۔ کبھی سر پر رکھتا کبھی آنکھوں سے لگاتا کھولتا بند کرتا۔ رکھتا اٹھاتا۔ خدا معلوم اس کاغذ کے پرزہ میں کیا جادو تھا کہ وہ افسردگی اور خموشی سب جاتی رہی۔ آمد کا انتظار۔ امید دیدار! اشتیاق ملاقات۔ چار دن چار رات کاٹنے قیامت تھے۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک سال زندگی۔ حیران جان وبال غرض خدا خدا کر کے تین

دن گزرے +

شہباز خاں وزیر اعظم شروع ہی سے تاک میں تھا۔ موقعہ کو غنیمت اور فرصت کو نعمت سمجھ کر ویسی ہی انگوٹھی اُس ہی رومال تیار کر کرا چپ چاپ ہو بیٹھا +

چوتھے روز صبح کے وقت دراج انگلی میں انگوٹھی ہاتھ میں رومال شہباز کے جال میں پھنسا بیٹھا تھا کہ ایک خادم نے آکر کہا پانی تیار ہے +

شہباز۔ مرزا صاحب اب آپ غسل فرما کر پوشاک تبدیل کیجئے انگشتری اور رومال میرے پاس رکھ جایئے +

شہباز عیار فیلسوف۔ دراج گیگلا مسکین بے وقوف زبردست کمزور کا مقابلہ کیا۔ شہباز اور دراج کی جوڑ کیسی۔ دو باتوں کا مہمان دو چمچوں کا محتاج۔ دراج بیچارے کی ہستی ہی کیا تھی۔ بڑے بڑے مدبر اور اچھے اچھے دُور اندیش شہباز کے آگے کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔ دراج تو کس گنتی میں تھا۔ آغا کا لال باڑھ پر چڑھ انگوٹھی اور رومال دونوں بدلوا بیٹھا +

دوپہر ہوئی شام ہوئی کیسی کاری کس کا گھوڑا کہاں کی ملکہ کدھر کی شاہین۔ سواری نہ شکار، وہ تو شہباز کا حاشیہ تھا جس کی دراج کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی وہ اس تحریر کو نوشتۂ تقدیر سمجھ رہا تھا۔ ساری رات محل کے نیچے اس اُمید پر گذار دی شہزادی اب آئے اب آئے +

عقل کا اندھا یہ نہ سمجھا زابلستان کی مالک اتنی بڑی سلطنت کی شہزادی لاکھ چھپ چپاتے آئے فوج نہیں ہمراہی۔ ہمراہی نہیں اردلی۔ اردلی نہیں نوکر۔ سو پچاس دس بیس کچھ تو ہونگے! صبح ہوئی تو جلا بھنا چیں بہ جبیں کھسیانی مورت۔ رونی صورت شہباز کے پاس پہنچا۔ تقدیر سے صلاح کار بھی ملا تو ایسا کہ اُس نے ایک ہی وار میں تسمہ بھی نہ لگا رکھا بہ ظاہر تو ہاں میں ہاں ملاتا رہا اور اندر خانے دراج کا اٹھ کر جانا تھا، دس آدمی ہمراہ انگوٹھی رومال قبضہ میں کر معمولی سامان ساتھ لے اصفہان جا دھمکا۔ شاہین کیسی ہی ہوشیار کتنی ہی سمجھ دار لاکھ دُور اندیش ہزار منتظم و سلیقہ شعار کچھ ہی تھی مگر تھی عورت اور اگر عورت نہ بھی ہوتی تو شیطان نہیں فرشتہ نہیں ولی نہیں خدا نہیں اس کو ان چرتروں کی کیا خبر کہ یہ بڈھا چنڈال بھُس میں چنگی ڈال جمالو دور کھڑی کی مثل کو اصل کر رہا ہے۔ سیدھے

سبھاؤ دراج کا حال پوچھنے بیٹھ گئی ۔

شہباز۔ شہزادی! وہ زابلستان کا مشہور بدچلن اوباش چھٹا ہوا بدمعاش آپ نے پیٹھ پھیری اُس نے ایک شکار جا پھانسا۔ جمعدار شیرانگن سے تو سرکار واقف ہیں۔ دن رات اُس کی سالی کے ہاں پڑا رہتا ہے۔ سُنتا ہوں نکاح بھی ہوگیا۔ اُس نکھرام نے جو جو کچھ مشہور کیا میری تو زبان بھی نہیں اُلٹ سکتی۔ سیر کی ہنڈیا میں سوا سیر پڑا اُبل گئی۔ آپ نے تو معاوضہ احسان کیا وہ سمجھا ملکہ کی نیت ہی کچھ اور ہے۔ بھلا وہ ذلیل شرافت سے کورا مزاج کا چھچھورا۔ آپ کی عنایتوں کے قابل تھا۔ اُس کمبخت کی وجہ سے تو تمام شہر میں ڈھنڈورا پٹ رہا ہے اور بستی بھر میں ناک کٹ رہی ہے۔ ایسا شخص تو صورت دیکھنے کے قابل نہیں انگوٹھی اور رومال آگے ڈال کر، یہ عطیہ شاہی اور جمعدار کی سالی جیسی واہی تباہی عورت! گستاخی معاف! آپ نے بھی کمال کیا۔ ایک معمولی آدمی کو یہ کچھ اعزاز بخشا! موری کی اینٹ چوبارے چڑھی! وہ تو جو کچھ نہ کرتا وہ تھوڑا وظیفہ تنخواہ سالانہ ماہانہ جو جی چاہتا مقرر فرماتیں یہ روز کی کراچھی لگائی باپ دادا کی عزت بڑوں کی لاج سب دراج کی نظر ہوگئی۔ بچہ سے لے کر بڈھے تک کیا مرد کیا عورت جدھر جاؤ یہی مذکور اور جہاں دیکھو یہی چرچا سُنتے سُنتے کان پک گئے اور دیکھتے دیکھتے کلیجہ پک گیا ۔

شہباز اپنا دام تزویر بچھائے کھڑا تقریر کر رہا تھا اور شاہین کی یہ کیفیت کہ ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جارہا تھا انگوٹھی رومال دیکھتے ہی آگ بگولا ہوگئی شہباز جھوٹا تھا خواہ سچا مگر دراج سامنے ہوتا تو وہ کچا کھا جاتی۔ منہ سے بات نہ نکلتی تھی ہوں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اصفہان کا ایک ایک لمحہ وبال ہوگیا کہتی تھی کہ کسی طرح پر لگ جائیں اُڑ کر پہنچوں اور اُس نابکار کا سر اُڑا کر کلیجہ ٹھنڈا کروں منتظر تھی اُس کے آنے کی۔ یہاں جو دیکھا تو معاملہ ہی اُلٹ پلٹ کہاں کی تعمیل اور کس کا آنا رنگ ہی دوسرا تھا تلووں سے جو لگی تو مغز تک پہنچی آؤ دیکھا نہ تاؤ سب جھگڑے چھوڑ چھاڑ وزیر کو ساتھ لے جھٹ پٹ زابلستان روانہ ہوگئی ۔

مرض متعدی۔ شہباز کی روانگی لاکھ پوشیدہ ہو مگر اتنا بڑا آدمی وزیر سلطنت! جانے کی دیر تھی تمام شہر میں مشہور ہوگئی۔ دراج کا ماتھا تو سُنتے ہی ٹھنکا تھا مگر سیدھا آدمی دل آئینہ۔ حسد نہ کینہ بات کا پورا قول کا سچا بہتیری ہی عقل لڑائی لیکن تہ کو نہ پہنچا، انتظار کی حد صبر کی انتہا ایک آدھ روز تو بہت ہی سخت مصیبت میں رہا دیواروں سے ٹکریں ماریں۔

پہاڑوں سے سر پھوڑے مگر خدا کی شان دیکھو کوڑہ میں کھاد مفلسی میں آٹا گیلا ابھی وہ مصیبت ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک اور آفت کا سامنا ہوا +

جمعہ کی صبح کو سیدھے ہاتھ میں سپید سپید ہلکے ہلکے دھبے دکھائی دیئے دھبے دیکھنے میں تو معمولی تھے۔ مگر جلن اور کھولن کس غضب کی کہ الامان الحفیظ شام تک تو سارا ہاتھ سوج کر کپا ہو گیا۔ رات کس مصیبت کی کٹی ہے کہ خدا دشمن کی بھی ایسی نہ کاٹے۔ صبح کو تو مرض کیحالت ہی کچھ اور تھی جسم بھر میں پھپھولے اور اس میں سوزش۔ ادھر فراق کی چھریاں ادھر مرض کے نشتر مجبور معذور علاج کا قصد کیا۔ سلطنت کا طبیب حاذق اسفندیار کچھ دیر تک تو غور سے دیکھتا رہا اور پھر تو اس طور سے بھاگا کہ سب متعجب ہو گئے دور جا کر کھڑا ہوا اور وہیں جا کر للکارا +

"بہتر ہو گا کہ آپ چلے جائیں یہ ایک ایسے متعدی مرض کی ابتدا ہے جس کا علاج خدا کے ہاں بھی نہیں مجھ کو اندیشہ ہے کہ آپ کی وجہ سے یہ بیماری تمام سلطنت میں نہ پھیل جائے جس کو آپ کی ہوا بھی لگے گی وہ اس آزار میں گرفتار ہو گا" دراج بدنصیب کے واسطے اس سے زیادہ مصیبت کا وقت اور کونسا ہوتا؟

طبیب کے الفاظ نے ساری ہی امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ آسمان کی طرف دیکھ کر خدا کا شکر کیا اور کہنے لگا +

"آہ! خالق الموجودات ایک بھی ارمان پورا نہ ہوا" +

مرض کی تکلیف لحہ بہ لحہ زیادہ ہو رہی تھی۔ مگر شاہین کا خیال دم بھر کو بھی پیچھا نہ چھوڑتا تھا! گو جسمانی تکالیف نے جان پر بنا دی تھی لیکن روحانی تکالیف سے چہرے کا رنگ متغیر ہوا جاتا تھا۔ کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر آپ ہی آپ کہنے لگا +

"اب گل اندام شاہین کے قریب جانا۔ ایسی محسنہ اور ایسی حسینہ کو جان بوجھ کر آزار لگانا تقاضائے محبت نہیں" +

آمنا سامنا۔ شام کا وقت قریب تھا۔ دراج حسرت نصیب پژمردہ اور نڈھال لوگوں سے بچا سڑک کے کنارے چلا جا رہا تھا کہ شاہین کی سواری نظر آئی کیسا دردانگیز سماں تھا وہی دراج جس کے دل میں ہزاروں ارمان بھرے تھے بصد حسرت و یاس شاہین کو دیکھنے لگا۔ دراج کی صورت دیکھتے ہی شاہین کی آنکھوں میں خون اتر آیا حکم دیا:-

"فوراً محل پر حاضر ہو"

حسرت بھرا دل یہ حکم سُنکر گم سم رہ گیا آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے کلیجہ کسمسانے لگا مگر سچی محبت نے تعمیل کی اجازت نہ دی ۔

شاہین آگ بگولہ محل پہنچی ۔ جوں جوں دراج کے آنے میں دیر ہو رہی تھی غصہ اور زیادہ بھڑک رہا تھا ! جو آدمی گیا وہ واپس جو پیغامبر بھیجا وہ ناکام ۔ بات دل میں بیٹھ ہی چکی تھی ۔ دیر اور پھر دیر پر انکار ۔ حق الیقین ہو گیا ۔ جلتی بھلستی سانپ کی طرح سر دھنتی باہر آئی اور شہباز کو طلبی کے واسطے روانہ کیا ۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اس سے بہتر موقعہ اور کونسا ملتا ۔ ادھر اُدھر پھر پھرا آن موجود ہوا اور کہنے لگا ۔

"وہ اُسی جمعدار کے ہاں بیٹھا بنکار رہا ہے ۔ مجھ سے بات بھی نہیں کی اندر ہی سے کہہ دیا ۔ ملنے کو جی چاہتا ہے تو شہزادی خود کیوں نہیں آجاتی" ۔

نمک حرام شہباز ایسا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا کہ آخر غریب دراج کی جان لے کر چھوڑی ۔ اب کیا کسر رہ گئی ۔ لال پیلی پہلے ہی ہو رہی تھی اتنا سنتے ہی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ۔ وزیر کو دیکھا اور حکم دیا ۔

"گرفتار کر دار علی المصلاح سر بازار سولی دو" ۔

قتل ۔ شہباز تو خدا سے چاہتا تھا ۔ آرزو تھی تو یہ ! اور ارمان تھا تو یہ ۔ حکم سنتے ہی جان میں جان آگئی ۔ کوتوال کو ساتھ لے چشم زدن میں گرفتار کر جیل خانہ بھیجدیا ۔ حکم شاہی سوئی نہ تھا کہ چھپ جاتا چھ گھڑی کی توپ چلنے تک تو بچہ بچہ کی زبان پر دراج کا چرچا تھا ۔ صبح ہوتے ہی ادھر شہباز خاں ایک طرف جنگی جوان دوسری طرف برق انداز دراج کو مقتل میں لے کر حاضر ہوا ۔ اُدھر شعبانہ دراج کی چھوٹی بچی ننگے سر ننگے پاؤں مقتل میں آئی ۔ حسرت بھری نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا کچھ دیر تک تو حیران پریشان چپ کھڑی رہی ۔ پھر فرط محبت سے بیقرار ہو کر چلا اُٹھی :-

"با با من نیز حاضر شوم"

بیٹی کی اس صدائے جگر خراش نے باپ پر ایک عجیب حالت طاری کر دی ! گردن میں طوق تھا بمشکل نظر بھر کر دیکھا ۔ دراج کی نگاہ کا پڑنا تھا کہ شعبانہ بے تابانہ آگے بڑھی ۔ باپ کے پاؤں سے جا لپٹی اور منہ اُٹھا کر اُس کے چہرے کو تکنے لگی ۔ زنجیر کا کانٹا جو ہاتھ

میں پڑا تھا اپنے ہاتھ سے ہٹا کر پوچھنے لگی ۔

"بابا! یہ مصیبت ؟ چوری !"

معصوم بچی کی بھولی بھالی باتوں نے مظلوم باپ کے کلیجے کے ٹکڑے اڑا دیئے ۔ مشکیں بندھی ہوئی تھیں نیچے بیٹھ گیا اور بچی کو چھاتی سے لگا لیا ۔ محبت نے جوش کیا آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے ۔ باپ کو روتا دیکھ کر شعبانہ چیخیں مارنے لگی ۔

باپ بیٹی کی آخری ملاقات کا منظر کچھ ایسا موثر تھا کہ شہباز جیسا سنگ دل آدمی بھی دم بخود رہ گیا ۔ طوق کے ساتھ ہی ساتھ ننھے ننھے ہاتھ باپ کی گردن میں پڑے تھے ! محبت بھری نگاہوں سے چہرے کو تک رہی تھی اور ننھا سا حسرت بھرا دل دھک دھک کر رہا تھا چار پانچ برس کی بچی کی بساط ہی کیا ۔ باپ چند لمحہ کا مہمان تھا اور وہ پانچ برس کی جان کچھ ایسی باتیں ملکا رہی تھی کہ سب گم سم تھے ۔ باپ کے منہ پر منہ رکھ دیا اور نہایت خوشامد سے کہنے لگی ۔

"بیا! خانہ برویم !"

بیٹی کی یہ درخواست ایک تیر تھا جو باپ کے کلیجے کے پار ہو گیا ۔ پیار کیا چمکارا سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا ۔

"شعبانہ ! پدر را خدا حافظ بگو !"

خاتمہ ۔ گرمی کا موسم صبح کا سہانا وقت ۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ۔ مقتل زابلستان سے ملا ہوا بلغاری قبرستان دنیائے ناپائیدار کی بلند صدائیں لگا رہا تھا ۔ سنگ مرمر کے سپید مزار حیات انسان کی بے ثباتی کا پیش خیمہ تھے ۔ کچی پکی قبروں کے بسانے والے جو اپنے گھر بار کو چھوڑ پیاروں سے منہ موڑ بے خبر سوتے تھے ۔ جسد خاکی کے استقبال کو صف بستہ کھڑے درلج بے گناہ کے عبرت ناک قتل کو چشم افسوس سے دیکھ رہے تھے ۔ ان مٹ جانے والی صورتوں میں بہت سے ایسے تھے جو عمر بھر اپنی غرض کے بندے رہے ۔ فاتحہ نہ درود ۔ جئے تو فضول ۔ مرے تو مردود ! تن پروری کو مقصد حیات سمجھ کر وقت پورا کر آئے اور خود غرضی کو سب سے بہتر اصول سمجھ کر زندگی ختم کر دی !!! جسد ناپائیدار کی جھوٹی سچی نشانیو ! آج کوئی اتنا نہیں کہ تمہارے مٹی کے ڈھیروں پر دو پھول چڑھا دے ۔ تمہارے ارادوں کے ساتھ تمہارے نام مٹ چکے اور تمہاری

جان کے ساتھ تمہارے کام پورے ہوئے! مگر ہاں۔ بدنامی کے چھپر تمہاری قبروں پر چھائے ہوئے ہیں۔ تمہارے مشیر و صلاح کار خود غرضی و دل آزاری ابھی زندہ ہیں اور بزم دنیا میں تمہارے اوپر ٹھٹھے لگا رہے ہیں +

ان ہی اینٹ پتھروں کے ساتھ بڑی بڑی سلوں کے نیچے ایسی صورتیں چھپی ہیں۔ جن کی خاک کا ایک ایک ذرہ گوہر آبدار کی طرح چمک رہا ہے کارخانہ قدرت کے پکے اصول ان کا سلسلۂ حیات منقطع کر چکے مگر ان کے مبارک نام چمنستان حیات میں شاداب پھولوں کی طرح لہلہا رہے ہیں۔ عالم امکان ان کی خوشبو سے معطر ہے۔ خلوص و صداقت کے ٹھنڈے اور میٹھے چشمے ان بار آور پودوں کو سینچ رہے ہیں +

اے منزل مقصود پر جانے والو۔ تم دنیائے ناپائیدار سے رخصت ہوتے تمہارا نام صفحۂ ہستی سے مٹ چکا تمہاری ہڈیاں خاک ہو چکیں۔ مگر پردیسی مسافرو تمہارا زمانہ تمام نعمت و برکت تھا تمہاری زندگی ایسے گلہائے رنگین سے آراستہ تھی جو قیامت تک نہ مرجھائیں گے۔ تمہارا نام چمنستان قدرت میں گل خوش رنگ ہو کر کھلا اور بساط زندگانی میں بقائے جاودانی کی خوشبو سے ممتاز ہوا۔ تمہارے ٹوٹے پھوٹے مزار اُن ذروں کی خواب گاہ ہیں جن کے آگے قمر چہار دہم ماند ہے +

آج بلغاری قبرستان میں بزم شہداء جمی ہوئی ہے۔ وضعداری کے ہار گلے میں پڑے ہیں۔ سچی محبت کے طرّے سروں پر ہیں۔ ایک کشتی زرنگار خون ناحق کے خوان پوش سے ڈھکی بیچ میں رکھی ہے۔ جس میں اخلاق و محبت کا سہرا چنا ہے بڑے بڑے وفادار اچھے اچھے وضعدار آغا کے لال دراج بدنصیب کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں!..!

سولی کا تمام سامان تیار ہو گیا۔ دراج بدنصیب بچی کو کلیجے سے لگائے بیٹھا تھا۔ شہباز کے حکم سے ایک شقی القلب محافظ نے شعبانہ کو باپ کی گود سے چھینا اور زبردستی پکڑ کر علیحدہ کرنے لگا! وہ نہایت ستم انگیز وقت اور دردناک سماں تھا! بچی باپ کو چمٹی ہوئی چیخ رہی تھی اور کہہ رہی تھی +

"بابا! بابا! کجا میروی؟"

لیکن وہ سنگ دل محافظ گھسیٹ کر الگ کر رہا تھا آخر کار زبردستی اور بہ زور ظلم جھٹکا دے کر الگ کھڑا کر دیا۔ بچی مجبور باپ معذور دونوں ایک دوسرے کو

دیکھ رہے تھے شعبانہ بلک رہی تھی اور محافظ سے بہ منت کہہ رہی تھی!

"آغا! چہ مے کنی"؟

ایسے عبرتناک موقعہ پر جہاں بچہ اور بڈھا سب کی آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ وراج نے شہباز کی طرف دیکھ کر کہا!

"وزیر اعظم! چھ بچوں میں یہ ایک بچی بچی تھی جو آپ کے ہاتھوں آج ہمیشہ کے واسطے جُدا ہوتی ہے"+

سواری شاہین کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا شعبانہ چیختی چلاتی رہی اور شہباز وراج کو سولی پر لے گیا +

شہزادی نے مقتل میں داخل ہوتے ہی وزیر کو حکم دیا +

"وراج سے پوچھو کوئی آخری درخواست ہے"+

وزیر نے آگے بڑھ کر وراج کو حکم سُنایا جس کے جواب میں اُس نے با آواز بلند کہا+

"ہاں ہے! اور وہ یہ کہ اس وقت بھی شہزادی کی صورت نہ دیکھوں"

اب کیا تھا۔ اُسی غیظ و غضب میں اجازت دی اور چشم زدن میں وراج کا خاتمہ ہوگیا+

وراج کا کام تمام ہونے کے بعد شاہین واپس جانے کو تھی کہ جلاد نے حاضر ہو کر ایک پرچہ دیا اور کہا +

"یہ مقتول کی وصیت ہے"

وہیں کھڑے کھڑے کھول کر پڑھنے لگی لکھا تھا کہ

آہ! ملکۂ گل اندام! وراج بدنصیب اب اس قابل نہ رہا کہ شہزادی کے پہلو میں جگہ پائے۔ دل کے ارمان دل ہی میں رہے اور تقدیر نے تمام خواہشوں کا خاتمہ کر دیا۔ شاہین! ہائے شاہین! مرض متعدی نے جیتے جی مردہ بنا دیا اور اس لائق نہ رکھا کہ تیرے حکم کی تعمیل کر سکوں +

خوبیوں بھری ملکہ! دل گوارا نہیں کرتا کہ وراج کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور شاہین کو آزار ہو میری بے گناہی کا یقین کر۔ بے تصور ہوں اور دل سے مجبور! خدا اُس وقت سے پہلے مجھ کو موت دے کہ میں سامنے آکر کھڑا ہوں اور میری ہوا تجھ تک پہنچے دل تڑپ رہا ہے جان نکل رہی ہے۔ کلیجہ پر چھریاں چل رہی ہیں۔ ارمان ہے کہ کسی طرح ایک دفعہ صورت

اور دیکھ لوں مگر نہیں۔ نہیں! شاہین گل اندام یہ تقاضائے محبت نہیں ہے +

الحمد اللہ دعوی محبت پورا ہوا اور دراج بدنصیب اپنی شہزادی پر قربان۔ ملکہ دنیا کی خوبیاں تیرے ساتھ ترقی اقبال روز افزوں! میرا غم نہ کیجیو۔ سچا فرمانبردار تھا جان نثاری کر دی +

شاہین! دنیا فانی ہے کوئی چیز قائم رہنے والی نہیں! میں مرچکا ہوں گا جسد خاکی گل ہو چکا ہوگا مگر چشم تامل سے دیکھنے والے پرکھ لیں گے کہ دراج بدنصیب محبت کی کسوٹی پر پارس کی طرح چمکا اور کندن کی طرح نکلا۔ تقدیر کی خوبی تھی کہ شمشباز نے دوستی کے پردے میں دشمنی کی ہمراز بنا جعل ساز نکلا۔ بہرحال میں خوش نصیب ہوں کہ ارمان پورا ہوگیا۔ اور آج دراج اپنی محبوبہ پر فدا ہوا +

دکھیاری ماں جس نے پال پوس کر اتنا بڑا کیا اور جس کی تقدیر میں جوان بیٹے کا داغ لکھا تھا مامتا کی ماری مقتل میں آئے گی۔ اگر قتل کے بعد غصہ فرو ہو جائے تو یہ بیکار جسم جو اُس کی تیس اکتیس برس کی امانت ہے اُس کو دے دیا جائے کہ زندہ دیکھ کر خوش ہوتی تھی مُردہ دیکھ کر تسکین ہو اور دراج بے گناہ کی لاش پیوند زمین ہو جائے۔ آہ ملکہ! آہ شاہین ہائے شہزادی اب کلیجہ اُمڈا چلا آتا ہے میری خطا معاف کہ میرے قصور سے درگذر۔ میری غلطی سے چشم پوشی، میری تابعداری کا یقین، میری وفاداری کا اعتبار۔ بس ملکہ فی امان اللہ! خدا تیرا نگہبان اور حافظ +

صرف اس نمک حلالی کے کارن دراج بدنصیب پر جو جو گذری تھی گزر گئی۔ وہی دراج جو کل ملکہ شاہین کے گلے کا ہار تھا آج اُس کے ہاتھوں ہمیشہ کے واسطے ختم ہوگیا۔ اس میں کلام نہیں کہ بات کے دھنی نے وہ کام کیا کہ سچی محبت مدت العمر اس کے نام پر آنسو بہائے گی اور گو شاہین نے شبانہ اور اُس کے خاندان کو زر و جواہر سے مالا مال کر دیا لیکن اتنا افسوس ضرور ہے کہ ملکہ کے دامن عصمت پر اُس بے گناہ کے خون کا دھبہ بہت بُرا لگا۔ دل کیا تھا اور ہاتھ پکڑا تھا تو لاج رکھتی۔ مگر عورت ذات دل کی بودی ارادے کی کچی۔ اچھی قدر دانی کی کہ جان ہی سے کھویا۔ دراج کی موت کیسی ہی عبرتناک کیوں نہ ہو مگر پھر بھی اس لحاظ سے ضرور بہتر تھی کہ وہ خاک میں مل کر تمام مصیبتوں سے چھوٹ گیا ہے بدنصیب کو کیا خبر تھی کہ یہ اتنی بڑی آدمی آخر وقت طوطے کی طرح دیدے بدل جائیگی کسوٹی

پر رکھا تھا تو پرکھ کر دیکھتی اور ایسی بدگمان نہ ہوتی کہ جان ہی سے کھو دیا۔ تاہم دراج کی محبوبہ تھی۔ اب بھی ہمارا دل نہیں چاہتا کہ شاہین کو بُرا کہیں شہزادی تھی تو ہو ناقص العقل تھی! اعتبار نہ کیا اور بغلی گھونسے کا وار چل جانے دیا۔ محبت کا فدائی شہزادی سے ملنے کا ارمان جی میں لے گیا۔ دعا ہے کہ خدا اُس کی حالت پر رحم کرے اور امید کے ساتھ یقین ہے۔ کہ منصف حقیقی اس کی آرزو پوری کریگا اور حوروں کے بدلے شاہین اُس کی مطلوبہ اُس کی ملکیت ہوگی!

بکرے کی ماں کب تک خیر منائے جب تک شاہین کی آنکھوں پر غفلت کا پردا پڑا رہا۔ شہباز جھپکوں پر جھپکے دیتا رہا۔ اور داؤں پر داؤں کرتا رہا مگر جلاد کا پرچہ لاکر دینا تھا "چور کی ڈاڑھی میں تنکا" شہباز کا خون خشک ہوگیا۔ لاش کو جاکر دیکھا انگوٹھی ہاتھ میں رومال جیب میں وزیر کو ساتھ لے کر دراج کے گھر آئی مرض کی مفصل کیفیت دریافت کی۔ طبیب کو بلوایا تو معلوم ہوا وہ بھی شہباز کی عیاری تھی چیچی پٹی روئی چلائی مگر اب پچتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ مکار وزیر کو گرفتار کیا اور اُسی مقتل میں سولی دیکر اُس کے ٹکڑے کوّے اور چیلوں کے حوالے کئے۔ آغا قندہاری اور شعبانہ دونوں دادی پوتیوں کو اشرفیوں سے تول دیا اور ایک ہزار روپیہ ماہوار کا وظیفہ دائمی تمام خاندان کے واسطے مقرر کر دیا۔ دراج کو غسل دیا اور برہنہ سر قبرستان لے چلی۔ شعبانہ آغا قندہاری دونوں ساتھ تھے اور ہزاروں آدمیوں کا ہجوم تھا اُس مجمع میں علی الاعلان دراج کی وفاداری اور نمک حلالی پر خون کے آنسو سے روئی اور مغرب کے قریب اس محبت کے بندے کو ہمیشہ کے واسطے زمین کے سپرد کر دیا

(شاہین و دراج)

ابن رشد کا فلسفہ اور یورپ

(مولوی محمد یونس صاحب انصاری)

دنیا کے تمام انقلابات میں حیرت انگیز انقلاب وہ ہے جو لوگوں کے خیال کے اندر واقع ہوتا ہے، قرون متوسط میں یورپ جہاں عالم جہالت کا دَور دَورہ تھا، عقیدہ اور خیال کے اسی قسم کے انقلاب سے اثر پذیر ہو رہا تھا +

قوموں کے عقیدہ اور خیال میں دو سبب سے انقلاب ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ زمانہ کی رفتار قوموں کے موروثی عقاید میں عظیم الشان تغیر پیدا کر دیتی ہے۔ دوسرے یہ کہ قوموں کے اندر سے خود بخود ایسے افراد اُٹھنے لگتے ہیں جو قوموں کے عقاید کی کایا پلٹ کر دیتے ہیں +

تیرھویں صدی میں یورپ میں بھی دو اسباب جمع ہو گئے تھے۔ اسپین اور اٹلی میں عربوں کی موجودگی اور صلیبی جنگوں کی بدولت یورپ کو علم و فن کی تحصیل کے جانب خود بخود متوجہ ہونا پڑا، اور جب ایک بار یہ شوق پیدا ہو گیا تو پھر خود یورپ کے قلب سے ایسے افراد اُٹھنے لگے۔ جنہوں نے یورپ میں علم و فن کی رُوح پھونکدی تیرھویں صدی کے پیشتر ہی سے یورپ میں عربی فلسفہ رواج پانے لگا تھا۔ تیرھویں صدی میں ابن سینا کی شہرت ہوئی اور چودھویں اور پندرھویں صدی میں ابن رشد کو عروج حاصل ہوا، اس دَور میں بکثرت ایسے افراد پیدا ہو گئے جو چرچ کے اقتدار و تسلط سے بیزار اور فکر و خیال کی آزادی کے متمنی تھے، چنانچہ اسکولاسٹک فلاسفی کے دَور اول ہی میں یہ بحث پیدا ہو گئی تھی کہ عقل و نقل میں سے کس کا رتبہ فروتر ہے، یعنے یہ تصادم کے موقعوں پر عقل و نقل میں سے کس کی بات حجت ہوگی +

عقلیت یوں تو انسان کے بیسیوں عقیدوں سے متصادم ہوتی ہے مگر اصولاً اس کو اپنے حریف کے مقابلہ میں دو باتوں پر زیادہ اصرار ہے، ایک قانون قدرت کے ماوراء باتوں کا انکار اور دوسرے نقل کے مقابلہ میں عقل کو حجت تسلیم کرنا +

جہالت کے عام استیلا کے باعث اُس وقت کا یورپ عقلی اور دماغی حیثیت سے اس قدر انحطاط پذیر تھا کہ دنیا کی تمام چیزیں اس کو عجوبہ زا اور حیرت افزا نظر آتی تھیں، دنیا کی تمام دوسری قوموں سے نابلد اور محض اپنے عقیدہ اور خیال کو حق سمجھنے والا یورپ اگر کسی بات پر عقلی دلیل قائم کرتا تھا تو اس کی بساط محض اتنی ہوتی تھی کہ کسی نادر الوقوع خرق عادت کو اپنے

دعوے کے ثبوت میں پیش کر دیتا تھا، دنیا کی ہر چیز میں اس کو خرق عادت کے جلوے نظر آتے تھے۔ عام طور پر یہ مسلّم تھا کہ شیطان تمام دنیا خصوصاً انسانوں پر مسلط کر دیا گیا ہے، بڑے بڑے اولیاء اللہ شیطان کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ کبھی شیطان جانوروں کے بھیس میں نمودار ہوتا تھا کبھی ایک کریہ المنظر سیاہ فام آدمی کی شکل میں اور کبھی کسی خوبصورت عورت کے جامہ میں۔ سحر اور شعبدہ بازی کے نئے نئے واقعات روزمرہ وقوع میں آتے تھے، دنیا کی ہر ایک چیز حیرت انگیز خیال کی جاتی تھی۔ اس لئے جو شخص کسی فن میں مہارت پیدا کر لیتا تھا فوراً وہ سحر و نسوں سازی کے الزام میں دھر لیا جاتا تھا +

تقریباً چھٹی صدی عیسوی سے بارھویں صدی عیسوی تک یہی حالت قائم رہی تیرھویں صدی سے انقلاب کے آثار نمودار ہونا شروع ہوئے۔ اب تک یورپ کی دماغی حالت جو تھی اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ خرق عادت اور سحر و فسوں سازی کے عقیدوں میں کسی کو شک نہ پیدا ہوتا تھا، مگر تیرھویں صدی سے عربی فلسفہ جب رواج پانے لگا تو کلیسائی مذہب اور اُس کے عقائد کی نسبت لوگوں کے دلوں میں شک پیدا ہونے لگے عقیدہ اور خیال کی دنیا میں تزلزل پڑ گیا اور ہر چہار سُو بے اطمینانی اور بیکلی کے آثار نظر آنے لگے، اس نئی تحریک کے علمبردار وہ لوگ تھے جو ابن رشد کی پیروی کا دم بھرتے تھے، راجر بیکن، ابیلارڈ اور فرانسیسکن فرقہ کے بڑے بڑے پادری اس فرقہ کے سرگروہ تھے[1] +

سحر کے عقیدوں کی بنا اس بات پر تھی کہ انسانی روح ایک مافوق الفطرت اور غیر محسوس شے شمار کی جاتی تھی، اس عقیدہ کا تعلق زیادہ تر روح کے مسئلہ سے تھا، دورِ جہالت میں رُوح اور وجود ابزدی کے عقیدے ہمیشہ دورِ عقلیت کے عقیدوں سے مختلف ہوتے ہیں، قرونِ وسطیٰ میں یورپ جہالت کے جس دور میں سے ہو کر گذر رہا تھا اس کا ممتاز خاصہ یہ تھا کہ دنیا کی تمام چیزوں میں انسان کی ایسی رُوح کا وجود تسلیم کیا جاتا تھا، ہر ایک غیر معمولی حادثہ کے متعلق یہ خیال ذہنوں میں راسخ تھا کہ یہ کسی غیر محسوس رُوح کا کرشمۂ عمل ہے۔ بادل کی گرج امساک باراں، اور زلزلے غرض دنیا کے تمام غیر معمولی حوادث و واقعات غیر معمولی ہستیوں کے غیظ و غضب اور ان کے مقابل خوشحالی اور فارغ البالی نزول برکت کی علامت شمار کئے جاتے تھے[2] +

---

[1] "تاریخ عقیدیت" یکی جلد اول صفحہ ۱۷ و ۱۸، [2] ایضاً صفحہ ۱۷،

خود نفس روح کی حقیقت کے متعلق عجیب عجیب عقیدے مروج تھے۔ یونانی فلاسفہ میں سے افلاطون کے نزدیک روح مادہ سے بالکل الگ بسیط اور ناقابل تجزی ایک شے تھی، اس کا حس قطعی ناممکن اور اس کا مشاہدہ بالکل محال تھا۔ مسیحیت جب رائج ہوئی تو چونکہ اس کی بنیاد ہی اس بات پر تھی کہ جسمانی علائق قطع کئے جائیں۔ اور ان کے مقابل روحانی قوتوں کو ترقی دی جائے اس لئے قدرتاً مسیحیت کی اشاعت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ روح کے متعلق افلاطون کا نظریہ اصل الاصول کے طور پر تسلیم کر لیا گیا، یہی وجہ تھی کہ مسیحیت کے اگلے دور میں مذہب عیسوی کے جتنے متکلمین پیدا ہوئے وہ روح کی حقیقت کے باب میں افلاطون کے نرے مقلد[1] تھے +

لیکن باوجود اس کے کہ روح کے متعلق غیر مرئی اور ناقابل تجزی ہونے کا خیال قائم تھا۔ بت پرستی کی اب بھی یہ شان باقی تھی کہ بدون تمثال کے اس کی حقیقت کا ادراک ناممکن خیال کیا جاتا تھا حقیقت یہ ہے کہ دور وحشت و جہالت میں انسان کا دماغ اس قابل ہی نہیں ہوتا کہ محسوسات کے ماورا کسی اور چیز کا ادراک کر سکے۔ اس بنا پر قرون متوسط میں روح کو غیر مرئی ماننے کے باوجود اس کے لئے ایسے اوصاف ثابت کئے جاتے تھے جو مادہ کے علاوہ کسی اور چیز میں نہیں پائے جا سکتے، چنانچہ اس مسئلہ کے متعلق کہ جسم سے جدا ہو جانے کے بعد قیامت تک روح کس حالت میں اور کہاں رہتی ہے۔ لوگوں کے عجیب عجیب خیالات تھے۔ ایک فریق یہ کہتا تھا کہ روح قبر کے گرد و پیش منڈلایا کرتی ہے، دوسرے گروہ کا یہ عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد روح سراسیمگی کی فضا میں ادھر ادھر بھٹکتی رہتی ہے، عام خیال یہ تھا کہ سینٹ پیٹر بہشت کا دربان ہے، وہ جس کو چاہتا ہے اندر داخل کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے نکال دیتا ہے، یہ عقیدہ جہلا کے علاوہ عقلاء میں بھی عام طور پر تسلیم شدہ تھا کہ مُردوں کی روحیں وقتاً فوقتاً زندوں سے آکر ملتی ہیں، یہ روحیں بعض منتروں کے ذریعہ سے زندوں کے اختیار میں آجاتی ہیں۔ وہ اُن سے اپنے مختلف کام نکالتے ہیں، اکثر زندوں کو اُن سے غیب کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اور کبھی کبھی یہ روحیں کسی مردہ کے جسم میں حلول کر جاتی ہیں۔ وہ مردہ زندہ ہو جاتا ہے۔ اس زمانہ میں بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جن کا یہ خیال تھا کہ ساری دنیا میں یہ مردہ روحیں ادھر اُدھر منتشر ہیں، ان میں سے بعضوں نے اس کو دیکھا بھی تھا، جن لوگوں نے ان روحوں کا مشاہدہ کیا تھا اُن کا یہ بیان تھا کہ اُن کا ڈیل ڈول

[1] "تاریخ عقلیت یورپ" جلد اول صفحہ ۱۲۲،

اور اُن کی شکل وجسامت انسان سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہ روحیں ایک لچکدار مادہ کی طرح ہر ایک شکل میں متشکل ہو سکتی ہیں +

روح کی حقیقت کے متعلق ان متضاد خیالات کے اشاعت پذیر ہو جانے کی وجہ سے مذہب عیسوی کے متکلمین میں دو فریق پیدا ہو گئے تھے۔ ایک گروہ کا یہ خیال تھا کہ انسان کے جسم میں ایک غیر مادی اور غیر مرئی روح حلول کئے ہوئے ہے۔ جو مرنے کے بعد جسم سے الگ ہو جاتی ہے، دوسرا فریق یہ کہتا تھا کہ انسان کے جسم میں کسی غیر مرئی شے کا وجود نہیں بلکہ جس چیز کو لوگ رُوح کہتے ہیں وہ بھی ایک مادی چیز ہے۔ ایک مدت تک یہ دونوں فریق باہم آویزش میں مشغول رہے، لیکن واقعہ ریفارمیشن کے پیشتر بارھویں صدی عیسوی سے روح کی حقیقت کے متعلق جدید تحقیقات شروع ہوئیں۔ واڈو دو مینیسو اور اموری کے فلسفہ نے اس حقیقت کی تشریح کی پہلے پہل ابتدا کی کہ روح نہ صرف یہ کہ مادی اوصاف سے بالکل بری ہے، بلکہ تمام کائنات ایک ایسی ہی عقل یا رُوح کل کے مظہر کا نام ہے جو ہمہ گیر اوصاف سے متصف ہونے کے علاوہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی[1]۔ یورپ میں اس عقیدہ کا بانی اصل میں ارسطو تھا۔ مگر قرون متوسط کے دور جہالت میں یورپ کے دماغ سے بالکل محو ہو چکا تھا۔ ابن رشد کا فلسفہ جب یورپ میں اشاعت پذیر ہوا تو وہ اپنے ساتھ بکثرت ایسے جراثیم بھی لایا جو یورپ کی جہالت و نادانی کے لئے حد درجہ مہلک تھے۔ یورپ میں اب تک یہ عقیدے مسلم چلے آتے تھے۔ کہ روح کم از کم مادی اوصاف سے بری نہیں ہے۔ روح مرنے کے بعد قبر کے گرد و پیش منڈلایا کرتی ہے، یا جہنم میں وہ محض جسمانی عذاب میں مبتلا ہو گی۔ ابن رشد کے فلسفہ کی بدولت نہ صرف یہ عقیدہ حل ہو گیا کہ روح مادہ سے بالکل ایک الگ جوہر ہے اور اُس پر جسمانی عتاب نہیں بلکہ روحانی عذاب ہو گا۔ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ساری کائنات صرف ایک عقل کل کے مظہر کا نام ہے، اور مرنے کے بعد انسان کی روح بھی اسی عقل کل میں جا کر فنا ہو جاتی ہے +

ابن رشد نے روح کی حقیقت کے مسئلہ میں اس بات پر زیادہ زور دیا تھا کہ رُوح محض ایک جوہر مجرد ہستی کا نام ہے، اور مدارج کے اعتبار سے روح یا عقل کی مختلف قسمیں ہیں، ان سب میں اشرف و اعلیٰ عقل فعال ہے جس سے تمام کائنات کی ہستی قائم ہے۔ اس

[1] تاریخ عقلیت صفحہ ۱۲۴،

کو ابن رشد کبھی عقل کل سے تعبیر کرتا ہے اور کبھی عقل موجود الخارج سے، اس کے نزدیک نہ وہ فساد پذیر ہے۔ اور نہ اس کی ابتدا و انتہا ہے۔ وہ مادہ سے بالکل منزہ ہے اور گویا نظام کائنات جوہر یا طاقت ہے۔ انسانی روح کے متعلق اس کا یہ خیال تھا کہ وہ عقل کل سے صادر ہوئی ہے، ایک اعتبار سے تو وہ فانی ہے اس لئے کہ جسم کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ باقی دائم اور ابدی ہے۔ کیونکہ عقل کل میں جاکر جذب ہو جاتی ہے، انسان کی زندگی کا اصلی مقصد یہ ہے کہ مرنے کے بعد عقل فعال سے کامل درجہ اس کا اتحاد ہو جائے، اس اتحاد میں جس قدر اکملیت ہوگی اسی قدر انسان لذت دائمی سے بہرہ اندوز ہو سکیگا اور جس قدر اس میں نقص ہوگا اسی قدر عذاب دائمی میں وہ مبتلا رہے گا +

ابن رشد کے یہ خیالات یورپ کی اس انحطاط پذیر عقلی حالت کے لحاظ سے کس قدر ملحدانہ تھے، ایک طرف یہ فلسفہ مادیت روح کا منکر تھا۔ دوسری طرف اس سے بقائے روح انفرادی کے انکار کی جھلک آتی تھی۔ غرض ابن رشد کے فلسفہ کے اشاعت پذیر ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ یورپ میں ماہیت روح کے متعلق مذکورہ بالا عامیانہ عقیدوں کے بجائے "روح کی حقیقت کا اعلیٰ تخیل پیدا ہوا، یہ خیالات کہ "روح پتھروں میں سوتی ہے۔ پھولوں میں خواب دیکھتی ہے، اور انسانوں میں جاگتی ہے" یا یہ کہ "وہ مستور ہستی جو ہمارے نظام جسمانی کے مختلف تغیرات کے باعث ہوتی ہے، روح الٰہی کی مظہر ہے جو تمام کائنات میں ساری و دائر ہے" مغربی دنیا کے لئے گو اس وقت بالکل اجنبی تھے۔ مگر یہ یقینی ہے کہ یورپ میں ان کی اشاعت کی ابتدا اسی وقت سے ہوئی جب سے ابن رشد کا فلسفہ اشاعت پذیر ہوا۔ چودھویں صدی عیسوی میں جرمنی میں اکھارٹ اور ٹیلور کی سرکردگی میں فلسفۂ روحانیت کی ایک تحریک پیدا ہوئی جس کی بنیاد ابن رشد کے انہیں خیالات پر تھی۔ چنانچہ اکھارٹ نے اتصال عقل فعال کے مسئلہ میں عقل انفعالی اور عقل فعلی کی اس تفریق تک کو تسلیم کر لیا جو ابن رشد کی خاص ایجاد تھی۔ اسی زمانہ میں جرمنی نے "عقل فعلی اور عقل انفعالی" کے عنوان سے ایک اور کتاب لکھی گئی۔ جس میں ابن رشد کے اقتباسات جا بجا نقل کئے گئے تھے[1]

اسی زمانہ کے قریب قریب انگلستان میں ایک شخص سیکینتھارپ پیدا ہوا، یہ پیرو ان ابن رشد کا بادشاہ مشہور تھا، انگلستان میں کارملائٹ فرقہ کا سنگ بنیاد اسی نے رکھا ہے۔

---

[1] تاریخ عقلیت میکی جلد اول صفحہ ۲۲۲

فرانسیسکن فرقہ کی طرح یہ فرقہ بھی ابن رشد کے فلسفہ کا دم بھرتا تھا، بیکنتھارپ وحدت عقل کے مسئلہ میں ابن رشد کے خلاف تھا۔ مگر باوجود اس کے اُس نے اس مسئلہ کے متعلق سینٹ ٹامس کی تردید کا جواب دیا ہے، اس ایک مسئلہ کے علاوہ قدامت عالم، نفوس فلکیہ، اور تاثیر افلاک وغیرہ مسائل میں وہ ابن رشد کا بڑا مقلد تھا، بیکنتھارپ اور جرمن فلاسفہ کے علاوہ چودھویں پندرھویں صدی میں ابن رشد کے جو مقلد پیدا ہوئے اُن کے اسما حسب ذیل ہیں، والٹر بارلے۔ اوگسٹ فرقہ (یعنے اوکم کے پیرو) بورڈین، مارسایل وغیرہم[1] +

یورپ میں ابن رشد کے فلسفہ کی جس تیزی سے اشاعت ہو رہی تھی، سحر و طلسمات پر سے عقیدہ مٹ گیا تھا، روح کی ماہیت کے متعلق عامیانہ عقاید کے بجائے فیلسفیانہ تخیل اشاعت پذیر ہو گیا تھا کہ سارے عالم میں صرف ایک عقل منفرد و فعال کا وجود ہے اور نوع انسانی کی روحانی و عقلی سعادت کی ذمہ دار بھی یہی روح ہے، عذاب و ثواب آخرت کے متعلق بت پرستانہ ڈھکوسلے جو اب تک مسلم چلے آتے تھے ان کے بجائے اب یہ خیال عام ہوتا جاتا تھا کہ ثواب آخرت کا ماحصل یہ ہے کہ عقل فعال سے انسان کا کامل اتصال ہو جائے +

یورپ میں ابن رشد کے فلسفہ پر تین دور گزرے ہیں، پہلے دور میں اس کی کتابوں کے محض ترجمے کئے جاتے تھے۔ ترجموں کی اشاعت کے بعد دوسرا دور اُس وقت شروع ہوا جب ابن رشد کے مقلد پیدا ہونے لگے، ابن رشد کے مقلدوں میں کئی طرح کے لوگ تھے، بعض اس کی کتابوں کی تلخیص و تفسیر کرتے تھے۔ اور اس بنا پر اُس کے پیرو مشہور ہو جاتے تھے، پیڈوا کے اکثر پروفیسروں کا یہی حال تھا۔ اور بعض واقعی اُس کے مقلد جامد ہوتے تھے، ان دو طبقوں میں اہل علم لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ فرانسیسکن انگلستان کے کارملائٹ، جرمنی کے مسکس، اسکوٹسٹ (ڈنس اسکوٹس کے پیرو) اور اوگسٹ (اوکم کے پیرو) فرقوں کا شمار اسی طبقہ میں ہے، فلسفۂ مدرسیہ کے یہ فرقے کیتھولک لوگوں کی نگاہ میں ملحد خیال کئے جاتے تھے، کیونکہ ان کی فلسفیانہ موشگافیاں اس زمانہ کی مسیحیت کی حد سے متجاوز ہوتی تھیں۔ چرچ اس بات کا دعویدار تھا کہ ہر ایک امر میں خواہ اس کا تعلق مذہب سے ہو یا نہ ہو، آخری فیصلہ کا حق اُسی کو حاصل ہے، دوسری جانب یہ فلسفیانہ فرقے چرچ کے

[1] "ابن رشد" رینان صفحہ ۱۸۱،

اہل اسلام اقتدار کے مٹانے کی فکر میں تھے، چرچ کو اس بات پر نازتھا کہ خدا کی جانب سے اس کو خرق عادت کی قوت عطا کی گئی ہے۔ لیکن دوسری جانب یہ آزاد خیال کہ لوگ چرچ کے معجزوں کا انکار کرتے تھے، ان فرقوں میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو اپنے کو فخریہ ملحد و بیدین کہتے تھے، غرض قرون متوسطہ میں مسیحیت کا مدار جس بات پر تھا، یعنے چرچ کا اقتدار و تسلط، تیرھویں صدی میں اس کی بنیادیں متزلزل ہو چلی تھیں، اس زمانہ میں آزاد خیالوں میں ایک نیا شوق یہ پیدا ہوا تھا کہ دنیا کے تینوں بڑے مذہبوں یعنی موسویت، مسیحیت اور اسلام کو جھوٹا ثابت کر دیں۔ لیکن چونکہ اہل یورپ کو ان مذاہب سے پوری واقفیت نہ تھی، اس لئے عجیب عجیب الزامات ان مذاہب پر قائم کئے جاتے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں یہ فقرہ اکثر ان لوگوں کے زبان زد رہتا تھا کہ تینوں مذاہب فریب و تعلیمات پر مشتمل ہیں، چودھویں صدی عیسوی میں "ابنائے حریت" کے نام سے آزاد خیالوں کا ایک نیا گروہ پیدا ہوا، یہ لوگ صاف صاف ابن رشد کی پیروی کا اقرار کرتے تھے، یہ عقیدہ اس فرقہ کے قانون اساسی میں داخل تھا کہ کائنات کا خروج عقل فعال سے ہوا ہے اور بالآخر اسی میں اس کا انضمام ہو جائیگا نفوس انسانی عقل فعال کے اجزاء ہیں، اور کائنات ہی بحیثیت مجموعی خدا ہے۔ یہ لوگ اس قدر راسخ الاعتقاد ہوتے تھے کہ ان کی نسبت یہ مشہور ہے کہ انکویزیشن کی آگ میں خوشی خوشی گر کر جان دیدیتے تھے اور زبان سے اُف نہ کرتے تھے عجیب بات یہ تھی کہ اس تحریک میں عورتیں بھی شریک تھیں ۔

(ابن رشد)

حروف کی بحث

(از جناب سر شیخ عبدالقادر صاحب)

کسی نے سچ کہا ہے کہ ہندوستان مشکل مسئلوں کا ملک ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی مشکلات رکھتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی قسمت اس بارے میں دنیا سے نرالی ہے۔ جتنی پیچیدگیاں یہاں کے معاملات میں لاینحل سوالوں سے پیدا ہوتی رہتی ہیں شاید ہی کہیں ہوتی ہونگی۔ زمانۂ حال میں جو مشکل سے مشکل سوال ہند میں پیش ہوئے ہیں ان میں یہ مسئلہ کہ ہندوستان عام طور پر کون سے حروف تحریر کے لئے کام میں لائے وقت میں کسی مسئلہ سے کم نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا مسئلہ اگر دنیا کے کسی اور حصہ میں درپیش ہوتا اور وہاں کے حالات وہی ہوتے جو اس ملک کے ہیں۔ تو وہاں بھی اس کا حل کرنا آسان نہ ہوتا لیکن جو دشواری اس کے حل ہونے میں یہاں واقع ہوئی ہے اور جس طرح یہاں مختلف اقوام ہند نے صاحبان ہند کے تدبیر و رائے کو حیران کیا ہے۔ یہ بھی کسی اور جگہ غالباً پیدا نہ ہوتی۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں رسم الخط کی بہت سی قسمیں مروّج ہیں اور ہر حصہ ملک کو وہ رسم الخط جس کے وہاں کے لوگ عادی ہیں عزیز ہے۔ لیکن کوئی غور کرنے والا انسان اس میں بھی شک نہیں لاسکتا کہ اگر اس بڑے ملک میں جو ایک براعظم کا حکم رکھتا ہے کوئی دن ایسا بھی آنے والا ہے جب ہر حصۂ ملک میں باہمی ارتباط میل جول اور یگانگت زیادہ ہو اور کاروبار اور تجارت کے رشتے مضبوط اور تعلقات وسیع ہوں تو یہ بھی لازمی ہے کہ ملک بھر میں کوئی ایک زبان مروّج ہو اور اُس کے لئے ایک رسم خط ہو۔ بلکہ جہاں تک تجارتی دنیا کا تعلق ہے رسم خط کا ایک ہونا بھی بہت مفید اور کارآمد ہے اور زبان میں کچھ اختلاف بھی ہوں تو بھی رسم الخط کے اتحاد سے بہت کچھ کام چل سکتا ہے پس ہر فہمیدہ باشندہ ہندوستان کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف اس دن کے لئے تیار ہو جب رسم خط کی یگانگت زبان کے اتحاد کا باعث ہوگی زبان کا اتحاد خیالات اور جذبات میں ہمرنگی پیدا کرے گا اور ہم خیالی تفرقات مذہبی و قومی و رواجی کا خاتمہ کر دے گی۔ بلکہ اس منتہائے خیال تک پہنچنے کے ذرائع تلاش کرے

اِن ذریعوں میں سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے کہ ہر شخص یہ طے کرے کہ کونسا خط بحیثیت عام ملکی رسم الخط کے اختیار کرنا چاہیئے یہ فیصلہ کرنے کے لئے دو باتیں ذہن نشین کر لینی ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ مختلف حروف مروجہ میں قدرتی طور پر جنگ لازمی ہے اور بالآخر قانون قدرت کے منشا کے مطابق جدوجہد کے بعد وہ خط باقی رہ جائے گا جس میں قبول عام کا مادہ زیادہ ہو جس کی سہولتیں بہ حیثیت مجموعی اوروں سے بڑھ کر ہوں اور جس میں قوت زیست اور قوت نمو بدرجۂ اعلےٰ موجود ہوں۔ جب یہ انجام ہوتا ہے۔ تو دانشمندی اس میں ہے کہ ہم خود اس وقت کے آنے سے پہلے ایک خط کے باقی رہنے اور ترقی کرنے اور دوسروں کے رفتہ رفتہ مٹتے جانے کے لئے آمادہ ہو جائیں اور جو خطوں خطوں اور حرفوں کی اس باہمی جنگ و جدال میں بیکار صرف ہونگی انہیں کسی عمدہ مصرف پر لگائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ خطوں میں سے کسی ایک رسم خط کو انتخاب کرتے وقت ہم اپنے ذاتی میلان یا مذہبی یا قومی جوش کو تھوڑی دیر کے لئے علیحدہ رکھ کر فقط اس امر پر غور کریں کہ ملک کی عام اغراض کے لئے کون سے رسم خط کا اختیار کرنا بہتر ہوگا اور یہ اندازہ کرنے کے واسطے اپنی نظر صرف ضروریات حال پر ہی نہ ڈالیں بلکہ زمانۂ مستقبل کو بھی ملحوظ رکھیں۔ ہمارے ہاں بارہا یہ بحث چلی ہے کہ رسم خط کون اختیار کیا جائے مگر کبھی اصولی طور پر نہیں۔ اول تو بہت **شافیہ** سوچا گیا ہے کہ سارے ملک میں ایک رسم خط ممکن بھی ہے کہ نہیں اور اگر ممکن ہے تو ترجیح کون سے خط کو دی جائے دوم عموماً مختلف صوبجات میں یہ بحث صوبوں کی حدود تک رہی ہے اور اس کو یہ خصوصیت حاصل رہی ہے کہ ایک جماعت یا فریق نے محض اپنی فوری ضرورتوں یا مذہبی اور قومی خیالات کو مدنظر رکھ کر یہ زور دیا ہے کہ وہ حرف جو اُن کے یہاں مستعمل ہیں سرکاری طور پر مروج ہو جائیں تاکہ اس جماعت کو قدرے سہولت ہو اور دوسری جماعتوں یا فریقوں نے اس تحریک کی پُرجوش مخالفت کی ہے۔ اس بحث مباحثہ اور جد و جہد کے بعد کہیں یہ تحریک غالب آئی ہے۔ کہیں مخالفت کہیں دونوں برابر رہی ہیں۔ صوبجات متحدہ میں اردو ہندی کی بحث اصل میں اردو حروف اور ناگری حروف کی تکرار تھی اور آخر سرکار سے اس کا فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں پہلو بہ پہلو عدالتوں میں رواج پائیں۔ اگرچہ رواج عام نے اب تک اس حکم کے سر پر قبول کا تاج نہیں رکھا مگر یہ

حکم اس تکرار کی یادگار باقی ہے۔ پنجاب میں اردو پنجابی کا جھگڑا علمی طور پر اردو حروف اور گورمکھی حروف کا جھگڑا ہے مگر ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آخر کار یہ مسئلہ کیا صورت اختیار کرے گا۔ تاحال اس قدر ہوا ہے کہ گورنمنٹ نے گورمکھی حروف کو کوئی غیر معمولی ترجیح دینے سے انکار کیا۔ لیکن یہ سب جھگڑے ایک طرح مقامی جھگڑے ہیں جن کا ایک صوبہ کی حدود سے باہر در اصل کچھ اثر نہیں۔ فرض کیجئے لڑنے جھگڑنے کے بعد ایک صوبہ میں کوئی فریق کامیاب ہو کر کسی خاص قسم کے حروف کو رواج دلا بھی دے تو اس سے سارے مسئلہ کی مجموعی صورت مشکل اور پیچیدہ ہو جائے گی اور اس کا حل ہونا بدستور دشوار رہے گا اصل طریق اس مسئلہ کے حل کرنے کا یہ ہے کہ تعصبات اور فریق بندی کے خیالات کو الگ کر کے رسم الخط پر ٹھنڈے دل سے بحث کی جائے اور پھر جن ملکوں کے لئے زیادہ نفع اور پائدار نفع نظر آئے اُسے پسند کیا جائے +

ہمارے خیال میں چار چیزیں ہیں جو رسم الخط کے خوبیوں کے پرکھنے کے لئے کسوٹی کا کام دے سکتی ہیں +

۱۔ کونسا خط ایسا ہے جو مختلف حصص ملک میں زیادہ مروج ہے اور جس کے سامنے دوسرے خطوں کا جو خاص حصوں یا خاص قوموں تک محدود ہیں دعوی برابر بے کار ہو گا +

۲۔ کونسا خط ایسا ہے جو اپنی ذاتی صفات کے لحاظ سے قابل پذیرائی ہے +

۳۔ کس خط کے اختیار کرنے میں باہمی خانہ جنگی کا خطرہ نسبتاً کم ہے +

۴۔ کس خط کا اختیار کرنا توسیع تجارت اور بیرونی دنیا سے تعلقات پیدا کرنے کے لئے زیادہ مفید ہے +

میں طرفداری سے نہیں کہتا بلکہ برسوں کے غور و فکر کا نتیجہ اپنے ابنائے وطن کی بہی خواہی کی نیت سے ظاہر کرتا ہوں کہ بحیثیت مجموعی فارسی حروف جن میں اردو زبان آجکل عموماً لکھی جاتی ہے۔ ہندوستان کے لئے بہترین حروف ہیں۔ اور اگر کسی سبب سے اہل ہند ان حرفوں کو رواج دینے پر متفق نہ ہو سکیں تو میرے خیال میں رسم خط کے اتحاد کی ضرورت اس درجہ ہے کہ میں زور سے ہندوؤں مسلمانوں سکھوں پارسیوں غرض سب باشندگان ہند کو یہ مشورہ دوں گا کہ وہ رومن حروف جن میں

انگریزی زبان لکھی جاتی ہے اختیار کرلیں۔ اس موقعہ پر یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر کوئی جماعت مذہبی یا قومی ضرورتوں کے خیال سے عام ملکی رسم خط کے علاوہ کوئی اپنا رسم خط قائم رکھنا چاہیے یا اُس کے بطور ایک خط ثانی کے رواج دے تو یہ اُس کی خوشی پر موقوف ہے اس میں اغراض ملکی کا کچھ نقصان نہیں اور کسی معقول پسند شخص کو اس سے تعرض نہیں ہونا چاہیئے۔ اب میں مندرجہ بالا رائے کی وجوہات لکھتا ہوں جو معیار اوپر قایم کئے گئے ہیں۔ ان ہر ایک میں فارسی رسم الخط پورا اترتا ہے۔ ہندوستان کا کوئی حصہ ایسا نہیں جس میں یہ کم و بیش موجود نہ ہو بحالیکہ دوسرے حروف اپنے اپنے علاقوں میں محدود ہیں۔ ذاتی صفات کے لحاظ سے فارسی رسم خط کی بابت اس موقعہ پر زیادہ لکھنا بے ضرورت ہے۔ یوں تو ہر رسم خط اپنی خوبیاں اور اپنے نقص لئے ہوئے ہے اور ہر ایک کے طرفدار اُس کی خوبیوں میں مبالغہ اور اُس کے نقائص میں کمی کر کے دکھلاتے ہیں۔ مگر انہی اوراق میں ایک نہایت مفصل و مدلل مضمون فارسی رسم خط کی ذاتی خوبیوں کے متعلق سال گذشتہ میں چھپ چکا ہے اُس کے دلائل کے اعادہ کرنے کی حاجت نہیں۔ اس میں فاضل مضمون نگار نے ثابت کیا تھا کہ علاوہ مختصر نویسی کی خوبی کے جو فارسی خط میں بدرجۂ اعلےٰ موجود ہے اس کی طرز تحریر انسان کے ہاتھ اور دست بازو کے پٹھوں کی ساخت کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ اور یہ طرز تحریر بمقابلہ اس طرز تحریر کے جو مغربی دنیا میں مروج ہے زیادہ قدرتی طریقہ لکھنے کا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض نقائص اس رسم خط میں ہیں جن سے ناگری رسم خط یا رومن رسم خط مبرا ہے۔ مگر اس کی سہولتیں نظر انصاف میں اس کی دقتوں سے زیادہ ہیں۔ اور اس لئے ذاتی صفات میں یہ بعض خطوں سے بہتر ہے۔ یا کم از کم کسی سے کمتر نہیں ہے۔ باہمی خانہ جنگی کا خطرہ اس کے اختیار کرنے میں اس لئے کم ہے کہ اول تو اُس کے اختیار کرنے میں کسی نئی چیز کو جو پہلے بہت کمزوری اور بے اثری کی حالت میں ہو دفعتہً بلند درجہ پر پہنچا دینا نہ ہوگا۔ بلکہ ایک مقبول چیز کو مقبول تر کرنا ہوگا۔ جس پر کسی کو جائز اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اس رسم خط کا ایک عام اثر اطراف ملک میں موجود ہے۔ صرف اُسے وسیع کر دینا ہے۔ برعکس اس کے اگر بنگال کا رسم خط مہاراشٹر میں یا مہاراشٹر کا رسم خط بنگال میں مدراس کے حروف شمالی ہندوستان میں رواج دینا چاہیں

توان کے مقبول ہونے کا ہرگز اتنا امکان نہیں جتنا فارسی حروف کا کیونکہ بنگال اور مہاراشٹر کے حروف کو جو اصل میں سنسکرت حروف کی شاخیں ہیں ایک دوسرے پر ترجیح دینا ترجیح بلا مرجح ہوگا اور ناپسند کیا جائے گا سنسکرت تحریر سے نکلے ہوئے حروف میں صرف ناگری حروف ہیں جو کسی حد تک ہندوستان میں فارسی حروف کے مقابلہ میں آسکتے ہیں لیکن اگر موجودہ رواج کی عمومیت پر فیصلہ ہو تو پھر انہیں بھی زیادہ موقعہ کامیابی نہ ہوگی - اور اس کے سوا ان میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ وہ ہندوستان کو دنیا کے دوسرے حصوں سے بالکل منقطع کر دیتے ہیں - حالانکہ فارسی اور رومن حروف نہ صرف ایک دو بلکہ بہت سے ممالک سے ہندوستان کا رشتہ جوڑتے ہیں - اسی لئے تجارت کو وسعت دینے اور بیرونی دنیا سے ربط پیدا کرنے کے لئے فارسی اور رومن حروف تمام دوسرے مروجہ خطوں سے یقیناً بہتر ہیں +

ابھی یہ بتانا باقی ہے کہ فارسی اور رومن حروف میں ہندوستان کے لئے فارسی حروف کو ترجیح کیوں ہے بظاہر تو اس زمانہ میں رومن حروف کو ترجیح ہونی چاہیئے ہندوستان انگریزی حکومت کے زیر سایہ ہے - انگریزی زبان یہاں کے دفاتر اور مدارس میں رواج پاگئی ہے اور پائی جاتی ہے - اور وہ رومن حروف میں لکھی جاتی ہے پس رومن حروف کا اختیار کرنا حاکم و محکوم کے باہمی تعلقات میں صفائی کا باعث ہوگا - اور دفعتاً ہمارا ایک تعلق یورپ اور امریکہ کے تمام اُن ممالک سے پیدا کر دیگا جن میں رومن حروف کا رواج ہے یعنی یورپ میں نہ صرف انگلستان بلکہ فرانس اور اٹلی وغیرہ ممالک سے ایک سلسلۂ کاروبار قائم کرنے میں آسانی ہوگی - یہاں کا ایک پڑھا لکھا آدمی بھی جو رومن حروف جانتا ہوگا ان ممالک میں سفر کرتے وقت بہت سی سہولتیں دیکھے گا - اور وہاں سے اگر کوئی کاروباری خط یہاں کے تاجر کے پاس آوے تو وہ محض حرف شناسی کی بدولت بغیر دوسری زبانیں جاننے کے بھی کچھ نہ کچھ اس کا پتہ لگا سکے گا - یہ سب درست ہے اور اسی اعتبار سے اس مضمون میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ اگر ہندوستان والے اپنے ایشیائی رسم خط پر متفق نہ ہو سکیں تو رومن خط کا اختیار کرنا بالآخران کے لئے ایک نعمت عظمیٰ ثابت ہوگا لیکن اول یہ کیوں ضروری ہے کہ فارسی رسم خط کے اختیار کرنے کی کوشش کی جائے - اس کے وجوہات مختصر طور

پر یہ ہیں +

۱- یہ خط جس رفتار سے ترقی کر سکتا ہے۔ رومن خط ملک میں اس رفتار سے نہ پھیل سکے گا اور اگر پھیلا بھی تو بہت زیادہ عرصہ اس کے پھیلنے کے لئے درکار ہوگا۔ اور اس وجہ سے ملک کی اغراض تعلیمی خاطر خواہ کامیاب نہ ہو سکیگی +

۲- رومن خط بہ وجہ بالکل اجنبی ہونے کے بہت سی آوازوں کے ادا کرنے سے قاصر ہے یا اگر ادا کرتا ہے تو ان میں شبہ و التباس پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے ہندی زبانوں کے لئے موزون نہیں برعکس اس کے فارسی خط اوّل ایشیائی الاصل ہے۔ دوم صدیوں سے ہندوستان میں بود و باش رکھنے کی بدولت ہندوستانی ہو گیا ہے اور یہاں کی سب زبانوں میں فارسی کے اتنے الفاظ شامل ہو گئے ہیں کہ ان کے اظہار کے لئے یہ خصوصیت سے موزون ہے +

۳- فارسی خط کے سکھانے کے ذرائع و بیات وغیرہ میں بھی اب تک میسر ہیں اور بغیر صرف کثیر کے حاصل ہیں۔ رومن خط کے پھیلانے کے لئے صرف کثیر درکار ہے +

۴- ہندوستان جب تجارت اور کاروبار میں ترقی شروع کرے گا اور اُس میں یہ سکت پیدا ہو گی کہ اپنی صنعت کے نمونے دنیا کی منڈیوں میں پہنچائے۔ تو اوّل اوّل اس قابل نہ ہوگا کہ یورپ کی منڈیوں میں یورپ کے مصنوعات سے مقابلہ کرے بلکہ قدرتی طور پر قریب قریب کے میدان اس کے لئے زیادہ مفید ہونگے اور ایران اور سواحل عرب و روم سے اُس کی تجارت بڑھیگی اور اس وقت فارسی حروف اس کے لئے بے حد کارآمد ہونگے فارسی حروف جاننے سے ہندوستان نہ صرف ممالک ایشیا مثل وسط ایشیا افغانستان ایران روم شام اور عرب سے ایک مستقل تعلق کی بنیاد رکھیگا۔ بلکہ اُس میں ہمت ہو گی تو تمام شمالی افریقہ اور یورپ میں ٹرکی تک اُس کی تجارت اپنے پانو پھیلا سکے گی اور ہندیوں کو بمقابلہ دیگر اقوام کے ان ممالک سے کاروبار کرنے میں آسانی ہو گی۔ دیکھئے دانایان فرنگ نے کس خوبی سے رسم الخط کے اہم مسئلہ کو حل کیا ہے کہ نہ صرف ایک ملک میں ایک رسم خط مروج ہے بلکہ کئی ملکوں میں ایک ہی خط کا رواج ہے اور ایک ہم ہیں کہ چاہتے ہیں

کہ ایک ملک میں ایک ہی جگہ دس خط رائج ہوں تاکہ ملک کے رہنے والے پڑھے ہونے کے باوجود اَن پڑھ رہیں اور باہر سے آنے والے کثرت خطوط سے پریشان ہو کر کسی ایک کے سیکھنے کا بھی قصد نہ کریں مجھے یورپ میں سفر کرتے ہوئے رومن حروف کے عام رواج کی بدولت زیل میں بیٹھے ہوئے معلوم ہو سکتا ہے کہ کونسا اسٹیشن آیا ہے لیکن جب میں وطن میں واپس آیا تو حروف مختلفہ کے رواج نے مجھے کئی دفعہ مشکل میں ڈالا۔ پنجاب میں جب سے گورمکھی کے تعلق جوش سکھ صاحبان نے دکھایا ہے۔ ایک یہ اصلاح ہوئی ہے کہ ریل اسٹیشنوں کی لالٹینوں پر بجائے انگریزی یا فارسی حروف میں نام لکھنے کے یوں لکھا گیا ہے کہ ایک پر فارسی حروف ہیں ایک دو پر انگریزی ہیں ایک دو پر گورمکھی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ کہ جب کبھی میری گاڑی گورمکھی حروف والی لالٹین کے سامنے آ کھڑی ہوئی کئی دفعہ رات کو مجھے بغیر دریافت کئے معلوم نہیں ہو سکا کہ ہم کہاں ہیں۔ اور اس طرح دیس میں پردیسی بنا پڑا۔ یورپ میں۔ اٹلی۔ سوئٹزرلینڈ۔ فرانس اور انگلستان میں یقیناً اور کئی اور ممالک میں بھی رومن حروف سے کام چل جاتا ہے۔ اور زبان نہ جاننے والا بھی بعض بول چال کی کتابوں اور فرہنگوں کی مدد سے سفر اپنا کام چلا لیتا ہے۔ جرمنی میں ایسے حروف مروج تھے جو رومن حروف سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن ذرا اُن سے پیچیدہ ہیں۔ اب وہاں بھی رومن حروف میں کتابیں چھپنی شروع ہو گئی ہیں۔ اور عجب نہیں کہ ایک زمانہ ایسا آ جائے کہ اہل جرمنی بھی رومن حروف عام طور پر اختیار کر لیں۔ وہاں تو ممالک غیر جن میں باہم رقابتیں اور جھگڑے ہیں تجارت کی ترقی اور ارتباط کے فوائد کو دیکھ کر ہموار ہو رہے ہیں اور یک رنگی کی طرف مائل ہوں اور یہاں یک رنگی کے منافع عیاں ہونے کے باوجود دو رنگی سہ رنگی کو ترجیح دی جائے۔ ہم اپنے ملک کے فہمیدہ اصحاب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس مبحث پر منصفانہ غور کر کے ایمانداری سے وہ رائے قائم کریں جس میں ان کے نزدیک ملک کی ترقی و بہبودی منصور ہو۔

صبحِ تمنا اور شامِ حسرت

حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد

اس امید آباد عالم میں ہر لمحہ اور ہر آن کتنی امیدیں ہیں جو پیدا ہوتی ہیں اور کتنے ولولے ہیں جو اُٹھتے ہیں؟ پھر ان میں کتنے ہیں جن کے نصیب میں فیروزمندی اور کامرانی ہے اور کتنے ہیں جن کے لئے حسرت و یاس کے سوا کچھ نہیں! بیکس انسان جو آرزوؤں کا بندہ اور حسرتوں کے خمیر کا پتلا ہے شاید صرف اس لئے بنایا گیا ہے کہ نصف عمر اُمیدوں کے پالنے میں صرف کر دے۔ اور بقیہ نصف نامرادی کے ماتم میں کاٹ دے (یحییٰ برمکی) نے صحرا میں ایک اعرابی کو دیکھا تھا کہ میدان سے پتھروں کے ٹکڑوں کو جمع کرتا ہے اور جب ایک ڈھیر ہو جاتا ہے تو پھر ایک ایک ٹکڑے کو اُٹھاتا ہے اور جہاں سے لایا تھا اُسی طرف پھینکنے لگتا ہے۔ کیا انسانی ہستی کی پوری تاریخ اس مثال میں پوشیدہ نہ تھی؟ ہماری زندگیاں جن کے ہنگامۂ حیات سے کارگاہ عالم میں شورش و کشمکش کے طوفان اٹھتے رہتے ہیں۔ غور کیجئے تو امید کے ایک تارِ عنکبوت، اور حسرت کے ایک جلتے ہوئے تنکے سے زیادہ کیا ہستی رکھتی ہیں؟ ساری عمر دو ہی کاموں میں بسر کر دیتے ہیں۔ یا صحرائے دجلہ کے اعرابی کی طرح صبح تمنا میں امیدوں کے سنگریزے جمع کرتے ہیں۔ یا پھر شام نامرادی میں جہاں سے لائے تھے، وہیں پھینک دیتے ہیں کہ ہمیشہ کے لئے مدفون ہو جائیں ؎

مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

کارساز قدرت کی بھی کیا کرشمہ سازیاں ہیں! کچھ خاک امید کی لی اور کچھ خاکستر حسرت کی دونوں کی آمیزش سے ایک پتلا بنایا، اور انسان نام رکھ کر اس ہنگامۂ دار ارضی میں بھیج دیا! کبھی امید کی روشنی سے شگفتہ ہوتا ہے، کبھی نا امیدی کی تاریکی سے گھبرا جاتا ہے۔ کبھی ولولوں کی بہار میں زمزمہ ساز نغمۂ انبساط ہوتا ہے اور کبھی حسرت و افسوس کی خزاں میں امیدوں کے پژمردہ پتوں کو گنتا ہے کبھی ہنستا ہے اور کبھی روتا ہے کبھی رقص نشاط ہے

بی اے کورس

اور کبھی سینۂ ماتم ایک ہاتھ سے جمع کرتا ہے اور دوسرے سے کھوتا ہے ؎

سراپا رہنِ عشق و ناگریزِ الفت ہستی ہے
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

پس اے ساکنانِ غفلت آبادِ ہستی! و اے رہروانِ سفرِ مدہوشی و فراموشی! مجھے بتلاؤ کہ تمہاری ہستی کی حقیقت اگر یہ نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے؟ اور اے نیرنگ آرائے تماشا گاہِ عالم! کیا یہ ہنگامۂ حیات، یہ شورشِ زندگی، یہ رستخیز کشاکشِ ہستی تو نے صرف اتنے ہی کے لئے بنائی ہے؟ ؎

کمند کوتہ و بازوئے سست و بام بلند
بمن حوالہ و نومیدیم گنہ گیرند

نہیں معلوم آغازِ عالم سے آج تک یہ سوال کتنے دلوں کے اضطراب و التہاب کا باعث ہوا ہوگا؟ مگر سچ یہ ہے کہ اپنے کان ہی بہرے ہیں ورنہ کائنات عالم کا ذرہ ذرہ اس سوال کا جواب نفی میں دے رہا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہ سچ ہے کہ مصائب و ناکامی کا ہجوم انسان کے دل میں ایسے خیالات پیدا کر دیتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس صنعت گاہ عالم کا یہ ساز و سامان صرف اتنے ہی کے لئے نہیں ہو سکتا۔ وہ عالم انسانیت کبریٰ جو تاج خلافت الٰہی سر پر اور خلعت کرامت (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ) اپنے دوشِ عظمت پر رکھتا ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ صرف امیدوں کے پالنے اور پھر ان کی موت و قضا کا تماشا دیکھنے کے لئے بنایا گیا ہو +

بہار و خزاں اور امید و بیم

اس میں تو شک نہیں کہ جس قدر کاوش سے غور کیجئے گا۔ جذبات انسانی کی تحلیل و تفرید کے آخری عناصر یہی دو چیزیں۔ امید و حسرت نظر آئیں گی۔ وہ جو کچھ کرتا ہے یا آئندہ کی امید ہے اور یا رفتہ پر حسرت، البتہ یہ ضرور ہے کہ امید و یاس کی تقسیم کو صرف

افراد واشخاص میں محدود نہ کیجئے بلکہ اس میں دراصل قوموں اور ملکوں کی تاریخ پوشیدہ ہے باغ وچمن میں بہار وخزاں دو موسم ہیں جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور اپنی اپنی آمد کے متضاد ومخالف آثار چھوڑ جاتے ہیں اسی طرح امید اور حسرت کو دو مختلف موسم تصور کیجئے جو قوموں اور ملکوں پر بھی آتے ہیں اور وہ نامرادی وکامرانی کی تقسیم ہے جو اپنے اپنے وقتوں پر قوموں میں ہو جاتی ہے بعض قومیں ہیں جن کے حصہ میں امید کی بہار آئی ہے اور بعض ہیں جو اب صرف یاس وحسرت کے خزاں ہی کے لئے رہ گئے ہیں۔ موسم بہار زندگی وشگفتگی کا موسم ہوتا ہے اور انسان کی رگوں کے اندر دوڑنے والے خون سے لیکر درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں تک ہر چیز میں جوش حیات اور ولولہ انبساط پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی حال ان قوموں کا ہوتا ہے جو اپنے دور امید سے گزرتی ہیں۔ تمام دنیا ان کے لئے ایک بہشت امید بن جاتی ہے اور اُس کی ہر آواز ان کے کانوں کے لئے ایک ترانۂ امید کا کام دیتی ہے۔ وہ اپنے اندر دیکھتے ہیں تو دل کا ہر گوشہ امیدوں اور ولولوں کا آشیانہ نظر آتا ہے اور باہر نظر ڈالتے ہیں تو دنیا کا کوئی حصہ عروس امید کی مسکراہٹ سے خالی نہیں ہوتا۔ اس طلسم زار ہست ونیست میں انسان سے باہر نہ غم کا وجود ہے اور نہ خوشی کا۔ زندگی کی تمام کامیابیاں اور مسرتیں دراصل دل کی عشرت کامیوں سے ہیں۔ جب تک آپ کے دل کے طاق مخفی میں امید کا چراغ روشن ہے اس وقت تک دنیا بھی عیش ومسرت کی روشنی سے خالی نہیں۔ لیکن مگر باد صرصر نامرادی کا کوئی جھونکا وہاں تک پہنچ گیا۔ تو پھر خواہ آفتاب نصف النہار پر درخشاں کیوں نہ ہو مگر یقین کیجئے کہ دنیا کا یہ تمام نظام منور آپ کے لئے ظلمت سرائے تاریک ہے +

یہ وہ خوش نصیب قومیں ہیں کہ ان کے دل کے اندر امید کا چراغ روشن ہوتا ہے اس لئے جہاں جاتے ہیں اقبال وکامرانی کی روشنی استقبال کرتی ہے چونکہ ان کے دل کے اندر سلطان امید فتحیاب ہوتے ہیں جس ہاتھ میں امید کا علم ہو پھر دنیا کی کوئی قوت اس کو زیر نہیں کر سکتی۔ ان کی امید حسرت وآرزو نہیں ہوتی جو محض ناکامی ونامرادی کے ماتم کے لئے ہے۔ بلکہ کامیابیوں کا ایک پیغام دعوت ہوتی ہے۔ جو دل میں امید بن کر اور دل کے باہر عیش ومراد کی کامرانی وفیروزمندی کی صورت بنکر

جلوہ آرا ہوتی ہے ۔

لیکن اسی سطح ارضی کے اوپر جو امید کی کام بخشیوں سے خوش نصیب قوموں کے لئے عیش مراد کا ایک چمن زار نشاط ہے وہ بدنصیب قومیں بھی بستی ہیں جن کے دامن حیات میں امید و یاس کی بخشش کے وقت امید کے پھولوں کی جگہ صرف نا امیدی کے کانٹے ہی آتے ہیں جو خزاں کے افسردہ و افسردہ کن موسم کی طرح دنیا میں صرف اس لئے زندہ رہتے ہیں کہ بہار گزشتہ پر ماتم کریں اور خزاں کے جھونکوں سے اپنے درخت امید کی پت جھڑ دیکھ دیکھ کر آنسو بہائیں، وہ دنیا جو اوروں کے لئے اپنی ہر صدا میں ایک پیغام امید رکھتی ہے، ان کے لئے یکسر ماتم کدہ یاس بن جاتی ہے دل جب مایوس ہو تو دنیا کی ہر چیز میں مایوسی ہے۔ اُن کے دلوں میں امید کا چراغ بجھ جاتا تو دل کے باہر بھی کہیں روشنی نظر نہیں آتی۔ دنیا کے وہ وسیع صحرا جن پر قدرت نے طرح طرح کی نباتاتی نعمتوں کا دسترخوان چن دیا ہے۔ وہ خوش نما اور عظیم الشان آبادیاں، جن کو انسانی اجتماع اور بدنی محنتوں نے زمین کے عیش و نشاط کا بہشت بنا دیا ہے وہ عظیم الشان اور بے کنار سمندر جن کی حکمرانی کی طاقت حاصل کرنے کے بعد پھر خشکی کے ٹکڑوں پر حکمرانی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ غرض کہ اس زمین اور زمین پر نظر آنے والی تمام چیزیں اُن سے اس طرح منہ پھیر لیتی ہیں گویا وہ اس زمین کے فرزند ہی نہیں ہیں۔ جبکہ بڑی بڑی آبادیاں قوموں اور جماعتوں کی فاتحانہ امنگوں کا جولانگاہ ہوتی ہیں۔ تو ان بدنصیبوں کے لئے صحراؤں کے بھٹ اور پہاڑوں کے غاروں میں بھی کوئی گوشۂ عافیت نہیں ہوتا۔ صحراؤں کی فضائیت، ہوا کی سنسناہٹ اور دریاؤں کی صدائے روانی، اوروں کے لئے پیام امید ہوتی ہے۔ مگر اُن کے کانوں میں ان سب سے نامرادی و فنا کی صدائیں اُٹھ اٹھ کر طعنہ زن ہوتی رہتی ہیں، دنیا میں اگر بہار و خزاں، امید و یاس، شادی و غم، نغمۂ و نوحہ، خندہ و گریہ، اور فنا و بقا دو ہی دو چیزیں ہیں جن کی زمین کے بسنے والوں میں بخشش ہوئی ہے۔ تو مختصر یوں سمجھ لیجئے کہ بہتی قوموں کو بہار و امید اور شادی و نشاط کا حصہ ملا ہے۔ اور دوسروں کو یکسر یاس و خزاں نوحہ و ماتم اور گریہ و فغاں کا ؎

ماخانہ عیدگان ظلمیم　　پیغام خوش از دیار ما نیست

لیکن یہ حالات و نتائج کا ایک دَور ہے جو نوبت بہ نوبت دنیا کی تمام قوموں بلکہ کائنات کی ہر شے پر طاری ہوتا ہے، قرآن کریم نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ — امید و یاس، شادی و غم، اور نفع و شکست کے یہ ایام ہیں جو نوبت بہ نوبت انسانوں پر گزرتے ہیں۔

دنیا میں کوئی شے نہیں، جس نے غم سے پہلے اپنی شادی کے دن بھی نہ دیکھے ہوں۔ اور باغ میں کونسا زندہ درخت ہے جس نے خزاں کے جھونکوں کے ساتھ کبھی نسیم بہار کی لذتیں بھی نہیں لوٹی ہیں؟ دنیا عالم اسباب ہے اور یہاں کا ایک ذرّہ بھی قوانین فطریہ و سلسلۂ علل و اسباب کی ماتحتی سے باہر نہیں۔ پس یہ انقلاب حالت بھی ایک قانون الٰہی اور ناموس فطری کے ماتحت ہے جس نے ہمیشہ اس عالم میں یکساں نتائج پیدا کئے ہیں اور اس میں تبدیلی ممکن نہیں۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا — اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں تم کبھی تبدیلی نہ دیکھو گے۔

باغ و چمن میں بہار و خزاں کا انقلاب ہو، دریاؤں میں مد و جزر کا تار چڑھاؤ ہو، سمندروں میں سکون و ہیجان کا تغیر ہو۔ افراد حیوانی کی حیات و ممات اور شباب و کہولت کا ایاب و ذہاب، افراد کی صحت و علالت، اور اقوام کا عروج و زوال، یہ تمام حالتیں فی الحقیقت انہی قوانین الٰہیہ در قوانین فطریہ کے ماتحت ہیں، جن کو فاطر السموات و الارض نے اس عالم کے نظام و قوام کے لئے روز اول ہی سے مقرر کر دیا ہے۔ پھر جن افراد و اقوام نے ان قوانین کے مطابق راہ امید اختیار کی ہے، ان کے لئے امید کی زندگی ہے اور جنہوں نے اس سے روگردانی کی ہے۔ اُن کے لئے نامرادی و ناکامی کی مایوسی ہے۔ قانون جرم کی سزا دیتا ہے، پر مجرم کو جرم کرنے کے لئے مجبور نہیں کرتا۔ پس شکایت کار سازش قدرت کی نہیں، بلکہ خود اپنی ہونی چاہیئے۔ خدا نے اُمید کا دروازہ کسی پر بند نہیں کیا ہے اور زمین کی راحت کسی ایک قوم کے ورثے میں نہیں دیدی ہے اُس نے پھول اور کانٹے دونوں پیدا کئے۔ اگر بدبخت کانٹوں پر چلتا ہے مگر پھولوں کو دامن میں جمع نہیں کرتا، تو اُسے اپنی محرومی پر رونا چاہیئے۔ باغبان کا کیا قصور؟

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنَّ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۔ (۸ : ۳۰)

خدا کے انصاف سے بعید تھا کہ وہ کسی پر ظلم کرے مگر انہوں بداعمالیاں کر کے خود آپ انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔

اِس نے دنیا کے آرام و راحت، اور عیش و کامرانی کو انسان کے ماتحت نہیں بلکہ انسانی اعمال کو محکوم بنایا ہے، اور جب تک کوئی قوم خود اپنے اعمال میں تبدیلی پیدا نہیں کر دیتی۔ اُس پر زمین کی راحتوں کا دروازہ بھی بند نہیں ہوتا +

آئندہ اس قانون عروج و زوال امم کی تشریح کرونگا جو قرآن کریم نے بتلایا ہے اور آپ کو نظر آئیگا کہ مسلمانوں کے موجودہ زوال کے اسباب کیا ہیں +

ماضی و حال

یہ انقلابات قدرتی ہیں۔ اور نہیں معلوم اس دنیا میں کتنے دور قوموں اور ملکوں پر اس کے گزر چکے ہیں؟ آج امید و کامیابی کے جس آفتاب سے غیروں کے ایوان اقبال روشن ہو رہے ہیں، کبھی ہمارے سروں پر بھی چمک چکا ہے، اور جس بہار کے موسم عیش و نشاط سے ہمارے حریف گذر رہے ہیں، ایک زمانہ تھا کہ ہمارے باغ و چمن ہی میں اُس کے جھونکے آیا کرتے تھے۔ اب کس سے کہئے کہ کہنے کا وقت ہی چلا گیا!

گذر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی

ہم ہمیشہ سے ایسے نہیں ہیں، جیسے کہ اب نظر آ رہے ہیں۔ زمانہ ہم سے ہمیشہ برگشتہ نہیں رہا۔ مدتوں امید کا ہم پر آشیانہ رہا ہے۔ بلکہ ہمارے سوا اس کا کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ اب دنیا میں ہمارے لئے ماتم و ناامیدی، دو ہی کام کرنے کے لئے باقی رہ گئے ہیں۔ لیکن زیادہ دن نہیں گزرے کہ ہماری زندگی کے لئے اسی دنیا میں اور بھی بہت سے کام تھے!+

ہجوم یاس و اختلال نظام امید

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارمان ہونگے

موجودہ جنگ بلقان یا جنگ اسلام و فرنگ کی اگر تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں شاید سب سے زیادہ مؤثر اور دردانگیز باب مسلمانان عالم کے اضطراب امید و بیم کا ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ میدان جنگ میں صرف مجاہدین ترک تھے، جن کی لاشیں دشمنوں کی گولیوں سے تڑپتی تھیں۔ لیکن دنیا میں کروڑوں قلوب بھی تھے جن کی لاشیں نہیں مگر پہلو میں دل تڑپتے رہتے تھے ٭

واقعات نے جلد جلد اپنے اوراق اُلٹے۔ امید کو عموماً شکست ہوئی اور توقعات میں بالعموم ناکامی جنگ کے التوا کے بعد صلح کے مُہلک اور خانماں سوز شرائط سُنکر وہ مضطرب تھے۔ مگر دار الخلافہ میں ایک جماعت آخری سعی و مجاہدہ کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور دربارہ اجرائے جنگ کے پھر ایک شعاع امید دکھلائی۔ حالات گو بدستور تھے، نئی وزارت آمدہ کے لئے باوجود بے سروسامانی کچھ نہ کچھ کر سکتی تھی۔ مگر جنگ کے گزشتہ ایام میں اُس کے پیشرو جو کچھ کر چکے تھے۔ اُن کی تلافی محال تھی۔ وہ محصور مقامات کو رسد نہیں پہنچا سکتی تھی۔ اور محصور قلعوں میں نئی فوج بھی نہیں بھیج سکتی تھی۔ بایں ہمہ مالی مشکلات کا انتظام کیا گیا۔ اور دو ماہ تک اس جنگ کو جاری رکھا جسکو ایک ہفتہ اور جاری رکھنے کی قوت بھی تسلیم نہیں کیجاتی تھی ٭

اس عرصہ میں امید تھی کہ حالات میں اور تغیرات ہونگے، اور ایڈریانوپل کے محاصرہ میں دشمن کے لئے مشکلات پیدا ہو جائینگی۔ اسباب و بواعث کی بحث کا یہ موقعہ نہیں ان کی تفصیل کسی دوسری جگہ پڑھیئے گا، مگر نتیجہ یہ نکلا کہ حالات کے عین مطابق مگر ہماری امیدوں اور آرزوؤں کے خلاف ایڈریانوپل بھی مفتوح ہوگیا اور بظاہر ہر شخص نے محسوس کیا کہ آخری رشتۂ اُمید جو باقی رہ گیا تھا۔ اُس نے بھی بے وفائی کی ٭

میں دیکھتا ہوں کہ ایڈریانوپل کے سقوط کی خبر نے ابنائے ملت کی ہمتوں کو پست کر دیا ہے، لوگ عموماً نا امید ہو گئے ہیں۔ اور اکثروں کے دل بیٹھ گئے ہیں۔ یاس و اضطراب کا لشکر جب آتا ہے تو اُس کا پہلا حملہ عقل و دماغ پر ہوتا ہے۔ لوگ حیران ہیں کہ اب کیا کریں؟ اور مایوس ہیں کہ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ مرحوم غالب نے اسی عالم کی تصویر کھینچی ہے ؎

فرصت زدست رفتہ و حسرت خشردہ پائے
کار از دو اگذشتہ و افسوس نہ کردہ کس

حسِ مصائب رحمت الٰہی ہے

مصیبت کا احساس غم و ماتم کی صورت میں جس قدر شدید ہو بہتر ہے کیونکہ زخم کی تکلیف جتنی سخت ہوتی ہے۔ اتنی ہی مرہم کے بنانے میں بھی جلدی کی جاتی ہے۔ اور قدرت الٰہی کی نیرنگیوں نے اکثر ایسا دکھلایا ہے کہ یاس و نا امیدی جب حد انتہا کو پہنچ گئی ہے تو اسی کی زمین میں امید کی از سر نو تخم ریزی ہوتی ہے +

پس موجودہ مصائب کا جس قدر درد انگیز ہو، اس کو فال نیک سمجھنا چاہئے۔ اور در اصل سچ پوچھئے تو ہماری زبانوں کے آہ و فغاں کو دیکھتے ہوئے جس درجہ درد و الم دلوں میں ہونا چاہئے تھا۔ افسوس ہے کہ نہیں ہے، ہم کتنے ہیں جنہوں نے چند لمحوں کے اضطراب و تشویش سے زیادہ اپنی زندگی اس غم میں تلخ کی ہے؟ اور پھر کتنے ہیں، جن کے حلق سے ایک وقت کا کھانا بھی کسی بے چینی کے بعد اترا ہے؟

عین سفر میں جب سقوط ادرنہ کی خبر آئی مجھے اس کے بعد متعدد مقامات میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اور میں نے مسلمانوں کے مختلف طبقات و درجات کی بہت سی آبادیاں دیکھیں میں نے دیکھا کہ جو گذرنا تھا گذر گیا۔ لیکن ہماری غفلت و مدہوشی کے اعمال، اور عیش جوئیوں اور راحت پسندیوں کے اشغال بدستور جاری ہیں یہ کہتے ہوئے خود اپنے تئیں ندامت اور تکلیف ہوتی ہے۔ مگر افسوس کہ کہنا پڑتا ہے +

تاہم یہ ضروری ہے کہ دلوں کی بے چینی میں شک نہیں، اور ایک ٹیس جو پہلے نہ تھی اب شاید لاکھوں پہلوؤں میں محسوس ہو رہی ہے۔ اگر ہزاروں ہیں جنہیں خواب غفلت سے مہلت نہیں، تو اُن کی تعداد بھی کم نہیں جو گو اب تک بستروں پر لیٹے ہیں مگر اضطراب کی کروٹیں بھی بدل رہے ہیں، اور یہ یقیناً کارفرمائے قدرت نے ایک سب سے بڑی توفیق بخشی ہے۔ اگر موسم کے بدلنے کا وقت آگیا ہے تو اتنے آثار بھی کم نہیں۔ ہم نے بڑے بڑے آتشکدوں اور تنوروں کو دیکھا ہے کہ اُن کے اندر سے آگ کے مہیب شعلے اُٹھ رہے تھے۔ حالانکہ چند گھنٹے پیشتر اُن کی تہ میں چند بجھی ہوئی چنگاریوں کے سوا اور

کچھ نہ تھا انہیں خاکستر کے تودوں میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو جب بات کے جھونکے میسر آگئے، تو چشم زدن میں دہکتے ہوئے انگاروں اور اچھلتے ہوئے شعلوں سے تنور بھر گیا پھر کیا عجب ہے کہ سوز و تپش کی جو چنگاریاں اس وقت دلوں میں چھپی ہوئی نظر آرہی ہیں، توفیق الٰہی کی باد شعلہ افروز انہی سے آتشکدہ حیات کو گرم کر دے جو افسوس ہے کہ روز بروز خاکستر سے بھرتا جاتا ہے!!

لیکن مایوسی پیغام موت ہے

لیکن ساتھ ہی افسوس ہے کہ موجودہ حس مصائب اور استیلائے غم واندوہ کا رُخ تنبیہ و اعتبار کی طرف نہیں ہے، بلکہ عموماً مایوسی اور نا امیدی کی صورت میں ہے جس طرف دیکھتا ہوں، سقوط ایڈریانوپل کے واقعہ پر یاس و قنوط کے جذبات کو احاطہ کئے ہوئے پاتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب کیا باقی رہ گیا ہے جس کے لئے اُمید کی جائے؟ اور بدقسمتی نے کیا چھوڑا ہے، جو ہمتوں میں مستعدی پیدا کرے؟ اب یا تو ماتم کی صفیں بچھائیے یا سیلاب بدبختی کی رَو پر اپنے تئیں چھوڑ دیجئے۔ کہ جب ڈوبنا ہے تو ہاتھ پاؤں ہلانے سے کیا فائدہ؟

پھر کیا آخری سوالات کا وقت آگیا؟

بہتر ہے کہ اس بارے میں میری زبان پر صاف صاف سوالات ہوں، پھر کیا وقت آگیا ہے کہ ہم ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جائیں؟ کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ امید و یاس کی تقسیم میں اب ہمارے لئے صرف یاس ہی رہ گئی ہے اور تکمیل فنا میں جس قدر وقت باقی رہ گیا ہے اس میں صرف رفتہ کا ماتم، اور آئندہ کی نا امیدی دو ہی کام کرنے کے لئے باقی رہ گئے ہیں؟ کیا یہ جو کچھ ہو رہا ہے، ہماری زندگی کی آخری ساعات اور موت کے اختصار کی آخری حرکت ہے؟ کیا چراغ میں تیل ختم ہو گیا اور بجھنے کا وقت قریب ہے؟ اور سب سے آخر یہ کیا اعداء اسلام اور اسلام کا آخری مقابلہ ہو چکا، اور (یسوع) کی مصلوب اور مردہ لاش نے خدائے حی و قیوم پر فتح پالی؟

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوالات مختلف شکلوں میں آج بہتوں کے سامنے ہوں گے لیکن

ہے کہ مایوسی کا غلبہ میرے اعتقاد کو مغلوب کر لے اور اس لئے ممکن ہے کہ میں تسلیم کر لوں کہ ہمارے مٹنے کا وقت آگیا ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلم قلب، جس میں ایک ذرہ برابر بھی نور اسلام باقی ہے، ایک منٹ ایک لمحہ، ایک دقیقے اور ایک عشر دقیقے کے لئے بھی اس کو مان سکتا ہے کہ اسلام کے مٹنے کا وقت آگیا ہے۔

انسانوں ہی نے ہمیشہ انسانوں کو مغلوب کیا ہے اور نئی قوموں نے ہمیشہ پرانی قوموں کی جگہ لی ہے۔ اس حریف کا اس عالم میں دیو نہیں بلکہ انسان ہی ہے۔ پس یہ کوئی عجیب بات نہیں اگر ہم کو ہمارے سیزدہ صد سالہ دشمن آج مغلوب کر کے فنا کر دیں، مگر اے خدا کی رحمت کی توہین کرنے والو! میں یہ کیونکر مان لوں کہ ایک مصلوب لاش حیّ و قیوم خدائے ذوالجلال کو مغلوب کر سکتی ہے؟ اور مایوسی خواہ کتنی ہو، مگر کیوں کر تسلیم کر لوں کہ انسانی گروہ خدائے قادر ذوالجلال کی جبروت و کبریائی کو شکست دے سکتے ہیں؟

حیران ہوں کہ آج مسلمان مایوس ہو رہے ہیں، حالانکہ میں تو کفر مایوسی کے تصور سے کانپ جاتا ہوں، کیونکہ یقین کرتا ہوں کہ مایوس ہونا اُس خدائے ذوالجلال والاکرام کی کی شان رحمت اور ربوبیت کے لئے سب سے بڑا انسانی کفر اور اُس کی جناب میں سب سے بڑی نسل آدم کی شوخ چشمی ہے تو تم جو ان بربادیوں اور شکستوں کے بعد مایوس ہو رہے ہو، تو بتلاؤ کہ تم نے خدائے اسلام کی قوت و رحمت کو کس پیمانے سے ناپا ہے؟ وہ کونسا کاہن ملیس ہے جس نے خدا کے خزانۂ رحمت کو دیکھ کر تمہیں بتلا دیا ہے کہ اب اس میں تمہارے لئے کچھ نہیں؟ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (۱۹: ۸۲) اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ (۴۲: ۵۲) پھر تم کو کیا ہوگیا ہے کہ تم مایوس ہو رہے ہو، اور کیوں تم نے خدا کی طرف سے منہ پھیر لیا ہے؟ تم کہتے ہو کہ اب ہمارے لئے مایوسی کے سوا کچھ نہیں، حالانکہ ایک مسلم دل کے لئے تو ناامیدی سے بڑھ کر کوئی کفر نہیں ہے۔

تَدْعُوْا لَهٗ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ۝ تَكَادُ — یہ تو تم نے ایسی بڑی سخت بات منہ سے نکالی ہے جس کی

لہ آیا ان کو علم غیب کی خبر ہوگئی ہے یا اس بارے میں انہوں نے خدا سے کوئی عہد کر لیا ہے؟ اور کیا ان کے پاس علم غیب ہے جو واقعہ ہو وہ اُسے بے کم و کاست لکھدیں۔

السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا !!

وہ سے عجب نہیں کہ آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزے ریزے ہو کر زمین کے برابر ہو جائیں۔

اُمید و بیم[1]

خدا کی رحمت سے کافروں کے سوا اور کون مایوس ہو سکتا ہے؟

انسان شاید یاس و امید کے بارے میں کچھ فطرۃً عجل ہے اس کی فطرۃ سادہ بچوں کی مثال سے واضح ہوتی ہے۔ بچوں کا قاعدہ ہے کہ ہر حالت کا اثر بغیر فکر و تدبر کے دفعتہً قبول کر لیتے ہیں، روتے ہوئے بچے کو مٹھائی کا ایک ٹکڑا پکڑا دیجئے تو ہنسنے لگتا ہے اور چھین لیجئے تو فوراً مچل جاتا ہے۔

بعینہٖ یہی حال عقل و فکر کے نشو و نما کے بعد بھی انسان کا ہوتا ہے۔ البتہ تاثر و نتائج کی صورت بدل جاتی ہے۔ قرآن کریم نے اسی فطرۃ انسانی کی عجلت پسندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جبکہ کہا ہے کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ۔ انسان کی خلقت میں جلد بازی اور تعجیل کار ہے۔

مصائب کے حس اور شادمانی کے غرور میں بھی دیکھئے تو اس کی یہی جلد بازی اور زود اثری ہر موقعہ پر کام کرتی ہے۔ وہ کس قدر جلد غمگین ہو جاتا ہے اور پھر ایک روتے ہوئے بچے کی طرح، جس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ٹکڑا دیدیا گیا ہو۔ کس قدر جلد خوش ہو جاتا ہے اس کی مایوسی اور امید واری، دونوں کا یہی حال ہے۔ جب کبھی وہ اپنی کسی توقع میں ناکامی دیکھتا ہے تو فوراً مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور پھر جب کبھی کوئی کامیابی کی خبر سن لیتا ہے تو امید و مسرت کے جذب سے عاجز ہو کر اُچھل پڑتا ہے۔ حالانکہ نہ تو اس کو

[1] قرآن کریم کی آیات کا ہم ہمیشہ ترجمہ دیتے ہیں، لیکن یہ واضح رہے کہ ترجمہ میں لفظی ترجمہ کی رعایت بالکل نہیں کی جاتی۔ بالعموم ترجمہ کا حصہ بھی اصل مضمون کی عبارت کا ایک مسلسل ٹکڑا ہوتا ہے۔ اور آیت کو بطور حاشئے کے داہنی جانب دیتے ہیں۔ اور اس آیت میں بھی "لقد جئتم" کا ترجمہ بالکل نہیں کیا ہے، صرف حاصل مقصد کو حسب محاورہ لکھدیا ہے۔

اُن اسباب کی خبر ہے، جو غم و نامرادی کے پیچھے ظاہر ہونے والے ہیں۔ اور نہ اُن کو عواقب نتائج کی خبر ہے۔ جو بشارت امید کے بعد پیش آنے والے ہیں۔ اس کی خدا پرستی بھی اس جلد بازانہ یاس و بیم سے شکست کھا جاتی ہے۔ اگر کوئی خوشی حاصل ہوتی ہے تو سمجھتا ہے کہ خدا میرے ساتھ ہے اور اگر نتائج حالات اور مشیت الٰہی کسی ابتلاء مصیبت میں ڈال دیتی ہے تو دیوانہ وار مایوس ہو جاتا ہے کہ خدا نے مجھ کو چھوڑ دیا۔ سورۂ والفجر میں اسی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور تمہارے اندر وہ کونسی شئے ہے۔ جس کی طرف قرآن نے اشارہ نہیں کیا ہے

انسان کا حال یہ ہے کہ جب اُس کا پروردگار اُس کے ایمان کو اس طرح آزماتا ہے کہ اُس کو دنیا میں عزت اور نعمت عطا فرماتا ہے تو وہ فوراً خوش ہو جاتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میرا پروردگار میرا اعزاز و اکرام کرتا ہے اور جب اُس کے ایمان کو کسی آزمایش میں ڈال کر اس طرح آزماتا ہے کہ اُس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے یعنی مصیبت میں ڈالدیتا ہے، تو پھر سخت مایوس ہو کر کہنے لگتا ہے کہ میرا پروردگار تو مجھے ذلیل کر رہا ہے اور میرا کچھ خیال نہیں کرتا +

(ترجمہ آیت قرآن کریم)

مہلک ترین ضلالت انسانی

حیات امید و موت قنوط

منجملہ اس حالت کے سب سے زیادہ خطرناک گمراہی انسان کی وہ مایوسی ہے، جو مصائب و آلام کا ہجوم دیکھ کر اپنے دل میں پیدا کر لیتا ہے۔ اور اس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنے مستقبل کے لئے نامرادی و ناکامی کی بنیاد رکھ دیتا ہے۔

مایوسی سے بڑھ کر کوئی شے انسانیت کے لئے قاتل و مہلک نہیں، اور دنیا کی تمام کامرانیاں صرف امید کے قیام پر موقوف ہیں۔ یہ امید ہی ہے جس نے زمینوں پر قبضہ کیا ہے، پہاڑوں کے اندر سے راستہ پیدا کیا ہے، سمندر کی تہاری کو مغلوب کیا ہے اور جب چاہا ہے اُس میں اپنی سواری کے مرکب چلائے ہیں اور جب چاہا ہے اس کو کناروں کو سیلوں اور فرسخوں تک خشک کر دیا ہے، پھر امید ہی ہے جس نے مردہ قلوب کو زندہ کیا ہے، بستر مرگ سے بیماروں کو اُٹھایا ہے۔ ڈوبتوں کو کناروں تک پہنچایا ہے۔ بچوں کو جوانوں کی تیزی سے دوڑایا ہے۔ اور بوڑھوں کو جوانوں سے زیادہ

ہ ۱۵ دے کو کرسی

قوی و طاقتور بنا دیا ہے۔

جبکہ قوتیں جواب دیدیتی ہیں، جبکہ زمانہ منہ پھیر لیتا ہے، جبکہ زمین کے کسی گوشہ سے صدائے ہمت نہیں آتی، اور جبکہ تمام اعضائے عمل جواب دیدیتے ہیں تو امید ہی کا فرشتہ ہوتا ہے، جو مسکراتا ہوا آتا ہے، اپنے پروں کو کھولتا ہے، اور اُس کے سایہ میں لے کر، قوت و طاقت، ہمت و مستعدی، چستی و چالاکی کی ایک رُوح تازہ دلوں میں پیدا کر دیتا ہے۔

دنیا میں کامیابی اعمال کا نتیجہ ہے اور اعمال کے لئے پہلی چیز امید ہے۔ جب تک انسان کے اندر امید قائم ہے مصیبتوں اور ہلاکتوں کے اگر عفریت بھی سامنے آ کھڑے ہوں، تو بھی اُس کو شکست نہیں دے سکتے +

اگر خون اور اُس کا دوران انسان کی جسمانی حیات کے لئے ضروری ہے تو یقین کیجئے کہ اخلاقی و ادبی حیات کے لئے امید اُس کے اندر بمنزلہ رُوح کے ہے۔ جب تک اُس کا دوران دل سے اُٹھ کر، یا باصطلاح حال دماغ سے نکل کر جسم کے تمام گوشوں میں حرارت پیدا کر رہا ہے۔ اُس کی قوت عمل زندہ اس کے اعضائے کار متحرک اور پائے مستعدی سرگرم تگاپو ہیں لیکن جہاں روح حیات دل سے نکلی، پھر جسم انسانی کے لئے قبر کے سوا کہیں ٹھکانا نہیں +

ایک شخص جب مایوس ہو گیا، جب اُس نے یقین کر لیا کہ اب اُس کے لئے دنیا میں کچھ نہیں، جب اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اب خدا اُسے کچھ نہ دیگا۔ تو ظاہر ہے کہ اُس کا دماغ کیوں سوچے؟ دل میں امنگ کیوں پیدا ہو؟ ہاتھ کیوں ہلے؟ اور پاؤں بڑھنے کے لئے متحرک کیوں ہوں +

قوموں کی زندگی کی ایک بہت بڑی علامت یہ ہے کہ اُن کا دل اُمید کا دائمی آشیانہ ہوتا ہے، اور خواہ ناکامی اور مصائب کا کتنا ہی ہجوم ہو مگر امید کا طائر مقدس ان کے دل کے گوشے سے نہیں اُڑتا۔ وہ دنیا کو ایک کارگاہ عمل سمجھتے ہیں اور امید کہتی ہے۔ کہ یہاں جو کچھ ہے، صرف تمہارے ہی لئے ہے۔ اگر آج تم اس پر قابض نہیں ہو تو غم نہیں، کیونکہ عمل و جہد کے بعد کل وہ تمہارے ہی لئے ہونیوالی ہے۔

مصیبتیں جس قدر آتی ہیں، وہ ان کو صبر و تحمل کی ڈھال پر روکتے ہیں اور غم واندوہ

سے اپنے دماغ کو معطل نہیں ہونے دیتے بلکہ مصیبتوں کو دُور کرنے اور اُن کی صفوں پر غالب آنے کی تدابیر پر غور کرتے ہیں۔ نامرادی اُن کے دلوں کو مجروح کرتی ہے پر مایوس نہیں کرتی، اور غم کے لشکر سے ہزیمت اٹھاتے ہیں پر بھاگتے نہیں ۔

دنیا ایک میدان کارزار ہے، اور جس چیز کو تم عمل کہتے ہو، در اصل یہ ایک حریفانہ کش مکش اور مقابلہ ہے۔ پس جس طرح جنگ میں رہنے والے سپاہیوں کو فتح و شکست سے چارہ نہیں۔ وہ کبھی زخمی کرتے ہیں اور کبھی خود زخمی ہوتے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں بھی جو مخلوق بستی ہے اُسے کامیابی اور ناکامی اور فیروزمندی و نامرادی سے چارہ نہیں کیا ضرور ہے کہ ہمیشہ ہماری تلوار اور دشمن کی گردن ہو؟ کیوں نہ ہم اپنے سر دسینے میں زخم کے نشان پائیں؟ بستر پر آرام کرنے والوں کو رونا چاہیئے کہ پاؤں میں کانٹا چبھ گیا لیکن سپاہی کو زخموں پر زخم کھا کر بھی اُف نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اُس کی جگہ تو بستر نہیں بلکہ میدان جنگ ہے ۔

شکست و زخم کا خوف ہے تو میدان جنگ میں قدم ہی نہ رکھو، اور تلوؤں کو بچانا چاہتے ہو تو تمہارے لئے بہتر جگہ پھولوں کی سیج ہے۔ چلو گے ٹھوکر کھاؤ گے، اور لڑو گے تو زخم سے چارہ نہیں۔ پس اگر ٹھوکر لگی ہے تو آنکھیں کھولو اور بیٹھ کر رونے کی جگہ تیزی سے چلو، کیونکہ جتنی دیر بیٹھ کر تم نے اپنا گھٹنا سہلایا۔ اتنی دیر قافلہ اور دُور نکل گیا ۔

پھر اگر دشمن کی کاٹ نے زخمی کیا ہے تو بھاگتے کیوں ہو؟ مایوسی خودکشی ہے اور امید زندگی۔ اور زیادہ چابک دستی سے پیکار جنگ کے لئے طیار ہو جاؤ کیونکہ جب تک دوسروں کو زخمی کرتے تھے، زیادہ ہمت مطلوب نہ تھی، لیکن زخم کھا کر تم نے معلوم کر لیا کہ دشمن توقع سے زیادہ قوی ہے اور اب پہلے سے زیادہ ہمت اور مستعدی مطلوب ہے ۔

میں نے کہا کہ قومی زندگی کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ اُس کا ہر فرد ایک پیکر امید ہوتا ہے اور اپنے دل کو امید کی جگہ سمجھتا ہے، نہ کہ مایوسی کی۔ لیکن اتنا ہی نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ زندہ قوموں کے لئے مایوسی کے اسباب ہی میں امید کا پیغام ہوتا ہے اور مصیبتیں جتنی بڑھتی ہیں اتنی ہی وہ اپنی امید کو اور زیادہ محبت اور پیار سے پالتے ہیں۔ مصیبتیں ان کو مایوس نہیں کرتیں، بلکہ غفلت سے ہشیار کر دیتی ہیں۔ اور عبرت و تنبیہ

کی صورت میں اُن کے سامنے آتی ہیں۔ وہ مصائب کے سیلاب کو دیکھ کر بھاگتے نہیں بلکہ اس راہ کو ڈھونڈھ کر بند کرنا چاہتے ہیں، یہاں سے اُس نے نکل کر بہنے کی راہ نکالی ہے۔

پس مصائب اُن کے لئے رحمت ہو جاتے ہیں، اور نامرادی اُن کے لئے کامیابی کا دروازہ کھول دیتی ہے، وہ جس قدر کھوتے ہیں اتنا ہی زیادہ پاتے ہیں، اور جس قدر گرتے ہیں اُتنا ہی زیادہ مستعدی سے اُٹھتے ہیں، وہی دنیا جو کل تک اُن کے لئے نامرادیوں کا دوزخ تھی یکایک کامیابیوں کا بہشت بن جاتی ہے، اور جس طرف دیکھتے ہیں تخت فتحیابی بچھے ہوئے۔ اور انہار کامرانی بہتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہی بہشت امید ہے جس کے رہنے والوں کی نسبت کہا گیا ہے کہ:۔

مُتَّكِـِٔيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ	کامیابی و فیروزمندی کے تخت پر تکئے لگائے بیٹھے
لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا	ہونگے، غم اندوہ کی سوزش و تپش کا انہیں حس
(۷۶ : ۲)	تک نہ ہوگا +

کیونکہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے، پس دنیا بھی اُن کو مایوس نہیں کرتی +

ہلاکت اُمید اور موت قنوط

لیکن اسی طرح قومی زندگی کے ایام ممات، اور انسانی ارتقائے حیات کا سدباب اس دن سے شروع ہوتا ہے، جس دن کاشانۂ دل سے اُمید کا جنازہ اٹھتا، اور مایوسی کا لشکر فنا امنڈتا ہے۔ جس فرد یا جس قوم کو مصیبتوں اور ناکامیابیوں کے عالم میں مایوس دیکھو، یقین کرو کہ اُس کا آخری دن آگیا۔ مصیبتیں تو اس کے لئے تھیں، تاکہ غفلت کو شکست اور ہمت کو تقویت ہو۔ لیکن جو لوگ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں دنیا کے اعمال و تدابیر کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں، اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اب ہمارے لئے دنیا میں کچھ نہیں رہا، وہ تو خود اپنے لئے زندگی کے بدلے موت کو پسند کرتے ہیں۔ پھر دنیا کی کامیابی، زندگی کو لڑ کر لینے والوں کے لئے ہے مٹ جانے کے متلاشیوں کے لئے نہیں ہے +

دیکھو! قرآن کریم نے کیسے جامع الفاظ میں ایسے لوگوں کی حالت، اور اُن کی مایوسی کے نتائج کی طرف اشارہ کیا ہے، اور اُس نے کس چیز کی طرف اشارہ نہیں کیا، مگر افسوس کہ بہت کم لوگ ہیں، جو اس کی صداؤں پر کان لگاتے ہیں!

اور انسانوں میں بعض ایسے ہیں جو خدا کی پرستش تو کرتے ہیں مگر اُنکے دلوں میں استقامت نہیں ہوتی اگر انکو کوئی فائدہ پہنچگیا تو مطمئن ہو گئے اور اگر کبھی مصیبت آپڑی تو جدھر سے آئے تھے۔ اُلٹے پاؤں اُدھر ہی کو لوٹ گئے (یعنی مایوس ہوکر ایمان سے ہاتھ اُٹھالیا) یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اپنی دنیا بھی کھوئی اور آخرت بھی اور یہی سب سے بڑا اور بالکل صریح نقصان ہے"

(ترجمہ آیت قرآن کریم)

فرمایا کہ "خسر الدنیا والآخرہ" کیونکہ مایوسی کے بعد انسان کی قوت عمل معطل ہو جاتی ہے پھر نہ وہ صرف دنیا ہی میں ناکام و نامراد رہتا ہے، بلکہ عاقبت کی خوشحالی سے بھی اسے "امیدی ہی رہتی ہے"۔

انسان کا فرض سعی و تدبیر ہے، اور وہ جب تک اس دنیا کی سطح پر باقی ہے۔ اس کو سعی و کوشش سے باز نہیں آنا چاہیئے۔ ہمارا کوئی عزیز بیمار ہوتا ہے، اور اُس کی حالت صحت کی طرف سے مایوس کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر بھی جواب دیدیتے ہیں، تاہم سعی و علاج سے آخری ساعات نزع تک باز نہیں آتے جب افراد کے ساتھ ہمارا یہ حال ہے، تو تعجب ہے کہ قوم و ملت کے ساتھ نہ ہو؟ کس کو معلوم ہے کہ کب دروازہ رحمت کھلنے والا ہے؟ اور کب بارش ہونے والی ہے؟ دہقان کا کام صرف یہ ہے کہ تخم پاشی کرتا رہے ؎

چوں دمبدم عنایت توفیق ممکن است
در تنگنائے نزع نہ کوشد کسے چرا؟

فتح و شکست کا اصلی میدان

دل کے اندر ہے، نہ کہ اس سے باہر

یہاں تک میں نے جو کچھ لکھا، یہ عام انسانی حالت کے اعتبار سے تھا لیکن اب پہنچنا چاہیئے کہ بہ حیثیت اسلام کے اس وقت ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

پھر میں نہیں سمجھتا کہ اگر موجودہ جنگ میں ہر طرف نتیجہ شکست ہی رہا، اور مسلمانوں

کو اپنے آخری دنوں میں ایک سب سے بڑی نقصان رساں شکست اٹھانی پڑی تو اس سے فرزندان اسلام مایوس کیوں ہو جائیں؟ اگر ایڈریانوپل چھ مہینے کی عدیم النظیر مدافعت اور آخر کے محیر العقول مقابلہ و مقاتلے کے بعد، بالآخر قدرتی اسباب و حالات کی بنا پر مفتوح ہو گیا، تو پھر چالیس کروڑ فرزندان اسلام کی حصن امیہ لشکر مایوسی سے کیوں مفتوح ہو جائے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے دشمنوں نے میدان جنگ میں ہمیں شکستیں دیں، لیکن ابھی وہ اس میدان کو تو شکست نہیں دے سکتے۔ جو ہر مسلم دل کو اسلام کے خدائے قادر قیوم سے ہونی چاہئے ۔

ایک لاکھ سے زیادہ سروی و بلغاری لشکر توپوں کے دہانے کھول کر اگر ایڈریانوپل کی مٹی کی دیواروں کو ڈھا دیتا ہے، تو یہ کونسا دنیا کا نیا اور عجیب واقعہ ہے؟

اُس قوم کے لئے کونسی شرم کی بات ہے جس نے سترہ ہزار فوج کے ساتھ ایک بے پناہ اور مٹی کی دیواروں سے بنے ہوئے مقام میں چھ مہینے تک مدافعت کی ہو؟ اس پر ہمیں ماتم نشین ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہیں مان سکتے۔ کہ بلغاری سرویوں نے ہماری جرأت و شہامت کو شکست دیدی لیکن اے اُس خاندان اسلام کے ماتم گسارو! جس کے چالیس کروڑ فرزند اس وقت سطح ارضی پر چلتے پھرتے ہیں! اگر یہ سچ ہے کہ تمہارے دل بھی مایوس ہو گئے ہیں، اور تمہارے دل کے اندر خدائے ابراہیمؑ و محمدؐ (علیہما الصلوٰۃ والسلام) نے جو چراغ امید روشن کیا تھا وہ بھی بجھ گیا ہے۔ تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعی سروی اور بلغاری مجاہدین نے تم کو شکست دیدی، اور تیرہ سو برس کے اندر دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں اور انسانوں کے بڑے بڑے لشکر جس دشمن کو گرا نہ سکتے، آج واقعی بلقان کی چند ریاستوں کے اجتماع نے اُسے گرا دیا!

ہاں اگر یہ سچ ہے تو بے شک تمہاری اس لافنا زندگی کو، جسے قیصر روم اور کسریٰ فارس موت سے بدل نہ سکا تھا، اس نے مجروح کر دیا ہے، تمہارے ان آہنی جسموں کو، جنہیں یرموک کے میدان میں متمدن رومیوں کے لاکھوں تیروں کے نشانے زخمی نہ کر سکے تھے، یقیناً اُس نے خاک و خون میں تڑپا دیا ہے۔ اور تمہارے ان نشانہائے توحید و علم ہائے دین الٰہی کو، جسے آٹھ صلیبی حملوں کے لاکھوں نیزے بھی نہیں گرا سکے تھے، مگر سچ یہ ہے کہ سرویا کے سور چرانے والوں نے آج پارہ پارہ کر کے گرا

دیا ہے، پھر اس میں شک نہیں کہ تم مر گئے، تم جو کبھی نہیں مر سکتے تھے، یقیناً مر گئے تم، کہ تمہاری رگوں کے اندر خدا کی رُوح جلال جاری و ساری تھی، اور اُس کی نصرت و حمایت کے ملائکہ مسوّمین تمہارے آگے دَوڑتے تھے"۔ یقیناً آج مر گئے۔ پس جس قدر تم کو ماتم کرنا ہے کر لو، اور جس قدر جلد اپنی قبر کھود سکتے ہو کھود لو، کیونکہ خدا کی رحمت اور دنیا کی زندگی صرف امید رکھنے والوں کے لئے ہے۔ اور مایوسی کا نتیجہ موت کے سوا اور کچھ نہیں۔ خدا تم کو نہیں چھوڑتا پر تم اُسے چھوڑ رہے ہو۔ وہ تمہاری طرف دیکھتا لیکن تم نے نا امید ہو کر اُس کی طرف سے منہ موڑ لیا! تم کو معلوم نہیں کہ یہی مایوسی ہے جس کو تمہارے خدا نے کفر کی خودکشی سے تعبیر کیا ہے۔

جو شخص مایوس ہو کہ اللہ کی نسبت ایسا ظن بد رکھتا ہو کہ اب دنیا و آخرت میں خدا اُس کی مدد کرے گا ہی نہیں، تو پھر اُس کو چاہئے کہ اوپر کی طرف سے ایک رسی تانے، اور اُس کا پھندا بنا کر اپنے گلے میں پھانسی لگا لے۔ اور اس طرح زمین سے دھواں اب وہ اپنے لئے صرف مایوسی سمجھتا ہے، اپنا تعلق قطع کر لے، پھر دیکھے کہ آیا اس تدبیر سے اُس کی وہ شکایت جس کی وجہ سے مایوس ہو رہا تھا۔ دُور ہو گئی ہے، اسی طرح ہم نے قرآن کریم میں ہدایت و فلاح کی روشن دلیلیں اتاری ہیں، تاکہ تم اُس پر غور کرو اور اللہ جسکو چاہتا ہے اُس کے ذریعہ سے ہدایت بخشتا ہے (ترجمہ آیت قرآن کریم)

ہنوز آن ابر رحمت درفشانست

سب سے پہلے تو ہم مایوسی کے اس حصہ ہی کو نہیں تسلیم کر سکتے کہ دولت عثمانیہ اور ترکوں کی طرف سے بالکل مایوس ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ اس جنگ نے انہیں اب بالکل عضو معطل کر دیا ہے۔ جو کچھ ہو چکا ہے، ابھی اس کے بعد سنبھلنے کے لئے کئی میدان باقی ہیں اور اگر عبرت اور تنبیہ کی یہ سب سزائیں بے اثر نہ رہیں اور بقیہ قوائے عاملہ کو ابھرنے اور کام کرنے کی توفیق مل جائے تو اب بھی یہ قوم جس کی شمشیر آٹھ سو برس سے علم اسلامی کے لئے مدافعت کر رہی ہے، بچ سکتی ہے، اور حالات فوراً متغیر ہو جا سکتے ہیں۔

دنیا میں ہمیشہ واقعات کا مطالعہ کرنے کے لئے دو طرح کی نظریں ہی ہیں، ایک

امید کی اور دوسری مایوسی کی حکمائے یونان کی نسبت سُنا ہوگا کہ آثار و نتائج عالم پر بحث کرتے ہوئے ان میں دو مختلف مذاہب امید اور مایوسی کے تھے۔ پھر جس طرح کی نظر سے تم دنیا کو دیکھو گے، وہ اسی رنگ میں نظر آئے گی۔ مایوسی کی نظر سے دیکھو تو اُس کے دلائل بے شمار ہیں، اور امید کا مذہب اختیار کرو۔ تو اُس کے پہلو مایوسی سے کم نہیں۔ اسلام ہم کو ہمیشہ امید کی تلقین کرتا ہے، پس کیوں نہ ہم امید کے پہلوؤں ہی پر نظر ڈالیں؟

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو جیسا کہ کسی وقت تفصیل سے لکھوں گا، بایں ہمہ حالات، ترکوں کی طرف سے مایوس ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں پاتا۔

اور اگر پھر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اب ترکوں کی قوت کا بالکل خاتمہ ہو گیا تو مجھ کو خدا کے لئے جواب دو کہ کیا تمہارے خدا کی قوت کا بھی خاتمہ ہو گیا؟ مان لو کہ ترکوں کی تلوار زنگ آلود ہو گئی تھی اور اب ٹوٹ کر ان کے ہاتھوں سے گر گئی ہے، لیکن کس کو معلوم ہے کہ ابھی خدا کے لازوال خزانۂ قدرت میں اور کتنی غیر مستعمل تلواریں پڑی ہیں، جن کو وہ اپنے دین مبین اور کلمہ محبوب کی ہدایت کے لئے چمکا سکتا ہے؟ اسلام ایک قوت الٰہیہ ہے جس کی زندگی انسانوں اور قوموں سے وابستہ نہیں ہے، بلکہ قوموں کی زندگی اس کی متابعت اور معیت سے وابستہ ہے۔ پھر قومیں مٹ سکتی ہیں اور انسانوں کے فانی جسم مٹ سکتے ہیں۔ پر وہ نہیں مٹ سکتا وہ اپنے خدائے لازوال کی غیر فانی قوت کے ساتھ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کیونکہ وہ صداقت ہے۔ اور صداقت کب نہ تھی اور کب نہیں رہیگی؟

اسلام کا ظہور ترکوں کے ظہور کے ساتھ نہیں ہوا ہے، بلکہ ترکوں نے اُس کے دم سے اپنی ہستی کو برقرار رکھا ہے۔ کیا تیرہ سو برس پہلے جب غار (حرا) کے غاروں سے حق کی روشنی چمکی، تو اُس وقت ترکوں کا ہاتھ اس کا محافظ تھا؟ کیا (بدر) اور حنین کے میدانوں میں ترک تھے۔ جن میں سے تین سو فاقہ مستوں نے تین ہزار جوانان عرب کو خاک و خون میں ملا دیا تھا؟ کیا (یرموک) اور (قادسیہ) کے معرکہائے خونین میں وہ ترک ہی تھے، جنھوں نے رومیوں اور ایرانیوں کی ہزاروں لاکھوں سے صحرائے شام و مدائن کو بھر دیا تھا؟ وہ قوم جس نے تخت کسریٰ کی ہزار ہا سالہ عظمت کا خاتمہ کر دیا تھا، ترکوں کی تو نہ تھی۔ وہ جس نے سپہ سالار روم کے سامنے اپنے

نیزے کو رشمیں قالین کے اندر سے زمین میں چبھو دیا تھا، یقیناً کوئی ترک تو نہ تھا +
پھر (دمشق) اور (بغداد) کے تخت پر کون تھا؟ اور کن کے گھوڑے تھے،
جنہوں نے (بحرالکاہل) کے مہلک طوفان سے گذر کر جبل الطارق پر علم توحید بلند کر
دیا تھا؟ ترکوں کو تخت خلافت اسلامی پر قدم رکھے کتنے دن گزرے ہیں؟ خدا کے لئے
ان سوالوں کا جواب دو! ترکوں سے پہلے جس قوت نے ہمیشہ علم توحید کی حفاظت کی
ہے کیا وہ آج ترکوں کے بعد کسی دوسری قوم کو بھیجکر نہیں کر سکتی؟ نادانو! تم نے اگر
اللہ کی بخشی ہوئی حکومت وعزت کو کھو دیا ہے تو غم نہیں، لیکن یہ کیا بدبختی ہے کہ اپنے
دلوں اور دلوں کی رُوح امید کو بھی کھو رہے ہو؟
اس تیرہ سو برس کے اندر کتنی قومیں آئیں اور اپنی اپنی باری میں حفاظت اسلام کی
خدمت انجام دیکر چلی گئیں۔ جب تک انہوں نے اسلام کا ساتھ دیا اور اپنے اعمال و
اعتقادات میں اس سے منہ نہیں موڑا، اس وقت تک وہ بھی اُن کے ساتھ رہا، لیکن
جب انہوں نے اپنی صلاحیت اور قابلیت کھو دی، اور اس مقصد کو بھول گئے، جس
کی انجام دہی کے لئے زمین کی وراثت ان کو دی گئی تھی، تو اُن کا دَور کارفرمائی ختم ہو گیا
اور اللہ نے اپنے دین کی حفاظت کی امانت کسی دوسری جماعت کے سپُرد کر دی، وہ
اپنے کلمۂ مقدس کی حفاظت کے لئے ہمارا محتاج نہیں ہے، بلکہ ہم اپنی زندگی کے
لئے اُس کے محتاج ہیں +

لَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ

نومید مشو کہ، ناامیدی کفر است

پھر یہ ممکن ہے کہ اس کائنات ارضی کا ہر مخلوق ناامید ہو جائے یہ بھی محال نہیں کہ دنیا
کی تمام قومیں اور تمام انسانی جماعتیں مایوسی کو اپنا قبلۂ مقصود بنالیں لیکن جن لوگوں کے
دلوں کو اسلام کی امانت سپُرد کی گئی ہے۔ وہ تو کبھی مایوس نہیں ہو سکتے۔ اسلام سرتاسر
امید ہے، اور وہ جب کبھی کسی انسان کا ہاتھ پکڑتا ہے تو پہلی جو چیز اُسے دیتا ہے وہ
امید ہی ہے۔ اس کی اصطلاح میں اسلام امید کا نام ہے اور مایوسی کفر کا مبداء ہے۔
حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی تھی:۔

خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو اس کی رحمت سے کوئی مایوس نہیں ہو سکتا مگر وہی بدبخت
قومیں جنہوں نے اپنے دلوں کو کفر کا آشیانہ بنا لیا ہے ۔ (۱۲: ۸۸) (ترجمہ آیت قرآن کریم)

اُس کی پہلی آواز اپنے ہر پیرو کے لئے یہ ہے کہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ!! وہ مایوسی کو کسی حال میں ایک مومن کے لئے جائز نہیں رکھتا۔ اور کہتا ہے وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ؟ دنیا میں مسلمان مایوسی کے لئے نہیں پیدا کئے گئے ہیں، وہ صرف امید کے لئے ہیں، اور جس دن اُس کے لئے نہ ہوں، اُس دن وہ مسلم بھی نہیں، یہ موقعہ اس کی تفصیل کا نہیں ہے، مگر اُس آیت کریمہ کو یاد کرو جس سے اس مضمون کا افتتاح ہوا ہے خدا نے مایوس ہو جانے کی نسبت فرمایا ہے کہ اگر وہ مایوس ہو گئے ہیں تو ان کے رہنے کے لئے میری پیدا کی ہوئی دنیا موزون نہیں "فلیمدد بسبب الی السماء فلیقطع ان کو چاہئے کہ رسی کا پھندا گلے میں ڈال کر خودکشی کر لیں، کیونکہ مایوسی کی دوسری منزل خودکشی ہے ۔

اُردو نظم ہندی بحروں میں

از پروفیسر تاجور

جیسا کہ ملکی زبان کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کا قابل سے قابل اور جاہل سے جاہل آدمی اسے سمجھ اور بول سکے۔ بالکل یہی اصول ہمیں کسی ملک کی شاعری کیلئے تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ایسی سہل الحصول ہو کہ اُس ملک کا ہر فرد عام اس سے کہ وہ اعلیٰ تعلیمیافتہ ہو یا مطلق جاہل اپنے فطری جذبات کو موزون کر سکے۔ جو شاعری صرف اچھے پڑھے لکھوں کا حصہ بنی رہے، جسے ملک کا اُجڈ دیہاتی طبقہ اختیار کرنے اور سمجھنے پر بھی قادر نہ ہو حقیقتہً وہ شاعری اس ملک کی شاعری اور اس شاعری کی زبان اُس ملک کی زبان نہیں کہی جا سکتی۔ کسی مُلک کی شاعری اگر اس ملک کی عام زبان میں اور اُس ملک کے طبعی حالات کے مطابق ہو تو اُس ملک کے وہ شاعر جن پر شہری زندگی کا اثر نہیں جنہیں تمدن کی ہوا تک نہیں لگی زیادہ گرانقدر اور فطرت نگار ہوتے ہیں۔ اُن شعراء کی بہ نسبت جو تمدن کی مصنوعی رنگینیوں میں رنگے ہوئے ہیں۔ عرب کی شاعری اس دعویٰ کی زندہ شہادت ہے۔ عرب جب تک خانہ بدوشی اور صحرا نشینی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ جب تک قدرت کے حقیقی مناظر ان کے پیش نظر رہے۔ جب تک اُن کے ہاں لکھنا پڑھنا جرم سمجھا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اُن کی شاعری عرب کے جغرافی حدود کو بدلتی رہی۔ اُن کی معجز بیانیوں نے اپنے سوا تمام دنیا کو عجم (گونگا) کا خطاب دیا۔ مردوں کو چھوڑ کر ان کی عورتوں اور بچوں نے اپنی سحر بیانیوں سے باقی دنیا کے مرد شعراء کو مات کر دیا۔ لیکن جب سے ان میں تعلیم اور شہری زندگی کی ابتداء ہوئی اُن کی شاعری میں ضعف پیدا ہونا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ عباسیوں کی سلطنت میں آکر وہ بالکل عجمی ہو گئے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ تمدن ان کی فراوانیاں اپنے جلو میں۔ تکلفات۔ تصنع اور بناوٹ رکھتی ہیں۔ فطرت کی سادگی جاتی رہی ہے۔ اور شاعری جب تک نیچرل ہے وہ اصلی معنوں میں شاعری ہے اُس کے بعد وہ شاعری کی بجائے تفنن طبع اور

خیال بندی ہو جاتی ہے۔ شاعری نہیں رہتی۔ شیکسپیئر اسی لئے اپنی قوم کے لئے اس ۳۳ کروڑ کی بستی سے زیادہ گراں قیمت سمجھا جاتا ہے کہ وہ فطرت کا سب سے بڑا مصور مانا گیا ہے۔ انسان اپنے فطری جذبات موزون کرنے میں جس درجہ کامیاب ہوگا اسی حد تک اُس کی شہرت میں پر پرواز پیدا ہونگے۔ اور فطری جذبات اپنی ملکی زبان، ملکی حالات۔ اور ملکی خیالات میں زیادہ دل آویزی۔ زیادہ دل کشی اور خوبصورتی سے نظم ہو سکتے ہیں تو کیا ہماری اردو شاعری بھی ہماری ملکی شاعری کا نام پانے کی مستحق ہے؟ اس کا جواب ہندو مسلم سوال سے بہت بلند ہو کر۔ اپنی ذاتی پسند سے کوسوں دُور رہ کر دیجئے۔ میرے خیال میں غیر جانبدار بن کر آپ اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ "نہیں" اردو شاعری موجودہ صورت میں ملک کی اصلی شاعری قطعاً نہیں ہے اگر اردو شاعری یہی ہے کہ

"وقتِ انصاف ہے ابرِ کرم لطف بتاں
شاخِ نخلِ چمن طرزِ فغاں سوکھ گئی"

تو یہ شاعری سرحد کے آزاد قبائل کی ہو سکتی ہے۔ ہمارے ملک سے تو قطعاً بیگانہ ہے۔ تم اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتے ہو؟ جب تم دیکھ رہے ہو کہ اُردو شاعری دیہات اور جنگلوں سے بیر رکھتی ہے۔ لاکھوں دیہاتی اسے سمجھ بھی نہیں سکتے۔ بچے تو الگ رہے شہروں کی تعلیمیافتہ عورتوں کے لئے بھی اردو شاعری اَن کہنی بات ہوئی ہے۔ اس ۳۳ کروڑ کے وسیع رقبے میں تین سو عورتیں بھی اردو شاعری کے میدان میں نظر نہیں آئیں۔ حالانکہ دیہاتی عورتوں اور دیہاتی بچوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو گاتا نہ ہو۔ تو کیا کبھی تم نے اُنکے گیتوں کو سُنا ہے اور سُن کر غور کرنے کی تکلیف گوارا کی ہے؟ کہ وہ کس زبان کن اوزان میں ہوتے ہیں؟ کیا تم نے انہیں غالب کی غزلیں گاتے سُنا ہے، یا کبھی تم نے ان کے کسی گیت کو "مفاعیلن مفاعیلن ہشت بار" پر تقطیع دیکھا ہے۔ ان کی کوئی نظم بحر "رجز و رمل" اور ان کے بے شمار زحافات پر کبھی پوری اُتری ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے۔ تو کیوں؟ کیا اردو کے مروجہ اوزان ہندوستانی شاعری کے لئے اصلی سانچہ بن سکتے ہیں؟ اگر بن سکتے ہیں تو کیوں

نہیں اردو شاعری میونسپلٹی کی حدود سے تجاوز کرتی ؟ اور اگر مروجہ بحریں ہمارے ملک کی شاعری کے لئے بیشی ہیں تو کیا اصلیت کی جانب قدم اٹھانے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے ؟ میرے خیال میں ہر ہندوستانی شاعر اور ہر اُس شخص کو جو ہندوستانی ادبیات سے دلچسپی رکھتا ہے اس سوال پر ایک غیر جانب دارانہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ اردو نظمیں کن اوزان پر ہمیں اچھی معلوم ہونگی۔ بلکہ یہ کہ حالات کا اقتضا کیا ہے ؟ مجھ سے پوچھئے تو اردو نظموں کو ہندی آمیز بنا کر ہندی دوھروں کے اوزان میں منتقل کرنے کی کوشش میرے لئے نشتر برجگر ہوگی۔ مگر وقت اور مصلحت کا فرمان میری آپ کی خواہشوں کے ماتحت نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم نے اردو کو فارسی عربی الفاظ کا مجموعہ بنانے پر اصرار جاری رکھا۔ اس کی شاعری کو اس طرح غیر ملکی اوزان کا پابند بنایا گیا۔ تو ہمیں اس خونریز تصادم کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے جو مستقبل میں اردو مٹانے کے لئے کیا جائے گا۔ اور جس کی ابتدائی تیاریاں تقریباً ہر گوشے میں ہو رہی ہیں۔ اس لئے پہلے ہمیں اردو زبان کو غیر ملکی ثقیل الفاظ سے پاک کر کے ہندوستانی بنانا چاہیئے۔ اور شاعری کو ملکی حالات کے برابر کر کے ہندوستانی شاعری کے قالب میں ڈھالنا چاہیئے۔ ہماری شاعری ہندوستانی شاعری اسی وقت ہو سکتی ہے کہ اُس کی زبان ہندی آمیز ہو۔ وہ ہندی وزنوں میں ہو۔ وہ ایسی ہو کہ اس میں ہر ہندوستانی اپنے جذبات آسانی سے موزون کر سکے۔ جاہل سے جاہل اور گنوار سے گنوار اگر وہ شاعرانہ طبیعت رکھتا ہے اُس میں گُن گُنا سکے۔ میں ولی دکنی کی قائم کی ہوئی عمارت کو یکسر منہدم نہیں کرنا چاہتا۔ نہیں موجودہ اردو نظم اپنے مروجہ وزنوں میں ہو اور ضرور ہو۔ لیکن ولی کی اس جدت پر اس قدر فریفتگی کو بھی میں اردو شاعری کے لئے مہلک تصور کرتا ہوں کہ ملکی حالات اور ملکی مصلحتوں سے بے نیازی برتی جائے۔ ولی نے تفنن طبع کے طور پر اردو نظم کو ہندی وزنوں کی بجائے فارسی بحروں میں ڈھالا لیکن اس کے بعد اُس کی عالمگیر پیروی نے سچ یہ ہے کہ اردو کو اپنے کروڑوں ہمدردوں سے محروم کر دیا میری اس تجویز نے کہ ہندی زبان میں سے سنسکرت کے ثقیل الفاظ نکال کر ہندی ہی کو عام ملکی زبان قرار دیا جائے۔ صرف اس کا کیریکٹر فارسی رکھا جائے میرے بہت سے مسلمان دوستوں کو ناراض کر دیا۔ بہت ممکن ہے کہ میری اس کوشش

کو بھی کہ اردو شاعری ہندی اوزان میں ہو کل قابل نفرین ٹھیرایا جائے۔ لیکن میں تو اس امر میں دوستوں کی لعنت و ملامت سے اسی قدر بے خبر رہنا چاہتا ہوں جس قدر مریخ کی مخلوقہ دُنیا سے ✦

اردو شاعری کو ملکی شاعری بنانے کی کوشش کرنا ہر شاعر کو اپنا فرض سمجھنا چاہیئے اگر ملک کے دس سر برآوردہ اردو شاعر بھی اردو نظمیں ہندی وزنوں میں کہنا شروع کر دیں۔ تو ایک ہی سال میں ہندوستانی جذبات کا سیلاب دجلہ کی بجائے گنگا کے رُخ بہنے لگے گا۔ اگر اس کے جواز پر شعرائے سلف کا فتوے درکار ہے تو اردو کا خدائے سخن میر اور ملک الشعرا سودا۔ دونوں اس کے جواز پر دستخط کر چکے ہیں۔ سودا اور اور میر کی بعض مثنویاں رآمائن کے وزن میں کہی ہوئی ہیں۔ میر کی کئی غزلیں ہندی وزنوں میں موجود ہیں۔ انہیں پڑھ کر یہ تجربہ بھی ہوا کہ ہندی وزنوں میں آکر اردو نظم بہت شیریں اور پُر اثر ہو جاتی ہے۔ فارسی عربی وزن میں نظم آرائی کرنا کوئی مذہب کا حکم نہیں ہے کہ اُس کی خلاف ورزی مذہبی مجرموں میں شمار کرا دیگی۔ فارسی عربی اوزان ہمارے ملک کے ہمارے حالات کے اور ہماری شاعرانہ فطرت کے خلاف ہیں پھر کیوں نہ ہم اپنی زبان کی شاعری کو اس طوق و زنجیر سے آزاد کریں۔ کیوں نہ اپنی شاعری کے لئے فطری سہولتیں مہیا کریں۔ وہ زمانہ متحدہ ہندوستان کے لئے کس قدر مبارک ہوگا جب ۳۳ کروڑ ہموطن یک دل و یک زبان ہونگے۔ جب ہماری شاعری ملکی حالات کے زیر اثر ملک کے ہر گوشہ میں جذبات حب الوطنی پھیلا رہی ہوگی۔ ذیل میں میر تقی مرحوم کی ہندی وزن میں کہی ہوئی سینکڑوں اردو غزلیات میں سے چند غزلوں کے منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں ✦

ہائے ستم ناچار معیشت کرنی پڑی ہر خار کے ساتھ
جانِ عزیز گئی ہوتی کاش اب کے سال بہار کے ساتھ

وہ لحظہ نہیں جاتا جی سے آنکھ لڑی تھی جب اُس سے
چاہ نکلتی تھی باتوں سے چتون بھی تھی پیار کے ساتھ

تم کو ہم سے لاگ لگی ہے روتے ہیں تو ہنستے ہو
ہم نے کمر کو کھول رکھا ہے اپنی کمر تم کستے ہو

دل کو کہیں لگنے دو میرے کیا کیا رنگ دکھاؤں گا
چہرے سے خوناب ملونگا پھولوں سے گل کھاؤں گا
خاک ملامنہ، خوں آنکھوں میں، چاک گریباں تا دامن
صورت حال اب اپنی۔ اُس کے خاطر خواہ بناؤں گا
چاہت کا اظہار کیا سو اپنا حال خراب ہوا
اس پردے کے اٹھ جانے سے اُسکو ہم سے حجاب ہوا
شیخ حرم سے لڑکے چلا ہوں، اب کعبے میں نہ آؤں گا
تا بُت خانہ ہر قدم پر سجدہ کرتا جاؤں گا
کیا کہئے کچھ بن نہیں آتی، جنگل جنگل ہو آئے
چھاؤں میں جا کے ببولوں کی ہم عشق وجنوں کو رو آئے
دل کی تلاش میں اٹھ کے گئے تھے شاید یاں پیدا ہو، سو
جان کا اپنی گرامی گوہر اُس کی گلی میں کھو آئے

کیا آپ "مہذب" ہیں؟

جناب محمد ضیاء الدین صاحب شمسی

ممکن ہے کہ ہر شخص "فرشتہ خصلت" کہلائے جانے کا متمنی نہ ہو مگر پھر بھی ہم میں سے ہر ایک اس بات کا ضرور خواہشمند ہے کہ اُسے "دیانتدار"، "سلیم الطبع" اور "نیک طینت" کہا جائے اور اسی طرح ہر عفت مآب خاتون عمدہ سلوک اور عزت کی تمنائی ہے +

اس امر کے اظہار کے لئے ایک بہترین اصطلاح "مہذب" ہے کیونکہ یہ اُن تمام الفاظ پر محیط ہے جو ہر شخص اپنی نسبت سُننے کا آرزومند ہے۔ چونکہ یہ ایک عام لفظ ہے اس لئے "آبائی شرافت" سے اسکو کوئی تعلق نہیں۔ یہ ذاتی چلن کی طرف اشارہ ہے اور اسے صرف آپ کی ذات ہی سے تعلق ہے آپ کے آباؤ اجداد کے ساتھ نہیں۔ یہ آپ کی ذاتی شرافت پر دال ہے۔ خواہ وہ آبائی ہو یا نہ ہو +

میں اس بات پر بحث نہیں کروں گا کہ ہر انسان کے چال چلن کا کہاں تک اُس کی خاندانی شرافت و وجاہت اور تربیت یا مجہولیت نسب سے تعلق ہے۔ کیونکہ میرے نزدیک کسی آدمی کے چلن کا صحیح معیار قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ولابدی امر نہیں کہ اُس کا موروثی شرف مدنظر رکھا جائے۔ میں بیسیوں ایسے نوجوانوں کو جانتا ہوں جن پر آکر اُن کی "آبائی شرافت" ختم ہوگئی۔ اور بہت سے ایسے ہونہاروں کو بھی جانتا ہوں جن سے اُن کا خاندانی عروج شروع ہوا۔ پس میں آپ کی ذاتی صفات کو مدنظر رکھوں گا نہ اس بات کو کہ آپ نے کن ذرائع سے ان کو حاصل کیا +

میں اس بات کو بھی نظر انداز کرنا چاہتا ہوں کہ آپ دنیا میں کیا حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ایک محنتی مزدور بھی "راستباز"، "سلیم الفطرت"، اور "صاف دل" ہو سکتا ہے۔ برعکس اس کے ایک طلائی شاندار کلاہ پر لپٹا ہوا طرہ دار ریشمی صافہ اور زرق برق پوشاک پہننے والا نواب اور راجہ بھی "دروغگو"، "کجرو"، اور "بد باطن" ہو سکتا ہے۔ اس لئے میرے مطمح نظر سے "مہذب" ہونا اس بات سے فی الحقیقت

کوئی تعلق نہیں رکھتا کہ آپ کی حیثیت عرفی کیا ہے یا آپ کی "پوزیشن" سوسائٹی مجلس وضع قوانین۔ مجلس قومی۔ مجلس خلافت یا مجلس کانگرس میں کیسی ہے یہ صرف اس بات سے نسبت رکھتا ہے کہ آپ کس قسم کے "بنی نوع انسان" ہیں +

اِس مضمون سے میرا مطلب آپ کو یہ معلوم کرنے میں مدد دیتا ہے کہ آپ کس قسم کے آدمی ہیں۔ میں آپ کو ایک ایسا "معیار" بتاتا ہوں جس سے امید ہے کہ آپ خود کو بخوبی جانچ لیں گے۔ ممکن ہے کہ آپ "اسفل ترین" یا اس کے برعکس "ثابت ہوں۔ میں آپ کو کسی بات کا مجرم نہیں گردان رہا ہوں جب آپ آئینہ میں دیکھ رہے ہوں اور اپنے صافہ یا قمیص کے کالر پر آپ کو سیاہ داغ دکھائی دے تو آپ آئینہ کو مطعون نہیں کریں گے اور بس جو کچھ میں یہاں کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہی ہے کہ آپ کے سامنے ایک ایسا آئینہ تھامے رکھوں جس میں آپ اپنا "کیریکٹر" دیکھ لیں +

یقیناً آپ یہ دیکھ کر حیران ہونگے کہ بعض باتوں میں آپ کامل واکمل" ہیں۔ اور بعض میں آپ کو ابھی بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔ اور اگر ہم دیانتداری سے غور کریں گے تو بلاشبہ ان باتوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہونگے جن میں ہم ناقص ہیں اور جن میں کامل ہونے کے لئے ہمیں تمام عمر سعیٔ مسلسل کرنا چاہیئے۔ اپنے آپ سے استفسار کیجیئے۔ لیکن سوال کرتے وقت کوئی عذر لنگ پیش نہ کریں۔ اپنے آپ پر تاسف ہونا بھی جادۂ سلیم سے دُور پھینک دیگا۔ سچائی کا اظہار کیجیئے لیکن شرم کو بالائے طاق رکھ کر۔ اگر آپ تسلی بخش اور درست طور پر اُن سوالات کے صحیح جوابات بتائیں تو اُس کے آگے ۱۰ نمبر لگا دیجیئے اور اگر آپ اُس میں بالکل صفر ہوں تو (صفر) لگا دیں۔ اور اگر "کچھ۔ کچھ" ہوں تو ایمانداری سے جواب کی حیثیت دیکھ کر ۳۔ ۵ اور ۶ نمبر دے ڈالئے یہ مضمون صرف "اپنے آپ کو" انسانیت کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے ہے "دوسروں" کے لئے نہیں۔ غیروں کی جانچ پڑتال کرنا حماقت ہے۔ اور امتحان۔ کیجیئے اپنا ایک منصف کی حیثیت سے نہ کہ ایک وکیل کی حیثیت سے۔ ان باتوں پر غور کرتے وقت قانونی نقطۂ نظر سے دیکھ کر ہر ایک بات کو اپنے حق میں وارد کرنے کی

سعئ بے سود آپکو صحیح نصب العین سے ہٹا دیگی اور نہ ہر بات کو اپنے مخالف خیال کرتے ہوئے اپنے آپ کو بدبختی اور سیاہ کاری کا مجسمہ قرار دو۔ ایماندار اور دیانتدار رہیئے۔ آپ کسی بات کو "ثابت" نہیں کر رہے بلکہ آپ کسی بات کو "تلاش" کر رہے ہیں۔

آیئے ہم ان صفات کو لیں جن پر ہر شخص خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو اپنا اطمینان ظاہر کریگا کہ یہ ہر انسان کے لئے لازمی ہیں۔ اور اس امر کو پیش نظر رکھیئے کہ اسوقت ہم "پرہیزگار" "مجسمۂ زہد و تقوے" اور "فلک خو" بننے کے لئے نہیں بحث کر رہے ہیں بلکہ ہمارا مقصد صرف اس بات کے بیان کرنے کا ہے کہ ہر شخص کیا ہونا چاہتا ہے؟ خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ پنڈت ہو یا بھاٹ تحصیلدار ہو یا جاٹ۔ خان بہادر ہو یا تارک موالات شہری ہو یا دیہاتی۔

مندرجہ ذیل سوالات اپنے آپ سے کیجئے اور دیکھئے کہ آپ میں کیا کیا معائب و محاسن ہیں:۔

کیا آپ ہیں؟

(۱)۔ صاف دل	(۱۲) خود پسند
(۲) ایمان دار	(۱۳) خوش مزاج
(۳) خوش اخلاق	(۱۴) خود پرست
(۴) مہربان	(۱۵) توہم پرست
(۵) دیانتدار	(۱۶) نمائش پسند
(۶) خود اعتبار	(۱۷) ہمت بلند
(۷) بہادر	(۱۸) حاسد۔
(۸) ہنرمند	(۱۹) ضرورت سے زیادہ ہمدرد
(۹) صادق	(۲۰) دُور اندیش
(۱۰) سادگی پسند	(۲۱) ذکی الحس
(۱۱) صفائی پسند	(۲۲) وفادار

اگر آپ نے ان سوالات کے جواب دے کر نمبر لگا دیئے ہیں تو ان میں سے ہر ایک کی مندرجہ ذیل تشریح بنگاہ تعمق دیکھئے اور اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر کے حکم سُنا دیجئے!!

(۱) کیا آپ صاف دل ہیں :- کیا آپ کی رائے اس بات سے متاثر ہوتی ہے کہ زید عدم تعاون ہے اور آپ موالاتی - وہ ہندو ہے اور آپ مسلمان - وہ شیعہ ہے اور آپ سُنّی - وہ آریہ ہے اور آپ سناتن دھرمی - وہ بنگالی ہے اور آپ پنجابی - وہ انگریز ہے اور آپ ہندوستانی ؟ کیا کبھی تفریق ملت - فرقہ بندی ملکی و نسلی امتیاز - مذہبی تعصب اور اسی قسم کی سینکڑوں باتیں آپ کے موازنہ اشخاص میں مداخلت کر سکتی ؟ کیا آپ کا انصاف "پسندیدگی" اور "ناپسندیدگی" کی رَو میں بہہ سکتا ہے - کیونکہ آپ ایک شخص سے محبت رکھتے ہیں اور اُس کی ہر جائز و ناجائز حرکت کو بھی جائز قرار دیتے ہیں - اگر کوئی دوسرا شخص ویسی ہی ناجائز حرکت کرے جیساکہ آپ کا محبوب ترین دوست تو کیا آپ اُس کو ذلیل یا کمینہ کہہ کر پکاریں گے ؟ کیا آپ اُس شخص کی ارفع صفات کو نظرانداز کر دیں گے جس نے کسی بات پر آپ کو ملامت کی ہو ؟ یا آپ نے کبھی سُنا ہو کہ بگڑ آپ کے مضامین پر نکتہ چینیاں کرتا ہے یا آپ کے کسی فعل کو بنظر استحسان نہیں دیکھتا یا آپ کی نسبت نا ملائم الفاظ استعمال کرتا ہے تو یہ آپ کے دل پر کس طرح اثر کریگا ؟ اور اُس کا جوہر قابلیت پرکھنے کے لئے کیا آپ کے دل میں کوئی انسانیت کی موج غیر متلاطم رہ بھی سکیگی جو آپکے ہوش و حواس کی کشتی کو ناانصافی کے بھنور سے بچالے ؟

لیکن اس سے میری یہ مراد نہیں کہ مہذب شخص کسی قسم کے جذبات و محسوسات نہیں رکھتا - یا یہ کہ وہ کسی آدمی کو پسند یا ناپسند کرنا نہیں جانتا بلکہ وہ اسوقت بھی پر ہمت - شاداں اور مستقل مزاج رہتا ہے اور اپنی رائے ایسی ہی بے لوث اور تعصب سے بیگانہ وش رکھتا ہے جبکہ اُس پر کوئی طعن و تشنیع کی گئی ہو یا جب اُس کے اور خالد کے درمیان مذہبی منافرت اور مغائرت کی وسیع خلیج حائل ہو وہ اپنے دل کو کدورت سے ہر وقت بچا سکتا ہے +

(۲) کیا آپ ایماندار ہیں ؟ کیا آپ ہر ایک کام شب دیجور کی "تاریکی" میں بھی ویسی ہی احتیاط سے کرتے ہیں جس طرح آفتاب عالمتاب کی "روشنی" میں ؟ اگر آپ کے سر کسی آدمی کا قرض چڑھا ہو اور وہ اس دنیائے فانی سے رحلت کر جائے

تو کیا آپ وہ رقم اُس کے جائز وارثوں کو ادا کر دینگے جب آپ کو یہ بھی معلوم ہو کہ آپکے مقروض ہونے کی ان میں سے کسی کو بھی خبر نہیں؟ کیا آپ ہمیشہ اپنے الفاظ پر قائم رہتے ہیں جب کوئی بات آپ کے برعکس ثابت ہو جائے؟ کیا آپ دوسرے لوگوں کے خطوط پڑھ لیا کرتے ہیں جب کوئی دوسرا آپ کی اس حرکت کو نہ دیکھ رہا ہو؟ کیا آپ کسی کوچہ و بازار سے گذرتے وقت کسی مکان کے اندر دیکھتے ہیں جس کا دروازہ کھلا ہو؟ کیا آپ دوسروں کے پرائیویٹ اور خانگی معاملات کے متعلق گفتگو سنتے ہیں۔ جب آپ کو یہ یقین ہو کہ کوئی شخص آپ کو نہیں دیکھ رہا؟ کیا آپ کسی ایسی افواہ کو سرگرمی سے پھیلاتے ہیں جب آپ کو یہ بھی معلوم ہو کہ وہ خبر بے بنیاد ہے۔ اور اس سے کسی دوسرے شخص کی حیثیت عرفی یا کسی اور چیز کو ناقابل تلافی صدمہ پہنچیگا۔ اور جس سے آپکو کوئی تعلق نہیں؟

اب اس آئینہ میں غور سے دیکھئے کہ آیا آپ مطمئن ہیں؟ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ ایسے فقرات استعمال نہ کریں "مجھے معلوم ہے کہ میں کامل نہیں" یا یقیناً "میں ایسی بہت سی باتیں کرتا ہوں جو مجھے سزاوار نہیں" بلکہ یہ سوال کیجئے "کیا میں مخبر ہوں؟" "میرا بدترین دشمن مجھے کیا سمجھے گا؟" دنیا میں صرف ایک واحد شخصیت ہے جسے تمام اقسام کی نکتہ چینیاں۔ ناملائم۔ کرخت و ترش الفاظ اور بے رحم و ناانصاف ناخوشگوار معلوم ہے ——— آپ کو ——— آپ کی طرف سے!!

(۳) کیا آپ خوش اخلاق ہیں؟ کیا آپ اوصاف حمیدہ رکھتے ہیں؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ کسی محفل یا مجلس میں کس طرح داخل ہو کر کہاں بیٹھنا چاہیئے؟ کیا آپ نرم زبان ہیں اور ہر ایک قسم کی محافل و مجالس آپ کے لئے باعث سکون قلب اور اور تسکین دل ہو سکتی ہیں لیکن یہ باتیں تو ایک وحشی انسان کو بھی سکھلائی جا سکتی ہیں میری مراد اس سے کچھ اور ہے۔

کیا آپ کو کبھی کسی غریب ہمسایہ کی آسایش کا بھی خیال ہوا ہے جو دن بھر کی سخت اور بیمار کن محنت کے بعد اپنے بال بچوں کو آرام نہیں پہنچا سکتا؟ کیا آپ اپنی کرسی سے اُٹھتے ہیں جب ایک معمر یا مذہبی بزرگ کمرہ میں داخل ہوا ہو؟ کیا ریل گاڑی میں آپ نے اپنی جگہ سن سفید ریش بزرگ کے لئے پیش کی ہے جو عصائے

پیری پر ہاتھ رکھے جگہ کی تلاش میں حسرت بھری نظر سے ہر چہار طرف دیکھ رہا ہو؟ کیا آپ نے کبھی اپنے ساتھی مسافر سے تمباکو نوشی کے لئے اجازت حاصل کی ہے جب ریلوے کا قانون بھی یہی ہے؟ کیا آپ لوگوں کی گفتگو میں اُس وقت مداخلت کرتے ہیں جب آپ کسی بات کا اظہار لازمی سمجھتے ہوں یا اُس لمحہ کا انتظار کرتے ہیں جبکہ گفتگو میں کوئی وقفہ پیدا ہو جائے؟ کیا آپ جذبات سے متاثر ہو کر بلند آواز سے بولنے لگتے ہیں؟ کیا آپ ریلوے۔ تھیٹر یا دنگل کے ٹکٹ گھر پر ایک قطار میں کھڑے ہو کر ٹکٹ خریدنا پسند کرتے ہیں۔ یا قوتِ بازو سے لوگوں کو دھکیل کر آگے نکل جانے کے خواہشمند ہیں؟ کیا آپ نے کبھی اس بات کا فخر سے اظہار کیا ہے کہ کسی مشاعرہ۔ کسی تماشہ۔ کسی لیکچر یا مجلس وعظ میں آپ سب سے پیچھے آئے اور سب سے آگے نشست حاصل کر لی؟ کیا آپ "عملی مذاق" کی حد تک پہنچ جایا کرتے ہیں؟ کیا آپ اُس وقت مسرور ہوتے ہیں جب دوسرا خفت زدہ ہو یا جب کوئی راہ چلتے بائسکل سے گر پڑے یا کسی پھسلنی چیز سے پھسل پڑے؟ کیا آپ اُس وقت قہقہہ لگاتے ہیں جب کوئی فاش غلطی کر رہا ہو؟

(۴) کیا آپ مہربان ہیں؟۔ کیا آپ ملازمین سے صرف اس لئے بُرا سلوک کرتے ہیں کہ وہ آپ کے ملازم ہیں؟ کیا آپ بچوں کی توتلی اور بے رُخی گفتگو اُسی مسرت اور اُسی توجہ سے سُنتے ہیں جس طرح شادی کے دوسرے دن اپنی خوبصورت بیوی کی سُنی تھی۔ یا اپنی کرخت آواز اور ڈراؤنی صورت سے آنکھیں نکال کر اُن کے حواس گم کر دیا کرتے ہیں؟ کیا آپ اپنے ماتحتوں سے ایسے ہی سنجیدہ الفاظ میں گفتگو کرتے ہیں جس طرح اپنے کسی مالدار دوست یا کسی گاہک سے؟ کیا آپ لوگوں کے سامنے انگریزی میں گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں جو اس زبان سے بے بہرہ ہوں؟ کیا آپ کوئی ایسا فعل کرتے ہیں جس سے دوسروں کو یہ معلوم ہو جائے کہ عمر و لیاقت۔ علمیت اور دنیاوی تجربات میں بہت خام ہے؟ کیا آپ ہر ایک غریب و امیر معمر مرد یا عورت کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں خواہ وہ آپ کے متعلقین میں سے ہو یا نہ ہو؟ کیا آپ ہمیشہ ان آدمیوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں جو کسی بات میں آپ سے کمزور اور کم حیثیت ہوں؟

(۵) کیا آپ دیانتدار ہیں؟ کیا آپ اپنی کسی تقریر یا کارگزاری کا ذکر کرتے وقت رنگ آمیزی سے بھی کام لیتے ہیں تاکہ آپ کی نسبت دوسروں کا حسن ظن بڑھے یا اُس سے بڑھ کر داد حاصل کرنا چاہتے ہیں جو کچھ فی الواقعہ آپ نے کہا یا کیا تھا؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کو نوعمر۔ پُر مذاق۔ ہوشیار۔ اعلےٰ تعلیم یافتہ۔ جہاں دیدہ۔ مشہور و معروف یا عالیجاہ منصف یا دولت مند کہکر پکاریں۔ حالانکہ آپ نہیں ہیں؟ کیا آپ دوران تکلم میں "مجھے معلوم نہیں" کہتے ہوئے شرماتے ہیں یا زمانہ سازی و بہانہ بازی سے دوسروں پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کو سب کچھ معلوم ہے۔ اور خصوصاً اُس حالت میں جب کہ فی الواقعہ اُس امر کی نسبت آپ کو کوئی واقفیت نہیں؟ اگر ریلوے ٹکٹ کلکٹر آپ کا ٹکٹ دیکھنا بھول جائے تو آپ اُسے بتا دینگے۔ کہ آپ کے پاس ٹکٹ ہے یا نہیں؟ کیا آپ نے کبھی ریلوے[1] تغلب پر اظہار تاسف کیا ہے؟ کیا آپ کسی ہوٹل یا اپنے میزبان کے گھر سے رخصت ہوتے وقت ایسی چیزیں اٹھا لے جاتے ہیں جو آپ کی ملکیت نہ ہوں؟ اگر ڈاک کا ہرکارہ کسی غیر کا پارسل غلطی سے آپ کے ہاں دے جائے تو کیا آپ واپس کر دیں گے۔ جب آپ کو کھو لنے پر یہ معلوم ہو کہ اس میں ایسی قیمتی چیزیں ہیں جو آپ کو درکار تھیں؟ اگر کوئی دکاندار یا ٹکٹ گھر کی کھڑکی والا کلرک آپ کو آٹھ آنے کے پیسے اصل رقم سے جو اُسے آپ کو واپس کرنی تھی زائد دے ڈالے تو کیا آپ خاموش ہو کر اُسے رکھ لیتے ہیں؟ اگر میونسپل کمیٹی یا محکمہ برق کے کسی بل میں کوئی رقم آپ سے کم وصول کی گئی ہو تو کیا آپ افسران مجاز کی توجہ اُس طرف منعطف کرائیں گے؟ اگر کسی کلرک کی غلطی سے رسالہ ہمایوں کے خریداروں کی فہرست میں دو مختلف جگہ آپ کا نام لکھا گیا ہو اور ہر ماہ بجائے ایک کے دو پرچے آپ کو موصول ہو جایا کریں تو کیا آپ فوراً مینیجر کو اطلاع دیں گے یا اپنے

[1] اس سے میری مراد یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس ٹکٹ کی حیثیت سے بوجھ زیادہ ہے تو کیا آپ ریلوے افسران کی نظر بچا کر اسٹیشن سے باہر نکال لے جائینگے؟ اگر درمیانہ درجہ میں رات کے وقت زیادہ ہجوم ہے تو کیا آپ سیکنڈ کلاس کے خالی کمرہ میں جاکر سو رہیں گے؟ یا آپ کے ہمراہ بارہ سال سے زاید عمر کا بچہ ہے تو کیا آپ اُس کا پورا ٹکٹ خریدیں گے یا افسران ریلوے کے استفسار پر اُس کی عمر دس سال سے کم بتائیں گے وغیرہ وغیرہ ۱۲

کسی دوست کے حوالہ کرکے دفتر کی غلطی پر تمسخر اُڑائیں گے؟ اگر آپ کو شہر کی کسی گذرگاہ پر ایک پاکٹ بک مع یک صد روپیہ کے نوٹ کے مل جائے۔ تو کیا آپ اُس کے مالک کا پتہ لگانے کی کوشش کریں گے؟ مختصراً کیا آپ دیانتدار ہیں۔ اس لئے کہ یہ باتیں اصول اور مذہب کے منافی ہیں یا اس بات سے خائف ہیں۔ کہ مبادا آپ کی ان حرکات سے کوئی واقف نہ ہو جائے؟

(۶) کیا آپ خود اعتبار ہیں:۔

کیا آپ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں یا ایم۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد بھی والدین کے دستِ نگر ہیں؟ کیا آپ اَوروں سے تحائف وصول کر لیا کرتے ہیں اور اُن کی کسی طور "واپسی" نہیں کرتے؟ کیا آپ اپنے دوستوں۔ رشتہ داروں یا عام ملاقاتیوں سے قرض یا خطوط تعارف حاصل کر لیتے ہیں یا اپنی ضروریات کے وقت اُن کے دروازے نظر انداز کر دیتے ہیں؟ کیا آپ اپنے فائدے کے لئے آپ دوسروں کا وقت ضائع کرتے ہیں جب وہ آپ کے زیر بار احسان نہیں؟ کیا آپ اپنے دوستوں کا "استعمال" کرتے ہیں؟ کیا آپ اپنی "حقیر قوت" سے کام نکالا کرتے ہیں؟ یعنی اگر آپ صنف نازک سے ہیں تو کیا آپ منہ بسورتی ہیں۔ چلاتی ہیں یا سخت بیماری اور کسل کا بہانہ کرکے اپنا راستہ صاف کر لیتی ہیں اور اگر آپ صنف قوی سے ہیں تو کیا آپ اپنا کام نکالنے کے لئے ایسے ذلیل کام بھی کریں گے جو ایک مرد کے شایان شان نہ ہوں یا مکاری و چالاکی سے اپنی راہ نکال لینگے؟

(۷) کیا آپ بہادر ہیں:۔ بہادری سے میں میدان جنگ میں لڑنے سے مراد نہیں لونگا۔ بلکہ اخلاقی جرأت سے:۔

اگر آپ سے کوئی غلطی ہو جائے تو کیا آپ اُس کا اعتراف کر لیں گے یا اپنی بات پر اڑے رہیں گے اور لاحاصل براہیں دلائل دلائل سے اُسے درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے آگ بگولا ہو جائیں گے؟ اگر کوئی شخص غیر منصفانہ طور پر آپ سے بُرا سلوک کرے تو کیا آپ بہادری سے اُس کا مقابلہ کریں گے یا خفیہ طور پر سازش کی کھچڑی پکاتے رہیں گے؟ کیا آپ اس طریق پر زندگی

بسر کرتے ہیں جیسا آپ کا دل چاہتا ہے اور جس قدر آپ کی آمدنی ہے یا اُس طریق پر جس طرح شمیم کی امی اور سعید کا ابا، جو آپ کے ہمسایہ ہیں، آپ جیسی پوزیشن کے آدمی سے توقع رکھتے ہیں؟ اگر نہیں تو کیا آپ اپنے ہمسائیوں۔ اپنے رشتہ داروں اراکین بلدیہ یا ہم پیشہ لوگوں سے خائف ہیں؟ کیا آپ اُس وقت بستر استراحت پر چلے جاتے ہیں جس وقت سونے کو آپ کا دل چاہے یا اس خیال سے۔ میٹھے جمائیاں لیتے ہیں کہ مولانا "بے وقت" اٹھیں تو آرام کروں؟ کیا آپ کھاتے وہی ہیں جو آپ کا من چاہے اور اپنے مذاق کا پڑھنے اور تفریح میں مطابقت کرتے ہیں؟ یا آپ وہ کتب پڑھتے ہیں جو ذہنی اور دماغی اضمحلال کا باعث ہوں مگر اس لئے کہ وہ علامہ "رائج الوقت" کی تصنیف ہے۔ اور آپ کے ایک دوست پڑھنے کو دے گئے تھے؟ کیا آپ متحرک تصاویر کا تماشہ یا کسی سیاسی مدبر کا لیکچر سُننے اس لئے جاتے ہیں کہ وہ آپ کے مذاق کے مطابق ہیں یا اس لئے کہ آپ کے دوست وہاں لیجانے پر مصر ہیں؟ کیا آپ فیشن کے غلام اور کورانہ تقلید کا شکار ہیں؟

(۸) کیا آپ ہنرمند ہیں:۔ کیا آپ لوگوں کو ایسا کام کرنے پر مائل کر لیتے ہیں جیسی آپ کی خواہش ہو لیکن پھر بھی وہ خوشی یا مسرت کا اظہار کریں؟ کیا آپ اپنی بیوی کو ہر بات میں ایسے طریق پر رضامند کر لیتے ہیں کہ اُس کو آپ کی بے اعتنائی کا شمہ بھر وہم بھی نہ رہے؟ کیا آپ ایسے طریق پر لوگوں کے کپڑوں سامان آرائش۔ گھڑیوں۔ موٹر کاروں اور دیگر اشیا کی قیمت دریافت کر سکتے ہیں کہ اُن کو بُرا معلوم نہ ہو؟ اور کیا اسی طریق سے اوروں کو اپنی مملوکہ و مقبوضہ اشیاء کی قیمت بتا سکتے ہیں؟

(۹) کیا آپ صادق ہیں؟ کیا آپ کسی دوست کی نسبت گفتگو کرتے وقت کبھی اظہار تملق بھی کرتے ہیں؟ کیا آپ دوستوں کے عیوب و راز اُس وقت طشت از بام کر دیا کرتے ہیں۔ جب وہ آپ سے ناراض ہو گئے ہوں یا جب رشتۂ موانست منقطع ہو چکا ہو؟ کیا آپ اُس شخص کی مجلس میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں جس سے آپ کو دلی نفرت ہو مگر جس کے ہاں آپ کے مذاق کے مطابق سامان عیش و عشرت۔ فواکہات و میوہ جات اور قوت لایموت کا بہترین انتظام ہو اور آپ کو ہر چیز پر

دست قدرت حاصل ہو؟

(۱۰) کیا آپ سادگی پسند ہیں؟ کیا آپ فوق البھڑک لباس پہنتے ہیں۔ کیا مجلس وضع آئین میں جاتے وقت شوخ رنگ کی نکٹائی۔ جاذب توجہ واسکٹ اور نہایت شاندار کلاہ پہن کر جاتے ہیں یا ویسے کپڑے جب آپ فٹھی کے لئے جرابوں کا جوڑا خریدنے بازار گئے تھے؟ کیا آپ کا مکان۔ اُس کا سامان آرائش۔ آپ کا لباس۔ آپ کی موٹر کار۔ فٹن۔ لینڈو اور ملازمین کی "فوج" یا آپ کے اخراجات رفتہ مرتبہ آپ کی آمدنی کے تناسب ہیں؟ کیا آپ تیز خوشبویوں اور عطریات کا استعمال کیا کرتے ہیں؟ اور محض اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کی خاطر اپنی تقاریر میں گرانڈیل الفاظ اور غیر مانوس محاورات کا استعمال کرتے ہیں؟ کیا آپ اس بات کا فخریہ اظہار کرتے ہیں کہ آپ نے کبھی کوئی مخرب اخلاق فعل نہیں کیا یا برعکس اس کے دوسروں کے معائب وعیوب ظاہر کرکے مسرور ہوتے ہیں؟

(۱۱) کیا آپ صفائی پسند ہیں؟ کیا آپ اپنے بدن۔ ناخنوں۔ تاخنوں اور لباس کو صاف رکھتے ہیں۔ کیا آپ کا دل صاف ہے؟ کیا آپ رحم دلی کے نام سے ناآشنا ہیں یا برعکس اس کے ایسے سریع الاحساس ہیں کہ آپ کے دل پر ہر ایک بات رنج وغم کی گھٹا بن کر چھا جاتی ہے جس کا ایک تندرست دل کو احساس بھی نہ ہونا چاہیئے؟ کیا آپ سعدی۔ بھگت کبیر اور شکسپیئر کی کھری کھری باتوں سے ناراض ہو جاتے ہیں؟ کیا آپ صنف مقابل کا احترام بھی کرتے ہیں یعنی اگر آپ مرد ہیں تو عورتوں کا یا اگر عورت ہیں تو مردوں کا؟ کیا آپ کسی آدمی کے کندھے پر تھپکی دینا پسند کرتے ہیں جب کہ وہ ایک باعزت آدمی کے سامنے آپ کے اس فعل کو بد تہذیبی پر محمول کرتا ہو؟ کیا آپ کسی راہ چلتے دوست کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا کرتے ہیں "کہو دوست کدھر کا رُخ ہے"؟ اور کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی باتیں دوسرے کے لئے باعث خفت ہیں؟

(۱۲) کیا آپ خود پسند ہیں؟ کیا آپ ہر ایک بات یا ہر ایک آدمی میں نقص نکال لیتے ہیں؟ کیا آپ شاذ و نادر ہی کوئی ایسی کتاب۔ کھیل تماشہ یا آدمی دیکھتے ہیں جو آپ کے لئے باعث مسرت ہو سکے یا آپ کے مذاق کے مطابق ہو؟ کیا آپ

اس بات کے خواہش مند ہیں کہ لوگ آپ کو عام انسانوں سے "برتر" خیال کریں ؟

(۱۳) کیا آپ خوش مزاج ہیں ؟ کیا آپ ہمیشہ ناخوش ۔ چڑچڑا ۔ زود رنج اور تند مزاج رہتے ہیں یا قدرتی طور پر مہربان ہنس مکھ ۔ اور بشاش رہنے کی کوشش کرتے ہیں ؟

(۱۴) کیا آپ خود پرست ہیں ؟ کیا آپ کو اپنے حسن ۔ جوانی ۔ "پوزیشن" امارت اور دنیاوی کامیابی پر کسی قسم کا غرور ہے ؟ کیا آپ ہمیشہ اپنی نسبت ہی گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں ؟ یعنی جو کچھ لوگ آپ کی نسبت کہتے ہیں یا جو کچھ آپ خیال کرتے ہیں یا جو کچھ آپ کی ملکیت ہے ؟ کیا آپ ضرورت سے زیادہ اپنے بچوں اور ملازمین کا ذکر کرتے ہیں ؟ کیا ہر گفتگو میں آپ اپنی سیر و تفریح کا تذکرہ کرتے ہیں یا اُن مقامات کا جو آپ نے دوران سیاحت میں دیکھے تھے ؟ کیا آپ اُن مشاہیر عہد کا ذکر کرنا پسند کرتے ہیں جن سے آپ متعارف ہیں ۔ کیا آپ مشیخت کے طور پر اپنے کسی وزیر دوست یا گورنر ۔ یا کسی مصنف یا ایکٹر یا جج اور بیرسٹر کا تذکرہ کرنا پسند کرتے ہیں اور اس حالت میں کہ آپ اُن سے صرف ایک دفعہ ہی ملے تھے ؟ کیا آپ کی گفتگو کا جزو عظیم سفیروں شمس العلماء مہما پادریوں ۔ کروڑ پتیوں اور صاحب رسوخ آدمیوں کے ذکر از کار پر مشتمل ہوتا ہے ؟ جب آپ اخبار میں ایسی دعوت یا ایک ایسے وفد کا ذکر پڑھ رہے ہوں جس میں گورنر اور آپ شریک تھے تو کیا آپ غور سے دیکھتے ہیں کہ دیگر بڑے آدمیوں کی فہرست میں آپ کا نام بھی شائع ہوا ہے یا نہیں ؟

(۱۵) کیا آپ توہم پرست ہیں ؟ کیا آپ اس بات کے محتاط نہیں کہ سگریٹ پیتے وقت دیکھیں کہ "فینچی" کا منہ نیچے ہے یا اوپر ؟ کیا کسی کام کو شروع کرتے وقت چھینک کا آجانا آپ کے دل میں اُس کام کے حسن انجام کا خدشہ ڈال دیتا ہے ۔ کیا آپ نئے مکان میں داخل ہونے کے لئے یا سفر میں چلتے ہوئے مہورت تلاش کیا کرتے ہیں ؟ اگر آپ صنف لطیف سے ہیں اور خدانخواستہ آپکا کوئی بچہ تلف ہو جائے تو کیا آپ عورتوں کی ان باتوں پر دھیان دیتی ہیں جو آپکے

ایمان میں خلل ڈالیں۔ مثلاً کوئی کہتی ہے مسان کا دکھ ہے رمضان شاہ سے گرنت کراؤ۔ کوئی کہتی ہے مکان اچھا نہیں میر حلیم سے کلواؤ۔ کوئی کہتی ہے سفر میں آئی گئی ہو کوئی چڑیل لپٹ گئی ہے۔ بڈھے شاہ کی چوکی دو۔ کوئی کہتی ہے کوکھ کا خلل ہے مہر علی شاہ کا علاج کرو۔ کوئی کہتی ہے دُدھیر نظر ہے پورا ہے میں اونار رکھواؤ۔ گنڈے تعویذ۔ ٹونے۔ ٹوٹکے کراؤ۔ کیا آپ نے کبھی مرادوں کے برآنے کے لئے بیوی آس کا روزہ رکھا ہے؟ یا گھر میں کسی پیر پیغمبر کا گذر سمجھ کر وہاں چراغ جلائے یا پھول چڑھائے ہیں؟ کیا آپ پری۔ بھوت۔ دیو یا سایہ پر یقین رکھتی ہیں کیا آپ رمالوں۔ نجومیوں۔ پنڈتوں۔ اور رمالوں کے ہاں قسمت کے ستارے کی گردش دیکھنے جاتی ہیں اور کیا آپ اُن کی باتوں پر اعتماد کلی رکھتی ہیں؟ جو یہ لوگ آپ کی اور آپ کے متعلقین کی نسبت کہدیں؟ کیا آپ مولی کو صرف اس لئے "پتوں والی" کہکر پکارتی ہیں اور اُس کا اصلی نام نہیں لیتیں کہ یہ عموماً اُس گھر میں کھانے کیلئے ملتی ہے جہاں کوئی موت وقوع پذیر ہوئی ہو؟ کیا آپ چیل کو چیل کہتی ہیں یا "اونچ والی"؟

کیا آپ نمائش پسند ہیں؟ کیا آپ کے نزدیک معیار انسانیت "شہرت" اور "نام" پر ہے یا انسان کی ذاتی صفات پر؟ کیا اس بات کو فخر سمجھتے ہیں کہ کئی مالدار اور برسرِ حکومت آدمیوں کو آپ جانتے ہیں؟ کیا آپ اپنے خاندان پر فخر کرتے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی اس بات کو بڑے تحکم سے بیان کیا ہے کہ آپ کا چچا عدالت عالیہ کا جج یا آپ کا بھانجہ بینکر یا آپ کے ماموں فلمدان وزارت سنبھالے ہوئے ہیں؟ کیا آپ اس قسم کی شیخت کی باتیں ادنےٰ درجہ کے لوگوں اور متوسط الحال شرفا کے سامنے بیان کرتے ہیں؟ یا برعکس اس کے آپ سرمایہ داروں۔ برسرِ اقتدار لوگوں۔ قوم پرستوں اور ماڈریٹوں کو بُرا جانتے ہیں؟ کیا آپ اس بات کو زور سے بیان کریں گے کہ آپ کے چچا کے پاس شہر میں سب سے قیمتی گھوڑی یا نایاب موٹر کار ہے؟ کیا آپ یہ بھی بیان کریں گے کہ آپ کے لاولد کروڑپتی ماموں نے آپ کو متبنّٰی بنا لینے کا ارادہ کیا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے؟ کیا آپ یہ بیان کرنا پسند کریں گے کہ موجودہ سیاسی دَور کا ایک

بڑا لیڈر آپ کی والدہ کا رشتہ دار ہے۔ یا کل آپ کے والد کمشنر صاحب کے ہمراہ کوئی نمائش یا میلہ دیکھنے گئے تھے؟

(۱۷) کیا آپ بلند ہمت ہیں؟ کیا آپ اُس وقت خفیف ہو جاتے ہیں۔ جب کرکٹ ٹینس۔ شطرنج یا گنجفہ کی بازی آپ کے حق میں مات ہوگئی ہو یا اس وقت مسرت سے اُچھل پڑتے ہیں جب آپ نے بازی جیت لی ہو؟ جب آپ کو کسی بیوپار میں نقصان ہو۔ جب آپ کا مدمقابل بلدیہ کا بنیہ وزارت کے انتخاب میں کامیاب ہوگیا ہو۔ جب کسی انعامی مقابلہ میں آپ کا حریف بازی لے گیا ہو۔ جب آپ اُس وقت پلیٹ فارم پر پہنچے ہوں جب گاڑی اسی وقت متحرک ہوئی ہو یا جب کسی مجلس میں آپ داعیان کی توجہ کا مرکز نہ بنے ہوں جبکہ آپ کا حق تھا اور جس سے آپ کو دلی صدمہ پہنچا ہو تو کیا آپ ان تمام مواقع پر فرخندہ مزاجی اور پُر تبسم ہونٹوں سے گفتگو کریں گے؟

(۱۸) کیا آپ حاسد ہیں؟ کیا آپ اپنے عزیز ترین دوست کی ترقی مناصب و درجات اعزازی پر سرفرازی سے دل میں جلتے ہیں؟ ہر ایک آدمی ستم رسیدہ اور مظلوم سے ہمدردی رکھتا ہے لیکن کیا آپ اسی ہمدردی سے اپنے اُس غریب ہمسایہ یا غریب رشتہ دار کو دیکھیں گے جو کل تک تو آپ کا دست نگر تھا لیکن آج خلاف توقع ایک امیر کبیر بن گیا ہو؟ اگر آپ عورت ہیں تو کیا آپ نے کسی کے قیمتی زیور پر حسد کیا ہے۔ یا اگر حامد کی بیوی حسن اور سیرت میں بے مثال ہے اور تم سے کئی درجہ خوبصورت تو کیا اُس کی نسبت تم ویسے ہی الفاظ میں ذکر کروگی جس طرح اپنی غریب ہمسائی جنو کی نسبت؟ کیا تم حسین لڑکیوں سے اس لئے متنفر ہو کہ تمہاری اپنی شکل بھونڈی ہے؟

(۱۹) کیا آپ ضرورت سے زیادہ مدد دیں؟ کیا آپ ہر شخص کو اپنی رائے دینے یا نصیحت کرنے کے خواہشمند ہیں؟ جب آپ سے ایسی باتوں کی درخواست نہ کی گئی ہو؟ کیا آپ بیمار آدمیوں کو اکثر ایسی ادویات کے نام بتلاتے ہیں جو آپ کے خیال میں اُن کے لئے فائدہ مند ہوں گی۔ حالانکہ آپ طبیب نہیں ہیں؟ کیا آپ لوگوں کی بھلائی کے لئے انہیں مختلف قسم کی تجاویز بتلاتے رہتے ہیں؟

کیا آپ جمہور کو بتلاتے ہیں کہ انہیں کیا کھانا اور کیا پہننا چاہیئے؟ کیا آپ آدمیوں کو سلیم الفطرت بنانے میں کوشاں رہتے ہیں؟ کیا آپ عام لوگوں کو بیوقوف کہتے ہیں؟ کیا آپ دوسرے لوگوں کی صرف نحو کی غلطیاں صحیح کرتے ہیں اور ان کا تلفظ درست کرنے کے عادی ہیں؟ کیا آپ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ انہیں فلاں قسم کی کتب پڑھنا چاہئیں؟

(۲۰) کیا آپ دُور اندیش ہیں؟ کیا آپ اس بات کا اعادہ کر دیتے ہیں جو راز سمجھ کر کہی گئی ہو؟ کیا آپ محض شناسائوں سے بھی نہایت ضروری خانگی امورات کا ذکر کر دیا کرتے ہیں؟ کیا آپ ناواقف آدمیوں سے بھی اپنے کاروبار یا دفتر کے راز بیان کر دیتے ہیں؟ کیا آپ ان افواہوں کو پھیلاتے ہیں جو آپ نے سُنی ہوں اور جو ممکن ہے بے بنیاد ہوں؟ کیا آپ لوگوں کی غیر حاضری میں ویسی گفتگو کرتے ہیں جیسی اُن کی موجودگی میں کرنے کا آپ کو موصلہ نہ پڑے۔ کیا آپ نے کبھی گمنام چٹھی لکھی ہے؟

(۲۱) کیا آپ ذکی الحس ہیں؟ کیا آپ ہر بات کو نہایت بُری طرح محسوس کرتے ہیں؟ کیا آپ ہر بات کو اس طور پر محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی حساسیت دوسروں کے لئے باعث رنج ہو؟ کیا آپ کا مزاج ایسا ہے کہ کسی کو کچھ کہنے کی جرأت ہی نہ پڑے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ تمام دنیا آپ کے برخلاف ہے؟ کیا آپ ہمیشہ اپنے آپ کو ملامت کرتے ہیں کہ آپ کا کوئی دوست نہیں۔ آپ کا کوئی ہمدرد نہیں یا آپ ایسے غریب ہیں یا آپ ہر بات میں ناکام رہتے ہیں یا اس کے بالکل برعکس؟ کیا آپ ذرا سی خلاف مزاج بات ہو جانے پر آگ بھبوکا ہو جاتے ہیں؟

(۲۲) کیا آپ وفادار ہیں؟ کیا آپ کا دوست ہر حال میں آپ پر یقین رکھتا ہے؟ کیا آپ اُس کی غیر حاضری میں اُس کی طرفداری کریں گے اگر اُس کے برخلاف الف کوئی ناواجب بات کہہ رہا ہو؟ کیا آپ اُس کے پس پشت نہایت زوردار الفاظ میں اُس کی تعریف کرتے ہیں یا اُس کے رُوبرو؟ کیا آپ اپنے خاوند یا بیوی کے وفادار ہیں؟ کیا آپ اُس بات میں حصہ لینے سے محترز رہیں گے جو آپ کے ملک کے لئے باعث نقصان ہو؟ کیا آپ اپنے ملک

کے معاملات میں ایسی دلچسپی لیتے ہیں کہ آپ کو ایک وفادار شہری کہا جائے؟

اِن بائیس تجربات سے اگر ہمیں معلوم ہو گیا ہو کہ ہمارے "کیرکٹر" میں کوئی نقص ہے تو ہمیں پست حوصلہ نہ ہونا چاہیئے۔ اگر ہم کسی بات میں خام ہوں تو ہمیں وہ کمی پوری کرنے کے لئے ہر قسم کی مساعی جمیلہ سے کام لینا چاہیئے اور اگر ہم اُس میں پورے اتریں تو اپنی نیک صفات و عادات کو لوگوں کے لئے ایک نمونہ بنانا چاہیئے۔ سالہا سال گذرے یونانِ قدیم کی خاک سے ایک شخص پیدا ہوا تھا جس نے اپنے ہمقوموں کو ایک نصیحت کی تھی جس پر ہم بھی آج عمل پیرا ہو کر منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں، اور وہ صرف تین الفاظ تھے۔ "اپنا آپ جانو"!!

(ہمایوں)

شاعری و نفسیات

(جناب مرزا محمد سعید صاحب ایم اے۔ آئی ای ایس)

انسان کے قوائے روحانیہ اور اُن کے افعال کا مطالعہ علم النفس کا خاص موضوع ہے اور چونکہ شاعری انسانی دماغ کے بعض اعمال کا ماحصل ہے۔ اس لئے شعر کی ماہیت بھی نفسیات کے دائرہ میں شامل ہے۔ اس ماہیت کے مطالعہ کے متعلق پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ آیا شاعری تصنیف و تالیف کے دیگر انواع مثلاً مضمون نگاری سے بجائے ذہنی صفات کے بالکل مختلف شے ہے۔ یا یہ کہ ہر قسم کی تصنیف و تالیف ایک ہی قسم کے وظائفِ نفسانیہ کا اثر و نتیجہ ہیں۔ علم النفس کے عالموں کی کثرت رائے اس جانب معلوم ہوتی ہے۔ کہ اگرچہ بعض ذہنی صفات ایسی ہیں۔ جو ہر قسم کی انسانی تحریر و تقریر کے لئے مشترک ہیں۔ تاہم شاعری دیگر انواع تصنیف سے نہ صرف فی نفسہٖ مختلف ہے۔ بلکہ اُس کی بنیاد بعض ایسے اعمال روحانی پر ہے جو شعر ہی کے لئے خاص ہیں۔ اور جن کا وجود دماغ کے دیگر نتائج مثلاً ریاضیات میں یا تو بالکل مفقود ہے یا اُس درجہ، اُس شکل میں موجود نہیں۔ جس درجہ اور جس شکل میں ہم اس کو شاعری میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس رائے کو تسلیم کرنے سے پیشتر یہ جاننا ضروری ہے۔ کہ جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں وہ شعر کے مفہوم کو اس کے متعارف معنوں سے بہت زیادہ وسعت دیدیتے ہیں۔ اور جہانتک اُن کی بحث کا تعلق ہے۔ شعر صرف کلام موزون ہی کا نام نہیں۔ بلکہ وہ انسان کے قول و فعل کے اس جزو کا نام ہے۔ جو ہمارے احساس حسن کو تیز کر دیتا ہے۔ ان وسیع معنوں میں نہ صرف کلام موزون بلکہ کلام غیر موزون اور کلام کے علاوہ ہر قسم کے اور فنون۔ مثلاً موسیقی۔ مصوری۔ اور سنگتراشی۔ حتی کہ ریاضیات بھی اپنے میں کچھ نہ کچھ شعریت رکھتے ہیں۔ صرف فرق اتنا ہے۔ کہ شعر میں موزون الفاظ کو احساس حسن کا محرک بنایا جاتا ہے۔ اور شاعری کی دوسری اقسام۔ موسیقی۔ مصوری۔ وغیرہ میں اور اشیاء مثلاً اصوات۔ الوان وغیرہ کو۔ لیکن اگر ہم شاعری اور شعر کو اس وسیع مفہوم میں استعمال کریں تو درحقیقت یہ ایک لفظی بحث رہ جاتی ہے۔ کیونکہ اگر ہم لفظ شعر کی جگہ لفظ تخیل کو اس موضوع میں استعمال کریں۔ تو مندرجہ بالا رائے کی صداقت سے شاید ہی کسی کو انکار

ہو سکے۔ لیکن شعر کے مفہوم کو اس قدر وسعت دینے میں کوئی فائدہ نہیں۔ اسلئے جہاں تک اس مختصر مضمون کا تعلق ہے۔ شاعری و شعر کو قریب قریب اسی معنی میں لیا جائیگا۔ جو عام طور پر معروف ہیں۔ لہذا اب جو سوال ہمیں درپیش ہے۔ وہ یہ ہے کہ آیا علم النفس کی رو سے۔ کسی ایسے اعمال ذہنی کا پتہ چلتا ہے۔ کہ جو شعر کے لئے مخصوص ہوں۔ میرے خیال میں اس سوال کا مثبت جواب دینے میں چنداں تامل نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص شاعر بننے کی اہلیت نہیں رکھتا اور نہ ہر شاعر اپنے خاص فن کے علاوہ کوئی ایسی ذہنی قابلیت رکھتا ہے۔ یہ حقائق جو ہمارے مشاہدہ میں روزمرہ آتے رہتے ہیں ہمیں اس بات کے تسلیم کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ کہ شاعری کا مدار دماغ کی عام استعداد پر نہیں۔ بلکہ خاص قوای کی کمی یا زیادتی پر ہے۔ ان قوای کا تعین البتہ ایک مشکل کام ہے۔ کیونکہ قوائے ذہنی ایک دوسرے کے ساتھ اس طور پر وابستہ ہیں۔ کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا بہت دقت نظر ہی سے ممکن ہے۔ بہرحال اتنا تو وثوق کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ شاعری زیادہ تر تاثرات و جذبات سے واسطہ رکھتی ہے۔ خیالات کے منطقی ربط سے اُسے چنداں سروکار نہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں۔ کہ شاعری قوانین استدلال سے بالکل آزاد ہے۔ اگر ایسا ہو۔ تو شاعری کو مجنون کے ہذیان سے تمیز کرنے کے لئے کوئی معیار باقی نہ رہیگا اور اگرچہ بعض شاعری اس قسم کی ضرور موجود ہے۔ کہ جس کے اور ہذیان کے درمیان شائد ہی کوئی باریک فرق ہو۔ لیکن پختہ کار اساتذۂ شعراء کا کلام عموماً اس ہذیانی صفت سے پاک ہوتا ہے۔ اور جہاں وہ ایک جانب تخیلات کو حرکت میں لاتا ہے۔ تو دوسری جانب قوت استدلال کو بھی مطمئن کر دیتا ہے۔ لیکن شاعری کو خیالات و تصورات کے استدلالی تسلسل سے اتنا تعلق نہیں ہوتا۔ جتنا اُن کی سعت سے جو ہمارے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ ہر ایک خیال خاص صورتوں میں جذبات کا مرکز بن سکتا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ "ایک" کو لیجئے۔ جو ابتداءً گنتی کی ایک اصطلاح ہے۔ جو کسی منفرد شے کو ظاہر کرنے کے لئے ریاضی نے وضع کر لی ہے۔ لیکن یہی لفظ "ایک" جب ذات باری کے ساتھ منسوب ہو جاتا ہے۔ تو توحید اور جو جذبات کہ اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کا منبع اور ماخذ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ محض اُس لفظ کی مختصر شکل یعنی (۱) کا تصور بعض لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کی وجدانی کیفیات پیدا کر سکتا ہے۔ شاعر لفظوں کی اس قوت سے واقف ہو کر

اُن کو اپنے پیرایہ میں استعمال کرتا ہے۔ کہ وہ ہمارے جذبات میں تموج پیدا کر سکیں۔ اور بعض وقت نتیجہ پیدا کرنے کے لئے شاعر کو یہ ضرورت پیش آتی ہے۔ کہ وہ خوشنما تصورات سے کم از کم اتنا سکون پیدا کر دے۔ کہ قوت استدلال جذبات کے راستہ میں حائل نہ ہو۔ اور تھوڑی دیر کے لئے تصورات کو اُس خوشگوار بے ربط تسلسل میں آنے دے جو واقعیت سے زیادہ عالم رویا میں مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

بعض شعر باوجود واقعیت اور استدلال سے دور ہونے کے بھی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً داغ کا شعر ہے۔ کہ ؎

یہ بات کیا دم رفتار ہوتی آتی ہے
کہ اپنے سایہ سے تکرار ہوتی آتی ہے

عقلی طور پر یہ اعتراض اس شعر پر وارد ہو سکتا ہے۔ کہ سایہ سے تکرار معشوقانہ انداز نہیں بلکہ مجنونانہ حرکت ہے۔ اور عقل اُسکو قبول نہیں کرتی۔ کہ یہ فعل معشوق سے منسوب کیا جائے۔ لیکن ارباب ذوق میں شاید ہی کوئی ایسا ہو۔ جو اس شعر کی داد دینے میں مضائقہ کرے۔ بعض وقت قوت استدلال کا یہ عارضی سکون۔ جو کیفیت شعر کے لئے ضروری ہے۔ محض اس سے حاصل ہو جاتا ہے۔ کہ شعر کے الفاظ اس قسم کے ہوں جو کانوں کو بھلے معلوم ہوں۔ اور بڑے شاعر ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں۔ کہ بندش و انتخاب الفاظ میں خشن اور کرخت لفظوں کے اجتماع سے پرہیز کریں۔ یہ بھی عام مشاہدہ کی بات ہے۔ کہ معمولی سی غزل بھی اگر لے میں پڑھی جائے تو رنگین ہو جاتی ہے۔ اور لوگ اس کی داد دینے لگتے ہیں۔ لیکن اگر وہی غزل تحت اللفظ پڑھی جائے۔ تو کوئی لطف باقی نہیں رہتا۔ عرب کے مشہور ادیب ابو تمام کا مقولہ ہے۔ کہ "ترنم وہ میدان ہے کہ جسمیں شعر دوڑتے ہیں" مولوی حالی مرحوم نے یہ قول پسندیدگی کے ساتھ اپنے دیوان کے مقدمہ الاردو بیاچہ میں نقل کیا ہے۔ لیکن اسکی تحقیق کی کوشش نہیں کی۔ اصل میں یہ مقولہ حکمت و حقیقت سے پُر ہے۔ کیونکہ ترنم یا آہستہ آواز سے گانے کا یہ اثر ہے۔ کہ دماغ پر ایک حالت سکون طاری ہو جاتی ہے۔ اور اس نیم غنودگی کی حالت میں تخیلات دماغ کی تہ میں سے اُبھر کر سطح تک آتے ہیں۔ اور لفظوں کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ نیز ترنم سے الفاظ کو موزون کرنے میں بھی آسانی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ علم عروض

وعلم موسیقی ہیں جو قریب کا تعلق ہے۔ وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔

ابو تمام کا یہ مقولہ اس حقیقت کی جانب ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ کہ دماغ کی اس جدو جہد کے علاوہ جو اس سے بیداری میں ظاہر ہوتی ہے۔ کوئی اور فعل بھی ہے جو نیند اور اُسکے مماثل حالتوں میں جاری رہتا ہے۔ ہر شخص یہ تجربہ کرسکتا ہے۔ کہ اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے ماحول سے خالی الذہن ہوکر اپنی تو کو کسی خاص چیز یا خاص خیال پر جمنے نہ دے۔ بلکہ خیالات کی رو کو اپنے طور پر بہنے دے تو بہت سے ایسے تصورات کہ جو عالم بیداری میں شاید ہی کسی وقت اس کے پیش نظر رہتے ہوں ایک عجیب بے قاعدگی کے ساتھ نمودار ہوکر چلتی چلاتی تصویروں کے مانند اپنا تماشہ دکھانے لگتے بعض وقت یہ تصورات اُن اشیاء یا خیالات کے متمثل بنجاتے ہیں۔ جو اُس شخص کے علم میں ہوتی ہیں۔ لیکن اکثر مرتبہ وہ دماغ کے اُن تجربات سے علاقہ رکھتے ہیں۔ کہ جن کا اس کو خود بھی پوری طرح علم نہیں ہوتا۔ یہی حالت عالم خواب کی ہے۔ اور دماغ کی بعض غیر معمولی کیفیات میں بھی یہ امر مشاہدہ کیا گیا ہے۔ کہ جو باتیں معمولی طور پر انسان کے حافظہ سے محو ہوچکی ہوتی ہیں۔ وہ پھر عود کر آتی ہیں۔ ان سب واقعات سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اُن وظائف ذہنیہ کے علاوہ کہ جن سے انسان باخبر اور آگاہ رہتا ہے۔ دماغ اپنا بہت سا کام عالم بیخبری میں کرتا رہتا ہے۔ جس سے ہم عموماً آگاہ نہیں ہوتے۔ لیکن خاص حالتوں میں آگاہ ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ سمجھنا چاہئے کہ ایک پردہ ہے۔ جس پر طرح طرح کے نقش و نگار ہیں۔ اور جس کے مقابل ایک چراغ ہے۔ کہ جو اپنی روشنی اُس پردہ پر ڈال رہا ہے ہوا کے جھونکے آتے ہیں۔ اور اُس پردہ کی ہموار سطح پر تموج پیدا کردیتے ہیں۔ جسکی وجہ سے چراغ کی روشنی پردہ کے ہر ایک حصہ پر یکساں نہیں پڑتی۔ بلکہ بعض نقش و نگار معمول سے زیادہ ابھر آتے ہیں۔ اور بعض اسقدر تاریک ہوجاتے ہیں۔ کہ نظر بھی نہیں آتے۔ یہ منقش پردہ انسان کے تصورات و خیالات و محسوسات کا مجموعہ ہے۔ جسکو بعض اوقات دماغ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن جس کے لئے عربی لفظ نفس یا روح زیادہ موزون معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ان غیر مادی اشیاء کو مادی دماغ سے تمیز کرنا ضروری ہے۔ جو صرف چند رگوں اور پٹھوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور مضغۂ گوشت سے زیادہ کچھ نہیں۔ چراغ

انسان کی توجہ ہے۔ جو بعض تصورات ۔ خیالات ۔ حسیات کو بعض سے زیادہ نمایاں کر دیتی ہے ۔ اور ہوا کے جھونکے ذوق و خواہش کے وہ جذبات ہیں ۔ کہ جنکی وجہ سے کوئی شے یا خیال ایک وقت خاص کے لئے ہماری توجہ کا مرکز بنجاتا ہے ۔

دماغ کے اس غیر معلوم حصہ کا مطالعہ بجائے خود بہت مفید اور دلچسپ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ کہ زمانۂ آئندہ میں نفسیات کے ماہرین کا بڑا کام اسی خطہ کیمتعلق تجسس تھا ۔ لیکن ہمارے لئے اس وقت صرف اس قدر جاننا کافی ہے ۔ کہ یہ غیر معلوم حصہ کوئی معین حدود نہیں رکھتا ۔ بلکہ اس کی وسعت میں ہر لحظہ کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے ۔ ممکن ہے کہ کوئی خیال جو اس وقت روشنی میں ہے ۔ تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں چلا جائے ۔ اور کوئی دوسرا خیال جو ایک مدت سے دماغ کے دور افتادہ مقامات کی سیر کر رہا تھا ۔ صف اول میں جگہ پائے ۔ بعض دماغی امراض بعض دواؤں قلب انسانی کی بعض کیفیات ان پوشیدہ خیالات کو قوی بنا دیتی ہیں ۔ اور وہ اپنی ہستی کو مختلف صورتوں سے ظاہر کرنے لگتے ہیں ۔ زمانہ حال کی تحقیق سے اس حیرتناک حقیقت کا انکشاف ہوا ہے ۔ کہ انسان کی زندگی کئی وجوہ سے ان غیر معلوم خیالات کے رحم پر منحصر ہے ۔ اور جنون کے بعض اقسام اور اسکے مماثل امراض مثلاً مراق ۔ ہسٹریا وغیرہ بیشتر ان خیالات کے دماغ پر محیط ہو جانے سے پیدا ہوتے ہیں ۔ لیکن دماغ کا یہ تاریک خطہ جہاں بہت سی خرابیوں کا منبع ہے ۔ وہاں بہت سی خوبیوں کا بھی سرچشمہ ہے ۔ اسی میں وہ خوبصورت تصورات اور خوشنما تخیلات جمع رہتے ہیں ۔ جن کو شاعر الفاظ کا جامہ پہنا کر ذوق سخن سے داد لیتا ہے ۔ اور جنکو موسیقی دان خوشگوار اصوات کے سلسلہ میں منسلک کر کے سامعہ کے لئے لذت کے سامان پیدا کرتا ہے ۔ مصور کی تصویریں ۔ اور سنگتراش کے اصنام اس مقام پر جنم لیتے ہیں ۔ بہت سے اعتقادات و اشارات جن پر مذہب کا مدار ہے ۔ دماغ کے اسی گوشے میں رہتے ہیں اور وہاں سے اپنا پرتو ہمارے عمل و یقین پر ڈالتے ہیں ۔ غرضیکہ اس مخفی عالم میں قسم قسم کے نیرنگ و عجائبات دکھائی دیتے ہیں ۔ اور اس کی سیر علم النفس کے شائقین کے لئے ایک نہایت دلچسپ مشغلہ ہے ۔ قدیم الایام سے مراقبہ و احتساب نفس کو باطنی تزکیہ کے لئے ضروری خیال کیا جاتا رہا ہے ۔ اور اس قسم کے اقوال کہ من عرف نفسہ

فقد عرف ربہٗ" روحانیات میں ہمیشہ مستند سمجھے گئے ہیں۔ یہ جملہ عقائد دماغ کے ان اسرار سے جو اس وقت زیر بحث ہیں کم وبیش آگاہی کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ عرفی کا یہ شعر اس کے حقیقت شناس ہونے کا کافی ثبوت ہے۔

سر روحانیاں داری دلے خود را ندیدستی بخواب خود در آتا قبلۂ روحانیاں بینی"

افسوس کہ ہمیں اس وقت اس دلچسپ عالم کی سیر کرنیکی فرصت نہیں ہے ممکن ہے۔ کہ پھر کبھی آنا ہو۔ فی الحال اس مختصر مضمون کو ختم کرنے کے لئے چند سطروں کا اضافہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ غالباً یہ دعوے بیجا نہ ہوگا۔ کہ غیر معلوم خیالات وتصورات کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد شعر کے ذہنی ماخذ کو معلوم کرنے میں کسی قدر آسانی ہو جاتی ہے۔ اور یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ شاعری اور دوسرے دماغی کاموں مثلاً ریاضی اور منطق سے ایک تو اس وجہ سے متمیز ہے۔ کہ اس میں ان مخفی خیالات وتصورات کو ان کاموں کی نسبت زیادہ دخل ہے۔ اور یہ بہت بڑی وجہ تمیز ہے۔ جس پر شعرا ہمیشہ فخریہ پیرایہ میں یہ کہتے آئے ہیں۔ کہ شاعری جزو لیست از پیغمبری اور "الشعراء تلامیذ الرحمن" لیکن یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ کہ شاعری تمام وکمال اسی نوع کے تصورات کا نتیجہ ہے۔ شاعری کے اعلےٰ مدارج دیگر قوائے ذہنیہ مثلاً فہم ادراک و استدلال کے ایسے ہی محتاج ہیں جیسے کہ دماغ کے اور کام۔ محض غیر معلوم خیالات کا خزانہ دماغ میں رکھنے سے کوئی شخص شاعر نہیں بن سکتا۔ بلکہ بسا اوقات اس قسم کے خوشنما تصورات کی موجودگی ایسے شخص کے لئے جو اسکو نظم کرنے کی لیاقت واستعداد نہ رکھتا ہو۔ کئی قسم کی دماغی اور اخلاقی خرابیوں کا سامان پیدا کر دیتی ہے ؛

(ہمایوں)

جاپان اور اہلِ جاپان

(سید راس مسعود بی۔ اے۔ آکسن صدر ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن)

دنیا کے نقشے پر جاپان کی شکل دیکھئے تو یہ مثال بہت صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کہ جاپان ایک پانی میں ڈوبے ہوئے پہاڑ کی چوٹی ہے۔ جو سمندر کی سطح سے اُبھر آئی ہے۔ یہ ملک چونکہ تین ہزار سے زائد جزیروں پر مشتمل ہے۔ اس لئے وہ درحقیقت ایک مجمع الجزائر ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ آتش فشاں مادوں کی قوتیں خاص کر اس ملک کا باعثِ وجود ہوئیں۔ اور یہ قوتیں اب بھی کچھ کم نمایاں نہیں ہیں۔ دوسو کے قریب آتش فشاں پہاڑ اس وقت اس ملک میں موجود ہیں۔ جن میں سے پچاس کے قریب کم و بیش مشتعل حالت میں رہتے ہیں۔ اس قدر آتشیں پہاڑوں کے موجود ہونے کا خوف ناک نتیجہ جانوں کے اس شدید نقصان سے ظاہر ہوتا ہے۔ جس کا تذکرہ اس ملک کی قدیم تاریخوں میں بکثرت آیا ہے۔ زمانہ حال میں بھی یعنی ۱۸۸۴ء سے ۱۹۰۵ء تک اس ملک میں (۳۰۶۸۰) زلزلوں سے کم نہیں آئے ہیں۔ گویا فی یوم چار زلزلوں کا اوسط نکلتا ہے۔ جو بہت زیادہ ہے۔ اس ملک میں پہنچتے ہی کچھ دنوں بعد مجھکو بھی بدقسمتی سے ایک زلزلہ دیکھنا پڑا جو گزشتہ بیس برس کے زلزلوں میں سب سے زیادہ سخت تھا۔ اس زلزلے میں مکانوں کو گرتے ہوئے۔ اور آدمیوں کو ان میں دب کر مرتے ہوئے دیکھ کر جو قطعی مجبوری اور بے بسی مجھ کو محسوس ہوئی تھی۔ اس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا +

لیکن ان آتشیں پہاڑوں نے باوجود کہ اُن سے متواتر جانوں کا نقصان ہوتا رہتا ہے۔ ملک کو طرح طرح سے مالا مال بھی کر دیا ہے۔ مثلاً انہوں نے کبریتی اور معدنی چشمے جو مختلف طبّی تاثیرات رکھتے ہیں۔ ملک میں اس کثرت سے پیدا کر دئے ہیں۔ کہ آبی علاج میں جاپان کا دنیا کے تمام

ملکوں پر عنقریب سبقت لے جانا بالکل ممکن ہے۔ ماسوا اس کے ان پہاڑوں کی راکھ اور مٹی ملک کی زمین کو جو پہلے ہی سے سیر حاصل ہے۔ بہت قوت بخشی ہے۔ اور اس طرح سے تمام ملک کی زرخیزی میں ترقی ہوئی ہے جس پر قوم کے زیادہ تر حصے کا قطعی انحصار اپنے گزارے کے لئے ہے +

اس کے علاوہ ملک میں کثرت سے دھاتیں اور معدنیات۔ مثلاً سونا چاندی تانبا، سیسہ، قلعی، لوہا ہمٹی کا تیل اور پتھر کا کوئلہ موجود ہیں پتھر کے کوئلہ کا ذخیرہ زمین میں اس کثرت سے پھیلا ہوا ہے۔ کہ غیر ملکوں کے تقریباً کل جہاز جو جاپان سے گزرتے ہیں وہ اس کے بندرگاہوں میں ٹھہر کر کوئلہ بھرتے ہیں۔ اور یہ باشندگان جاپان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے اور بحیرے بھی جو جاپان کے گرد موجود ہیں۔ وہ قوم کے لئے خوراک کا ایک لازوال ذخیرہ پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ ان میں انسان کی غذا کے لائق بہتر سے بہتر قسم کی مچھلیاں بکثرت ہوتی ہیں جو اُبلے ہوئے چاولوں کے ساتھ جاپانیوں کی عام غذا ہیں +

رقبہ میں جاپان خاص تقریباً (۱۴۲۰۰۰) مربع میل ہے۔ اور اخیر مردم شماری کے مطابق جو ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء کی آدھی رات کو عمل میں آئی اس کی آبادی (۵۵۹۶۳۴۰) تھی مجموعی آبادی کل سلطنت جاپان کی جس میں کوریا، فارموزہ، جزائر سگالین وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ (۷۷۰۰۵۵۱۰) تھی۔ پس اگر مقابلہ کیا جائے تو جاپان خاص کا رقبہ ممالک محروسۂ سرکار عالی کے دو چند رقبے سے بہت کم اور باشندگان کی تعداد یہاں کے باشندوں کی تعداد سے چہار چند سے زیادہ ہوتی ہے +

تاریخ جاپان کا مطالعہ کرنے سے مجھکو بعض باتیں انگلستان اور جاپان میں بہت مشابہ معلوم ہوئیں۔ ایشیا کے نقشے پر جاپان کا موقعہ یورپ کے نقشہ پر جزائر برطانیہ کے موقع سے بہت سی خصوصیات میں ملتا جلتا ہے۔ اس کے علاوہ جس طرح جزائر برطانیہ کے سرد موسم میں "موج حارہ" کے گزرنے سے کسی قدر گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جاپان کے سرد موسم میں کوروشی دورسیاہ موج) کے گزرنے سے کسی قدر اعتدال آجاتا ہے۔ یہ موج خط استوا کے قریب بحرالکاہل میں باد تجارت کے اٹھنے پر پیدا ہوتی ہے۔ تاریخی اعتبار

جب سے ان کی سلطنت کی بنیاد پڑی ہے۔ آج تک ایک ہی طریقے سے برقرار چلی آتی ہے +

اس کے بعد جو ترقیاں جاپان کی تاریخ میں ہوئیں ان کے سمجھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ جاپانی اپنے شہنشاہ کو صرف بادشاہِ وقت ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان کا یقین ہے۔ کہ ہمارا شہنشاہ ایک زندہ خدا ہے۔ برخلاف موجودہ اقوام یورپ کے جاپانیوں کے دل میں اپنے شہنشاہ کی عظمت اس درجہ متمکن ہے۔ کہ وہ کبھی اس کا چہرہ اپنے سکّوں یا ڈاک کے ٹکٹوں پر بنانا جائز نہیں سمجھ سکے۔ چونکہ یہ چیزیں برتنے سے بگڑتی اور خراب ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے اگر ان پر شہنشاہ کی مورت بنائی جائے۔ تو وہ اسکو سخت بے ادبی بلکہ توہین مذہب خیال کریں۔ نیز دریافت ہوتا ہے۔ کہ ۱۸۶۸ء تک شہنشاہ کی تصویر کھینچنے یا اس کو بے نقاب کرنے کے بارے میں ایک قانون جاری تھا۔ اس قسم کی تمام تصویریں ممنوع تھیں۔ اور جو شخص شہنشاہ کی تصویر کو منظرِ عام پر رکھتا تھا۔ اس کو اس جرم کی پاداش میں سزائے موت دی جاتی تھی اب تک یہ حال ہے۔ کہ گو شہنشاہ کے فوٹو گراف فروخت کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ مگر ان کی تصویر کو کھلا رکھنا قوم کے مذاق کے بالکل خلاف ہے۔ لوگ ہمیشہ شہنشاہ کی تصویر کو ہر جگہ یہاں تک کہ دکانوں میں بھی کاغذ یا کپڑے کے غلاف میں رکھتے ہیں +

شہنشاہ کی تقدیس و تعظیم کا ثبوت میرے علم میں اس واقعے سے بڑھکر جو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ کہیں نہیں ملتا زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ ایک مرتبہ ایک مدرسہ میں دفعتاً آگ لگی اور شعلے اٹھنے شروع ہوئے۔ مدرسہ کا ایک لڑکا ان شعلوں میں گھس کر دوڑتا ہوا صدر مدرس کے کمرے میں آیا۔ یہاں جیسا کہ جاپان کے مدرسوں میں دستور ہے۔ شہنشاہ کی تصویر لگی تھی۔ لڑکے نے یہ دیکھکر کہ تصویر کو معہ چوکھٹے کے صحیح و سلامت لے جانا اب ممکن نہیں فوراً چوکھٹے میں سے تصویر نکالی اور اپنا پیٹ چاک کرکے اس کو اندر رکھ لیا۔ اور اس حال میں دوڑ کر باہر نکلنا چاہا۔ مگر اب آگ بہت

تیز ہوگئی تھی لڑکا کچھ دور بڑھا تھا۔ کہ وہیں جل کر ختم ہوگیا۔ فوراً لوگوں نے اس کی نعش باہر نکال کر اس کے شکم سے تصویر نکالی جو بجز اس کے کہ کسی قدر مڑ تڑ گئی تھی باقی بالکل صحیح حالت میں نکلی +

جاپانی اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ کوئی ان کے شہنشاہ کو ایسے مقام سے دیکھے جو شہنشاہ کی جگہ سے بلند ہو۔ اس بارے میں آج کل یہ قانون ہے کہ جب شہنشاہ کی سواری کسی کوچے سے گزرے تو مکانوں کے دروازوں اور کھڑکیوں کے پردے فوراً گرا دیئے جائیں۔ اور سب لوگ مکانوں سے نکل کر سڑک پر کھڑے ہو جائیں۔ یہ قانون ایسا سخت ہے۔ کہ یوروپین لوگ بھی جو اس قانون سے قدرتی طور پر لاعلم ہوتے ہیں۔ اس کے اثر سے نہیں بچ سکتے۔ پولس کی مسلوں میں انگریزوں اور امریکائیوں کے ایسے مقدمات بہت موجود ہیں۔ کہ ان لوگوں نے اپنے ہوٹلوں کے کمروں سے نیچے سڑک پر خلل سنا اور اس شوق میں کہ دیکھیں نیچے کیا ہو رہا ہے۔ کھڑکیاں کھولکر جھانکنے لگے لیکن پولیس کو معلوم ہوتے ہی یہ لوگ اس قصور میں کہ انہوں نے شہنشاہ جاپان کو اونچی جگہ سے دیکھنا چاہا فوراً مجسٹریٹ کے سامنے حاضر لائے گئے +

چند سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ کہ گاؤں کے ایک چودھری نے جو شہنشاہ کا فرضی نام تو جانتا تھا۔ مگر ان کے اصلی نام سے واقف نہ تھا۔ اس حالت لاعلمی میں گاؤں کے ایک لڑکے کا نام یوشی ہے تو رکھنے کی اجازت دیدی اور گاؤں کی کتاب میں بھی یہی نام درج کر دیا۔ جس وقت یہ حال معلوم ہوا۔ تو اس سے استعفا طلب کیا گیا۔ مگر اس غریب چودھری کو اپنی اس غلطی کی وجہ سے ایسا رنج و ملال ہوا۔ کہ اس نے فوراً خودکشی کر لی +

شہنشاہ می جی آنجہانی جن کے دور حکومت میں جاپان نے سب سے پہلے یورپ کا تمدن اختیار کیا اور یہ ملک دنیا کی ایک زبردست طاقت بن گیا۔ ان کی جو عظمت تمام قوم جاپان کے دل میں قائم ہے۔ اس کی کیفیت حال کے ایک یورپین مصنف نے جن کا نام ڈاکٹر مک گودرن ہے۔ بہت

خوبی سے بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

وہ فرمانروا جن کی قبر کو لوگ سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اور جہاں زائرین بکثرت آتے ہیں۔ شہنشاہ می جی ٹینو ہیں۔ ان کا مقبرہ کی اوٹو کے قریب ہے۔ اور دنیا کے نہایت پُر اثر مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ یہاں ایک بہت بڑے مصنوعی سفید پہاڑ کے نیچے یہ واجب التعظیم شہنشاہ دفن ہے۔ مقبرے کے سامنے ایک عمارت بنا دی ہے۔ جہاں معمولی دنوں میں صدہا اور تہوار کے دنوں میں ہزارہا زائرین آتے ہیں۔ اور قبر کے سامنے سر نیاز خم کرتے ہیں۔ لیکن ان کا طریقہ تعظیم وہ نہیں ہے۔ جو ہم مغرب کے لوگ کسی مغز زمیت کے ساتھ اختیار کرتے ہیں۔ بلکہ جاپانیوں کی تعظیم و تکریم ایک ایسی قادر اور ناپدید روح کی تعظیم و تکریم ہوتی ہے۔ جو ہمیشہ ان کی التجاؤں کا (جو اس کی بارگاہ میں پیش کی جاتی ہیں) لحاظ کرتی ہے۔ اور جو ان التجاؤں کے منظور کرنے پر قادر اور آمادہ رہتی ہے۔ کیونکہ جاپانیوں کو اس کا یقین ہے۔ کہ مرنے کے بعد روح نہ بہشت میں جاتی ہے۔ اور نہ دوزخ میں بلکہ وہ اس قبر کے گرد پھرتی رہتی ہے۔ جہاں اس کا جسم دفن ہے یا اس عمارت کے قریب موجود رہتی ہے۔ جو اس کی یادگار میں بنائی گئی ہے

" " " " یہی وجہ ہے کہ شاہان سابق کی روحوں کی نسبت فرض کیا جاتا ہے۔ کہ اب تک ان کی آنکھیں اس ملک کو دیکھ رہی ہیں۔ جس پر انہوں نے حکومت کی تھی۔ اور جس سے اُن کو اُنس تھا۔ اور اب بھی یہ روحیں جب اپنے جانشینوں کی رعایا سے اپنی تعریف و توصیف سُنتی ہیں۔ تو خوش ہوتی ہیں۔ چنانچہ قومی امور کے متعلق جس قدر مسائل ہوتے ہیں۔ مثلاً لڑائی کا شروع کرنا یا عہد نامہ امن پر دستخط کرنے ان سب باتوں کی باقاعدہ اطلاع ان روحوں کو دی جاتی ہے۔ اور ہر کام کے لئے ان سے دعائے خیر طلب کی جاتی ہے"

زندگی کو اہم پہلو سے دیکھنے کی قابلیت گو جاپانیوں میں بہت ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی وہ ایک زندہ دل اور خوش رہنے والے لوگ ہیں۔

جو عموماً اپنی زندگی ہنسی خوشی سے گزارتے ہیں۔ اور جو پریشانیاں ذرا ذرا سی بات ہم ہندیوں کے اطمینانِ قلب کو غارت کر دیتی ہیں۔ وہ اُن کو بالکل نہیں ستاتیں جاپانی اس قسم کی تکلیفوں کو اپنے روزانہ کاروبار کا ایک حصہ سمجھتے ہیں +

باوجود اس کے خودکشی کے وقوعے جن میں طلبہ اپنی جان کھوتے ہیں۔ ہر سال متعدد پیش آتے ہیں۔ یہ طلبہ اس قصد سے کہ مغربی علوم میں اعلیٰ معیار کو جس قدر جلد ممکن ہو حاصل کریں، نہایت سخت محنت اٹھاتے ہیں۔ اور اس وجہ سے ان پر ایسی مایوسی اور افسردگی چھا جاتی ہے۔ کہ وہ خودکشی کر لیتے ہیں۔ ہزارہا جاپانی طلبہ ایسے ہیں جو دن یا رات کے کسی حصے میں مزدوروں کی طرح کام کرتے ہیں تاکہ جو کچھ مزدوری ملے اس سے کالج کی فیس ادا کریں۔ لیکن تمام قوم میں غیرت و خودداری اس قدر ہے کہ کسی رعایت یا مہربانی کے لئے بالخصوص مالی امداد کے لئے کسی سے التجا کرنا جو ہمارے ملک میں ایک عام بات ہے۔ ان کے ہاں تقریباً معدوم ہے۔ ٹوکیو میں وہاں کی جامعہ کے ایک طالب علم سے مجھکو ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس غریب کا یہ حال تھا۔ کہ اپنی درسگاہ سے چھ میل دور ایک کھیت کی رکھوالی کیا کرتا تھا۔ کہ اس خدمت کے عوض جو کچھ روپیہ ملے اس سے تعلیم کے اخراجات ادا کرے۔ صبح سورج نکلتے ہی اپنا کھانا پکاتا تھا۔ اور پھر وہاں سے چونکہ سواری کے لئے کچھ پاس نہ ہوتا تھا درسگاہ کو پیدل آتا تھا۔ اور چوبیس گھنٹے میں صرف ایک وقت کھا کر زندگی بسر کرتا تھا جب اس طالب علم سے زیادہ واقفیت ہونے پر معلوم ہوا۔ کہ وہ نہایت نیک خصلت اور شائستہ مزاج ہے۔ اور اس کی تنقیدی نظر بہت بڑھی ہوئی ہے تو میں نے کچھ روپیہ سے اس کی مدد کرنی چاہی لیکن اتنا قصد کرتے ہی جس قدر غیرت، شرم اور تکلیف کے آثار اس کے چہرے سے ظاہر ہوئے میں کبھی ان کو نہیں بھول سکتا فوراً نہایت استغنا کے ساتھ مگر مودب طریقے سے یہ طالب علم مجھ سے کہنے لگا کہ جاپان قدیم کے جانبازوں کا خون چونکہ میری رگوں میں موجود ہے اس لئے میرا فرض ہے کہ جہاں تک حوصلہ اور یامردی کام دے سکے زندگی کی راہ میں جس قدر مشکلات پیش آئیں انکو

بلا امداد غیرے برداشت کروں" اتنا سن کر مجھکو پہلی بار معلوم ہوا۔ کہ باشندگان جاپان کے اخلاقانہ اطوار اور ہنستے ہوئے چہروں میں درحقیقت کیسی ہمت و حوصلہ مندی پوشیدہ ہے +

اس موقعہ پر چند جاپانی بیواؤں کی خودکشی کے واقعات بھی جو جنگ جاپان و روس کے زمانے میں پیش آئے یاد آتے ہیں۔ یہ خودکشیاں اس لئے کی گئی تھیں کہ ان بیواؤں کے اکلوتے لڑکے اپنے ملک کے لئے لڑنے کو میدان جنگ میں جاسکیں کیونکہ ملک کا قانون یہ تھا کہ زندہ بیواؤں کے جو لڑکے اکلوتے ہوتے تھے وہ فوج میں بطور سپاہی کے بھرتی نہیں کئے جاتے +

میں اس امر کو محسوس کرتا ہوں (اور نہایت قوت سے محسوس کرتا ہوں) کہ ایک قوم جس میں حب الوطنی اس شدید درجے پر پہنچی ہوئی ہو اس کو کبھی ان اخلاقی اور سیاسی ذلتوں کا سامنا نہیں ہو سکتا۔ جو دنیا کے زیادہ تر حصے کو اس وجہ سے اٹھانی پڑی ہیں۔ کہ وہ ایک غیر قوم سے مفتوح یا اس کا محکوم ہو گیا ہے +

جاپان قدیم میں جو تربیت "سمورائی" کو دی جاتی تھی۔ اور جن کے لئے ہندوستان کے چھتریوں کی مثل سپہ گری کا فن بلا شرکت غیرے مخصوص ہو گیا تھا۔ وہ ایسی تربیت تھی جس نے دنیا میں ایک ایسا انسان پیدا کرنے کی طرف میلان کیا جس کی مثال یقیناً بیسویں صدی میں سوائے جاپان کے کہیں اور نہیں مل سکتی لیکن ابھی یہ دیکھنا ہے۔ کہ مغربی تہذیب و تمدن سے جو تعلق اس وقت پیدا ہو رہا ہے وہ "سمورائی" کے شجاعانہ طور و طریقوں میں انحطاط پیدا کرنے کی طرف مائل ہو گا یا نہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے۔ کہ شجاعت و جوانمردی کے کارنامے جن کی ہزارہا مثالیں جاپان قدیم کی تاریخ میں پائی جاتی ہیں۔ ایسے ہیں کہ وہ ہمیشہ جاپانیوں کی حوصلہ افزائی کا ذریعہ بنے رہیں گے اور خواہ کسی قسم کی تہذیب و تمدن سے ان کو واسطہ پڑے۔ جو خیالات زمانہ گزشتہ میں صدہا برس تک قوم کی طبیعت کا خمیر بن چکے ہوں ان کا مٹایا جانا ممکن نہیں +

سب سے مقدم چیز "سمورائیوں" کو یہ سکھائی جاتی تھی۔ کہ وہ اپنے جذبات کو کبھی ظاہر نہ ہونے دیں۔ تکلیف یا خوشی یا خطرے کا مقابلہ کرنا اس کو اس طرح سکھایا جاتا تھا۔ کہ ان حالتوں میں سے کسی حالت کی بھی کوئی علامت اُن سے مطلق ظاہر نہ ہونے پائے اور یہ ہی چیز اب تک ایک جاپانی سپاہی کا بڑا وصف خیال کی جاتی ہے۔

روس اور جاپان کی لڑائی میں پورٹ آرتھر کے سامنے جو ہمت و دلیری جاپانیوں سے ظاہر ہوئی۔ اس سے بڑھ کر جانبازی و شجاعت کا نمونہ کیا ہو سکتا ہے۔ اسی دلیری و جوانمردی کا ایک واقعہ ایک انگریز نے اس طرح بیان کیا ہے۔

"جب ایسے رضاکاروں کی ضرورت بیان کی گئی جو پورٹ آرتھر کے بندرگاہ کا بحری رستہ بند کرنے کا ذمہ لیں تو اس خطرناک خدمت کے لئے دو ہزار آدمیوں نے اپنی درخواستیں پیش کیں جن میں سے بعض درخواستیں سائکوں نے اپنے خون سے لکھی تھیں۔ لیکن ان میں سے صرف ۷۷ افسر جوان اس کام کے لئے منتخب کئے گئے۔ جب یہ لوگ پورٹ آرتھر کو روانہ ہونے لگے۔ تو اس وقت جو رسمیں ادا کی گئیں وہ نہایت ہی موثر و دلگداز تھیں۔ جنگی جہاز "اساما" پر کپتان باشیرو نے ایک بڑا چاندی کا جام جو قدیم عہد جاپان نے ان کو بطور تحفے کے دیا تھا۔ اٹھایا اور اس کو پانی سے بھرا (یہ جاپان کی قدیم رسم ہے۔ کہ جب قریب کے عزیزوں سے دائمی مفارقت ہوتی ہے۔ تو پانی پیتے ہیں)۔ اور پھر ان ۷۷ لوگوں سے اس طرح خطاب کیا۔ "اس وقت تم لوگوں کو پورٹ آرتھر کے بندرگاہ پر اس کا رستہ بند کرنے کے لئے روانہ کرنے میں جہاں سے زندہ بچ کر آنے کا احتمال ہزار میں صرف ایک درجہ ہو سکتا ہے۔ مجھکو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا اپنے فرزندوں کو اس کام پر بھیج رہا ہوں۔ لیکن آج اگر میرے سو فرزند ہوتے تو بھی ایسی بہادری کے کام پر میں ان کو بھیج دیتا۔ اور اگر ایک اکلوتا فرزند رکھتا ہوتا۔ تو بھی یہ ہی کرتا۔ اپنا فرض ادا کرنے میں اگر تمہارا بایاں ہاتھ جاتا رہے۔ تو داہنے

سے کام لو۔ اگر دونو ہاتھ جاتے رہیں۔ تو دونو پاؤں سے کام لو۔ اور اگر دونوں پاؤں بھی نہ رہیں۔ تو اپنے سر سے کام لو۔ اور اپنے افسر کے حکم کی پوری تعمیل کرو۔ میں تم کو موت کی جگہ بھیجتا ہوں۔ اور مجھکو اس میں ذرا شبہ نہیں۔ کہ تم مرنے کے لئے آمادہ ہو۔ لیکن میں تم کو یہ نصیحت نہیں کرنی چاہتا۔ کہ اپنی جانوں کو دو بھر سمجھ لو یا محض بڑا نام پیدا کرنے کے لئے فضول خطرے اٹھاؤ مجھ کو تم سے جو کچھ درخواست کرنی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ بلا اپنی جان کے خیال کے اپنا فرض ادا کرو۔ جو پانی کا جام اس وقت تمہارے لئے پیا گیا ہے۔ وہ اس لئے نہیں ہے۔ کہ تمہاری ہمت بڑھاؤں۔ بلکہ اس لئے ہے۔ کہ تم کو "اساما" کی بہادری و شجاعت کا حقیقی نمایندہ بنادوں۔ یہ بڑی شرم کی بات ہوتی کہ موت کے منہ میں جانے کے لئے شراب پلا کر ہمارے جوانوں میں دلیری پیدا کرنے کی ضرورت پڑتی میں اس خوشی کے دن کا منتظر ہوں جب کہ تم کو پھر کامیابی کے ساتھ واپس آتے ہوئے دیکھوں۔ پس جوانوں اپنی جانوں کو شہنشاہ کے ارادہ و قصد پر وقف کردو اور بالکل خاموشی و یکسوئی سے اپنے سخت فرائض کو ادا کرو"۔

ان منتخب لوگوں میں کمانڈر ہیروزے بھی تھا۔ پورٹ آرتھر کا رستہ بند کرنے کے لئے پہلی بار جب کوشش کی گئی تو اس سے کچھ قبل ہیروزے نے اپنے گھر والوں کو لکھا۔ کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔ کہ وطن کی محبت میں جان قربان کرنے سے مجھکو انکار ہو۔ یہ بڑی شاندار موت ہوگی کہ پورٹ آرتھر کے دہانے کے سامنے اپنے جہاز کے ساتھ میں بھی ڈوب جاؤں" دوسری مرتبہ کی کوشش سے کچھ پہلے جس میں کمانڈر ہیروزے کی جان گئی ہیروزے نے لکھا "جب مجھکو علم ہوا ہے۔ کہ بہادروں کی روحیں سات بار اس دنیا میں اپنے ملک کی خدمت کے لئے واپس آتی ہیں۔ تو میں نہایت اطمینان سے اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ ہوں۔ اور اس امید میں کہ اس مرتبہ کے عزم میں قطعی کامیابی ہوگی۔ میں اپنے جہاز پر نہایت خوشی سے جاؤنگا"۔

یہ دلیری اور جوانمردی محض ایک قاعدہ کی پابندی کا نتیجہ تھی۔ جس

کی پابندی اعلےٰ سے لے کر ادنیٰ تک کو سکھائی جاتی ہے۔ اور جس کا مضمون یہ ہے۔ کہ رعیت ہونے کی حیثیت سے انسان کا سب سے بڑا فرض اپنے ذاتی فوائد کو قوم کے فوائد پر قربان کر دینا ہے۔ انانیت دشمن ہے۔ تعاون کی اور بلا تعاون کوئی بڑا کام ممکن نہیں"۔

سموراٹی مردوں، عورتوں اور بچوں کو جاپان قدیم میں تلوار چلانی سکھائی جاتی تھی۔ یہ ان کے آداب و قواعد ناموس میں منضبط تھے۔ کہ کوئی سموراٹی لڑائی میں اپنے آپ کو دشمن کے حوالے نہ کرے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ جاپان کی تاریخ میں ہزارہا مثالیں اس کی ملتی ہیں کہ لڑائی کے میدان میں اگر سپاہیوں یا ان کے افسروں کو شکست ہوئی ہے۔ تو انھوں نے فوراً ہراکیری (یعنی خودکشی کر کے اپنی جانیں تلف کر دیں۔ مگر کبھی دشمن کے ہاتھ میں گرفتار رہو کر اسیران جنگ نہ بنے ہراکیری کا طریقہ جاپان میں دور جدید کے شروع ہونے سے پہلے قانوناً جائز مانا جاتا تھا۔ اور اب بھی خودکشی میں جس ہمت سے کام لینا پڑتا ہے اس کی وقعت قوم کی نظروں میں بہت ہے اور خودکشی کرنی کسی طرح جان دینے والے کی موجب بدنامی تصور نہیں کی جاتی۔

سابق میں جو سموراٹی سرکاری طور پر مجرم ثابت ہوتے تھے۔ تو وہ جلاّد کے حوالے نہ کئے جاتے تھے۔ بلکہ ان کو اجازت دی جاتی تھی۔ کہ خود اپنے تئیں ہلاک کر دیں۔ اس قسم کی اجازت بڑی مہربانی اور رعایت سمجھی جاتی تھی۔ اس کام کے لئے مقام اور وقت کی باضابطہ اطلاع دی جاتی تھی۔ اور سرکاری ملازموں کو حکم ہوتا تھا۔ کہ موقع پر حاضر رہیں۔ مردوں کی خودکشی کا طریقہ یہ تھا۔ کہ زمین پر سیدھے بیٹھ کر اپنا پیٹ چاک کر ڈالتے تھے۔ مگر کسی قسم کی تکلیف کے آثار اپنے چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیتے تھے۔ عورتیں اپنا گلا کاٹ کر خودکشی کرتی تھیں ٭

جاپان میں اب تک یقین کیا جاتا ہے۔ کہ اگر کوئی کسی کی توہین کرے۔ تو اس کی تلافی کے صرف دو ہی طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ جو شخص توہین کرے اس کو ہلاک کر دیا جائے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جس کی توہین کی گئی ہو۔

وہ خود ہلاک ہو جائے۔ کیونکہ بغیر توہین کی تلافی کئے زندہ رہنا معیوب سمجھا جاتا ہے پس غیر ملک والوں کو جنہیں جاپان جانے کا اتفاق ہو اہل جاپان سے خواہ وہ کسی طبقے کے ہوں برتاؤ کرنے میں غایت درجہ احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیئے +

میرے ایک ہندوستانی دوست نے جو بقریب تجارت یوکوہاما میں مستقل سکونت رکھتے ہیں۔ مجھ سے بیان کیا کہ ایک موقعے پر کسی طرح بالکل نادانستہ انہوں نے اپنے تئیں ایک سخت مشکل میں مبتلا کر لیا۔ واقعہ یہ تھا۔ کہ وہ کہیں جا رہے تھے۔ قلی ساتھ تھا۔ جلدی بہت تھی۔ قلی کو مزدوری دینے لگے۔ تو ایک سکہ نکال کر اس کی طرف پھینک دیا۔ مگر جونہی قلی کی صورت دیکھی تو ہمارے ہندوستانی دوست کے اوسان باختہ ہو گئے۔ قلی کا چہرہ غصے سے دفعتاً لال انگارا ہو گیا تھا۔ اور نہایت قہرناک طریقے سے جواب طلب کرتا تھا۔ کہ شہنشاہ کا نشان جو سکہ پر بنا ہے۔ اس کو نیچے پھینک کر کس واسطے بے ادبی کی گئی۔ خوش قسمتی سے اس وقت میرے دوست کے ایک جاپانی ملنے والے آ گئے۔ اور بات زیادہ نہ بڑھنے پائی۔ یہ جاپانی دوست اس ماجرے کو دیکھتے ہی سمجھ گئے۔ اور انہوں نے زمین سے فوراً سکہ اٹھا کر نہایت تعظیم سے قلی کو پیش کیا۔ اور ہندوستانی دوست کو تاکید کی کہ آئندہ اس قسم کی ہرگز غلطی نہ کریں +

اپنی عزت کے علاوہ دوسروں کی عزت کرنے کا مادہ بھی جاپانیوں میں بہت بڑھا ہوا ہے۔ چنانچہ یہ دیکھ کر مجھ کو ہمیشہ لطف آتا تھا۔ کہ والدین اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں سے بھی اسی ادب و اخلاق سے باتیں کرتے تھے۔ جو وہ اپنے برابر والوں سے برتتے تھے +

اس طرح گو خودداری، حب الوطنی، شہنشاہ کے ساتھ بدرجہ اتم وفاداری ہر شخص کے دل میں ہر ممکن طریقے سے نقش کی جاتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ ہی وہ چیزیں ہیں جنہوں نے جاپانیوں کو دنیا میں سب سے زیادہ سریع الاحساس و نازک مزاج قوم بنا دیا ہے۔ یہ نازک مزاجی اس قدر بڑھی ہوئی ہے۔ کہ بالعموم غیر ملک کے آدمی کو جاپانیوں سے ایسی بے

تکلف دوستی پیدا کرلینی بہت دشوار معلوم ہوتی ہے۔ جو ہم ہندیوں اور یورپین لوگوں میں پیدا ہو جانی ایک معمولی سی بات ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس سریع الاحساسی کے ساتھ ساتھ تجارت کے میدان میں حریفانہ تعلقات اصلی سبب اس منافرت و مغائرت کا ہو گئے ہیں۔ جو دوسری قوموں کے دل میں باشندگان جاپان کی طرف سے پیدا ہو چلی ہیں +

جاپان کے مفلس لوگ بھی اپنی قومی عزت کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں ایک انگریز پادری کو جو واقعہ ذاتی طور پر پیش آیا۔ اور جس کا حال میرے ایک دوست نے مجھکو لکھکر بھیجا۔ یہاں بیان کر دینا کافی ہوگا ان پادری صاحب کو جاپان میں ایک سفر ایسا پیش آیا۔ جس میں اتفاق سے ان کا کل سامان گم ہو گیا۔ حالانکہ سامان پر پتہ لکھنے اور ٹیکٹ لگانے کے متعلق جس قدر کارروائی تھی۔ وہ بہت احتیاط سے ہو چکی تھی۔ جب پادری صاحب ٹوکیو پہنچے تو یہ معلوم کرکے کہ ان کا سامان کہیں اور بھیج دیا گیا ہے۔ سخت پریشان ہوئے۔ ریلوے کے ملازموں نے ان کا اطمینان کرنا چاہا۔ کہ جس وقت سامان اسٹیشن پر آجائے گا۔ تو وہ ان کے پاس ٹھیلہ پر رکھکر بھیجدیا جائے گا۔ بشرطیکہ ٹھیلہ کا کرایہ پہلے سے وہ جمع کر دیں۔ پادری صاحب نے اتنا سن کر کہا کہ اگر اس قسم کا قصہ انگلستان میں پیش آیا ہوتا۔ تو ریلوے کمپنی خود بغیر کرایہ لئے مالک کے مکان پر اس کا سامان پہنچوا دیتی۔ اتنا کہنے پر پادری صاحب نے دیکھا کہ ریلوے کے تین چار ملازم باہمی مشورے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ اور مشورہ کے بعد ان میں سے ایک آدمی ان کی طرف آکر یہ کہتا ہے کہ آپ کا سامان بلا کرایہ آپکے مکان پر پہنچ جائے گا۔ پادری صاحب کو جاپان میں رہتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اور ان کو یہ علم نہ تھا کہ ریلوے کا کل انتظام گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہے۔ اور ریلوے کے ملازموں کو بہت ہی قلیل تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن جب انہوں نے حالات تحقیق کئے تو معلوم ہوا۔ کہ ان لوگوں کو یہ معلوم کرکے کہ انگلستان کسی بات میں بھی جاپان سے فضیلت رکھ سکتا ہے۔ ایسی غیرت آئی۔ کہ انہوں نے اپنی قلیل

سے فوراً چندہ کیا۔ اور اس چندہ سے ٹھیلے کا کرایہ ادا کر کے پادری صاحب کا کل سامان اُن کے گھر مفت بھجوا دیا +

جاپان کی عورتوں کی نسبت میں بہت اعلےٰ درجے کی رائے رکھتا ہوں۔ میں انکو تعلیم و تربیت کا ایک کامل نمونہ سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں حسن و خوبی کو پہچاننے اور جمالی اثرات کو قبول کرنے میں وہ فرانس کی عورتوں سے بھی کم از کم سو برس آگے ہیں۔ باوجودیکہ اہل یورپ نے اپنے براعظم پر فرانس کی عورتوں کو ان باتوں میں سب سے افضل سمجھا ہے۔ چونکہ ان کو پردے میں اس طرح علٰحدہ نہیں رکھا گیا ہے۔ جیسے کہ ہماری عورتیں صدیوں سے علٰحدہ چلی آئی ہیں۔ اس لئے ان کے خیالات و حرکات و سکنات میں وہ آزادی ہے۔ جو ہندوستان میں ہرگز عام نہیں تو اء جسمانی بہت مضبوط رکھتی ہیں۔ لیکن اس جسمانی مضبوطی کی وجہ سے ان میں وحشت نہیں ہے شرمیلی ہوتی ہیں۔ مگر اپنے کاروبار میں دوسرے کی محتاج نہیں ہوتیں۔ اور اپنے روزمرّہ کے کام کاج میں کسی قسم کی خود غرضی سے کام نہیں لیتیں۔ جاپان کی عورتوں نے ثابت کر دیا ہے۔ وہ مصیبت کی حالت میں صابر اور تکلیف کی حالت میں قوی دل رہتی ہیں۔ وہ وفادار بیویاں ہوتی ہیں۔ چاہنے والی مائیں ہوتی ہیں۔ نیک بخت لڑکیاں ہوتی ہیں۔ اور جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے۔ ان میں دلیری و جسارت بھی ایسی ہوتی ہے۔ کہ ان کا مقابلہ مردوں سے کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت میں عورتیں بمقتضائے انسانیت جس توجہ سے اپنے خاوندوں کے حق میں اپنے فرائض ادا کرتی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ بیویوں کی ناوفاداری سے طلاق کے دعوے جاپان میں تقریباً معدوم ہیں۔ ایک بڑے مستند مصنف نے کل قوم جاپان کے خصائل اس طرح ایک فقرہ میں بیان کئے ہیں :۔

سادگی، محنت، بردباری تو ان لوگوں کے اوصاف ہیں۔ جن کو روٹی پیدا کرنی پڑتی ہے۔ اور شجاعت اور قومی ہمدردی بدرجہ کمال کل قوم کے اوصاف ہیں +

سموائی کے قواعد عزت و ناموس نے جاپانی عورتوں کی طبیعت اور روزمرّہ

کے چلن پر بھی مردوں ہی کی مثل گہرا نقش کیا ہے۔ مثلاً جاپانیوں کے آداب واخلاق کا ایک بڑا اصول یہ ہے۔ کہ کسی اجنبی شخص پر اپنے غم والم کا بار نہیں ڈالتے اکثر ایسا ہوا ہے۔ کہ ایک جاپانی عورت اپنے کمرہ میں تو اکیلی بیٹھی اپنے شدید غم والم کا اظہار کر رہی ہے۔ لیکن اگر کوئی اجنبی اس وقت گھر میں ملنے چلا آیا ہے تو فوراً کمرہ سے نکل کر نہایت صبر واستقلال کے لہجہ میں اپنے اکلوتے بچے کی موت کا واقعہ سنانے لگی۔

چونکہ غیر ملک والوں کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ کہ دل کو مضبوط کرکے اپنے جذبات کو بالکل پوشیدہ رکھنا کس طرح ممکن ہے۔ اس لئے وہ غلطی سے جاپانیوں کو ایک دھوکہ دینے والی قوم کہنے لگتے ہیں۔

گو آجکل جاپان بھی دوسرے ملکوں کی مثل لڑائی کے میدان کو چھوڑ کر تجارت کے میدان میں سرگرم کار ہے۔ لیکن برخلاف دوسرے ملکوں کے جاپان میں اب بھی وہ قوتیں موجود ہیں۔ جو اگلے زمانے میں کامل سمورائی پیدا کرنے کا مادہ رکھتی تھیں۔ بالخصوص جہاں آپس کے معاملات ہوں۔ فرق جو کچھ پیدا ہوا ہے وہ ان قوتوں کے اظہار کی شکل میں پیدا ہوا ہے۔ بہت سی باتوں میں جو حال جاپانیوں کا پرانے زمانے میں تھا۔ وہی اب بھی ہے۔ اکثر وفادار نوکر اپنے آقاؤں کو ایسے کام سے روکنے کے لئے جو ان کی نیک نامی یا مال ودولت کے حق میں مضر ہو خودکشی کرکے حالت نزع میں ایسے کام سے باز رہنے کی ان کو وصیت کرتے ہیں۔

جس طرح کہ جاپان قدیم کے مدارس میں سمورائیوں کے لڑکوں کو فنون جنگ سکھلائے جاتے تھے اور پھر ان کو ملک میں سفر کرنے کا حکم دیا جاتا تھا۔ کہ ہر قسم کی جسمانی تکلیفیں اٹھانے کے وہ عادی ہو جائیں، اسی طرح میں نے دیکھا کہ جاپان کے موجودہ مدارس میں بھی نصاب تعلیم میں سب سے ممتاز جگہ جسمانی تربیت کو دی گئی ہے۔ معلم اور شاگرد ضروری سامان اپنی پیٹھ پر رکھکر لمبے لمبے سفر پیادہ پا کرتے ہیں۔ اور موسم کی سختیوں کو جھیلنے کی عادت ڈالتے ہیں۔ اگر جسمانی قابلیت میں تمام دنیا کی قوموں کا امتحان لیا جائے۔ تو میرا

خیال ہے۔ کہ جاپانی باوجود اس کے کہ وہ ایک نہایت پرانی قوم کے لوگ ہیں، اس امتحان میں بہت اونچی جگہ پائینگے +

جاپان اپنی تاریخ پر جیسے پہلے فخر و مباہات رکھتا تھا۔ وہی حال اب بھی ہے۔ اور برخلاف ہمارے وہ اپنے تمام قومی نوشتوں اور تاریخی تذکروں کو محفوظ اور مرتب رکھنے کی طرف بے انتہا متوجہ رہتا ہے +

دیگر واقعات جو جاپان کی تاریخ میں مجھکو بہت ہی قابل توجہ معلوم ہوئے وہ یہ تھے۔ کہ برعکس دوسرے ملکوں کے جاپانیوں میں کامل سمورائی وہی گنا جاتا تھا۔ جو سپاہی بھی ہوتا تھا۔ اور عالم بھی دوسرے یہ کہ یورپ کے عیسوی ملکوں سے تعلقات ہونے سے قبل یعنی سولھویں صدی عیسوی کے وسط سے پہلے جاپانی لوگ جانتے تک نہ تھے۔ کہ مذہبی تعصب کس چیز کا نام ہے +

جسمانی صفائی اور پاکیزگی میں کوئی قوم آج ایسی نہیں ہے۔ جو جاپانیوں کی ہمسر ہو۔ کیا امیر اور کیا غریب ہر شخص غلیظ رہنے کو ایک اخلاقی جرم سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جاپانیوں کے گھر آج دنیا کے سب سے زیادہ پاک اور ستھرے گھروں میں شمار ہوتے ہیں +

فلسفۂ امن

(مترجمہ جناب مولوی عبدالماجد صاحب بی۔ اے)

وُہ زمانہ آرہا ہے، جبکہ انسان، بھیڑ بکریوں کی طرح بہ آسانی ذبح ہو جانے سے تنگ آکر اپنے تئیں ارباب حق کی رہنمائی میں دے دیں گے کہ عدل حقیقی کا یہ فرمان صادر ہو چکا ہے، کائنات کی شکل ایک حلقہ کی ہے، جزا و معاوضہ کا قانون ہر جگہ جاری ہے، ہر فعل اپنے فاعل کے لئے ایک ثمرہ رکھتا ہے، کوئی شے ضائع نہیں ہوتی، ہر شے محفوظ و مجتمع ہوتی رہتی ہے، قوت اپنی جانب قوت کی کشش کرتی ہے، جیسے رعد کو رعد سے میل ہوتا ہے، یہی سبب ہے کہ آج یورپ اس آفت میں مبتلا ہے جو خود وُہ بارہا دوسروں پر نازل کر چکا ہے، یہانتک کہ آج جو بالکل بیگناہ معلوم ہو رہے ہیں وُہ بھی حقیقتہً ایسے نہیں ہیں، ہر فریق یہ چاہتا ہے کہ دوسروں کے پنجہ سے مظلوموں کو آزاد کرائے لیکن درحقیقت تمام فریق ایک دُوسرے کو ہلاک کر کے کل مظلوموں کو آزادی دلا رہے ہیں۔

بڑی بڑی قوموں کی بربادی ضروری تھی، نہ اس لئے کہ دُنیا کو فلاں فلاں ظالم حکومت سے آزادی حاصل ہو، بلکہ اس لئے کہ جو نفسیت دُنیا پر غالب تھی، اس سے اُسے نجات دلائے، آج دُنیا اس طلسم میں گرفتار ہے کہ ہر فریق اپنے تئیں "فاتح" سمجھتا ہے، درآنحالیکہ اس جنگ میں جو ہر فریق کی تباہی و بربادی کے مرادف ہے، "فتح و کامیابی" کے کوئی معنی ہی نہیں، ابھی معلوم نہیں کتنی فتوحات ہر فریق کو حاصل ہو لیں گی، جب جا کر ہر فریق کی شکست تکمیل کو پہنچ سکے گی، چنانچہ یہ جو فتوحات و کامیابیاں ہوتی دکھائی دے رہی ہیں، یہ وُہ نہیں جن کی فریق کامیاب کو آرزو تھی بلکہ یہ فریقین کی تباہی و بربادی کے وُہ مدارج ہیں جن کے بغیر انسانی ترقی ممکن نہ تھی۔

خود فریبیوں کا طلسم ٹوٹ چکا، صلح جو ہونے والی ہے، وُہ خود غرضانہ توقعات کو پُورا نہیں کرنے کی، اس لئے کہ یہ دورِ یورپ کی باہمی جنگ وُہ جنگ ہے، جو سب سے بڑی طاقت ان سب کے خلاف کر رہی ہے، ہاں اس لئے کہ یہ جنگ کسی نہ کسی صورت میں برابر جاری رہے گی، تا آنکہ جو ہر انسانیت کو پامال کرنے والا دیو تا جو اس وقت نظام عالم کو درہم

دیر ہم کرنے میں مشغول ہے، رحم کی التجا کرنے لگے تا آنکہ آئندہ نظام عالم کی عمارت بجائے باہمی منافرت وعناد کے باہمی معاونت واتحاد پر قائم ہو، خانہ جنگی کا بازار ابھی تو یورپ ہی میں گرم ہے لیکن اگر ضرورت باقی رہی تو کوئی دن جاتا ہے کہ یورپ کے ہر ملک میں یہی آگ شعلہ زن ہوگی،

بہترین کا وجود ہمیشہ بدترین سے ہوتا ہے، لیکن بدترین مرتبہ تک ابھی ہم پہنچے کب ہیں؟ اس قدر تو بہر حال یقینی ہے کہ اس جنگ کا خاتمہ دوسرے محاربات کی طرح نہیں ہوگا۔ اس جنگ کے خاتمہ کی صرف یہی صورت ہے کہ موجودہ نظامات کی زندگی ختم ہوجائے۔

یہ کہنا تو دشوار ہے کہ چھوٹی قومیں خود یورپ میں غلامی کی حالت میں ہیں، انہیں یہ جنگ اتنی جلد آزادی دلا دے گی، تاہم یہ یقینی ہے کہ افریقہ وایشیا کی بڑی بڑی قوموں کی رہائی و مخلصی کا وقت روز بروز قریب آرہا ہے، یہ قومیں خواہ باہم کتنی ہی مختلف ہوں، تاہم اشتراک مظلومیت نے سب کو یکدل بنا دیا ہے، اب صرف ایک ہی روح ہے جو ان سب کے قالبوں میں ہے، یعنی اپنے ماضی کی عظمت اور مستقبل کی حریت کا احساس، جو ان قوموں کو اب معلوم ہوجائے گا کہ ضعیف العمر قوموں کے ساتھ ظلم وتحقیر اور شیر خوار قوموں کے ساتھ بے دردی وشقاوت کا برتاؤ آئندہ نہیں چل سکتا۔

کانگو میں بلجیئم کے مظالم کا اعادہ اب نہ ہوگا، بھلا یہ کسی طرح ممکن تھا کہ یورپ کے غلام ساری دنیا میں تو پھیلے ہوئے تھے اور یورپ میں نہ ہوتے! قدیم غلام تو تھے ہی، جدید غلام خود اس کے وطن میں پیدا ہوگئے، زمانہ کی نیرنگیاں دیکھو کہ اس جنگ حریت نے خود یورپ میں ان قوموں کو طوق غلامی پہنا دیا جو کل تک آزاد تھیں، کل اس صبح سعادت کا طلوع یقینی ہے، جب یہ قدیم و جدید غلام سب آزاد ہوں گے، اور یورپ کی کل قومیں عام اس سے کہ حاکم ہوں یا محکوم، اس بڑے موذی دشمن کو زیر کر چکی ہوں گی جس نے اُن کے باطن کو غلام بنا رکھا ہے،

یورپ کے اکثر ممالک میں انقلابات ہونگے، یہ قول ہر زبان پر، اور یہ توقع ہر دماغ میں ہے یورپ کی تلوار کو خود یورپ پر برابر چلتی رہنا چاہیئے، یہاں تک کہ وہ ہر قوم کے قلب کے آر پار ہوجائے، اور جو عنصریت اس کے اندر سکونت رکھتا ہے وہ ہلاک ہوجائے،

حکومتیں بجائے خود وہ امراض تھیں جن میں اقوام مبتلا ہیں، تاہم ان امراض کا ظہور اور ان کی تشکیل حکومتوں ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے، حکومتیں گویا ان کا مجسمہ ہوتی ہیں، اور قوم کی آواز حکمرانوں ہی کے اعمال کی وساطت سے ظاہر ہوتی ہے، لیکن جب قوم کو متنبہ ہوتا ہے اور وہ

تلافی مافات کرنا چاہتی ہے تو عہد سابق کی ہر یادگار کو پامال کر ڈالتی ہے، اس انقلاب کے وقت وہ ان بتوں کو توڑنے لگتی ہے، جن بیچاروں کا کوئی قصور نہیں ہوتا، تاہم یہ بُت توڑے ضرور جاتے ہیں۔

اس انتقام کی زد سے حکومتوں کے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی پیشتر سے رعایا کی ہم آہنگ ہو جائیں، لیکن کیا یورپ کی کوئی حکومت اس کے لئے آمادہ و مستعد ہے؟ ہر حکومت دوسری حکومتوں سے جو سازوبار اور تعلقات رکھتی ہے، وہ خود ہی اس راہ میں سب سے زیادہ مانع ہوں گی، اس لئے اس باب میں اقوام یورپ ہی کو اقدام کرنا چاہیئے، ورنہ وہ قومیں جنہیں یورپ اس وقت جانوروں کی طرح ہانکتا چلا جا رہا ہے، ایک دن یقیناً پلٹ کر خود اسی پر حملہ کر دیں گی، اور یورپین حکومتوں کو پھاڑ کھائیں گی، ایک روز ان سب مفتوحہ قوموں کا قومی خود غرضی کے اس مردار خوار عقاب کے ہلاک کرنے پر متحد و متفق ہو جانا یقینی ہے جو اس وقت ان کو اپنا طعمہ بنائے ہوئے ہے،

یہ جنگ دراصل ہجوم مادیات کے عقب میں، غیر مادیات کی جنگ ہے، یہ نظارہ بھی قابل دید ہے، کہ یورپ کی صدیوں کی عظمت و کامرانی کے بعد آج وہاں کی قوموں کو اپنی ناانصافیوں کی قیمت ادا کرنی پڑی ہے، قتل و ہلاکت کی لعنت ان پر برابر مسلط رہے گی، تا آنکہ ان کے نفوس میں حیات انسانی کا شرف و احترام پیدا ہو، تا آنکہ وہ ایک جدید فلسفۂ زندگی کو قبول کریں، جبتک اشیاء میں تغیر نہ ہوگا اشخاص میں تغیر پیدا کرنا بے نتیجہ ہے، اور جب تک اشخاص میں تغیر نہ ہو محض اشیاء کی اصلاح لاحاصل ہے، اصل نکتہ یہ ہے کہ اشیاء و اشخاص دونوں کی روح (اسپرٹ) میں اصلاح ہو، مقصود یہ ہے کہ ہر قوم اپنی روح کے اندر انقلاب پیدا کرے، مدعا یہ ہے کہ کائنات جدید کا احساس ہر نفس میں پیدا ہو،

ہر قوم میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کا تعلق کسی مخصوص قوم سے نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ خدمت خلائق کے لئے پیدا ہوتے ہیں، وہ ملک کی خدمت سے بڑھ کر انسانیت کی خدمت کو اپنا فرض جانتے ہیں، یہی وہ افراد ہیں جن کی جانب نوع انسان کی آنکھیں اس وقت لگی ہوئی ہیں، یہی وہ افراد ہیں جن سے عالم انسانیت کو اپنی مظلومیت کی دادرسی کی توقع ہے، ان اشخاص کا فرض ہے کہ اب اٹھیں اور دنیا میں عدل و انصاف کی منادی کر دیں،

اخلاق کا قانون، افراد و اقوام دونوں کے لئے ایک ہی ہے، ہر قوم کو اپنے تئیں اسی ضابطہ اخلاق کا پابند سمجھنا چاہیئے، جس کی پابندی وُہ افراد پر عائد کرتی ہے، جس فعل کا ارتکاب ایک فرد کے لئے جرم ہے، اُس کا ارتکاب قوم کے لئے بھی جرم قرار پانا چاہیئے، اگر فرد کیلئے ضعیف و کمزور پر ہاتھ اُٹھانا اور اس کی تذلیل کرنا جرم ہے تو ملک و قوم کے لئے بھی یہ افعال جرائم ہیں،

سچّا محب وطن وُہ ہے جو ان افعال کے سایہ سے بھی بھاگتا ہے جو دوسروں میں خودداری و تعلّی کے جذبات پیدا کر دیتے ہیں، سچّا وطن پرست وُہ ہے جو وطن کے لئے ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت پر ماتم کرتا ہے، اس لئے ان طریقوں سے ایک حقیقی محب وطن کے دل میں وطن کی دولت و عظمت کا نہیں بلکہ افلاس و ناداری کا نقش بیٹھتا جاتا ہے، اور اس کی نظر میں وطن کی یہ صورت پھرنے لگتی ہے کہ وُہ حقیقتہً حسن و لباس سے بالکل عُریاں ہے، اور اسکے بجائے بداخلاقی و بدکرداری کے ملبوسات زیب تن کئے ہوئے ہے،

فرد و قوم کی حقیقی عظمت کا معیار یہ امر ہے کہ اس کا نصب العین کتنا بلند ہے، اور اس کے مطابق اس کا عمل کس حد تک ہے، عمل کی شرط لازمی ہے، اس لئے کہ نصب العین عملی زندگی کے بالکل مخالف رکھا جاتا ہے، خود وُہ دنیا جو اس وقت فنا ہو رہی ہے، اس کا نصب العین کیا تھا؟ جہاں تک زبان و الفاظ کا تعلق ہے، اس سے بہتر و بلند تر نصب العین شاید کسی کو نہ نصیب ہوا ہو، یعنی حریت عدل، سائنس، ترقی، تمدن، وقس علی ہذا۔ لیکن اگر عملی حیثیت سے نظر کیجئے تو اس سے عمیق تر قعر مذلت کی نظیر بھی نہ ملیگی۔

اب تک قوموں کا نصب العین "اقتدار" رہا ہے، اور وُہ بھی مادّی، ہر شے جب تک شمار و عدد میں نہ آسکتی ہو کسی شمار و قطار میں نہ تھی، تلقین و تعلیم کا ماحصل یہ تھا کہ "عناصر کو اور تسخیر کرو" چنانچہ اس نظام عمل پر پوری طرح عمل بھی ہوتا رہا، یہاں تک کہ روئے زمین کو انہوں نے باہم تقسیم کر لیا، اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے تھا،

وُہ دنیا جو اس وقت فنا ہو رہی ہے، اس نے کائنات مادّی پر پورا تسلط و تصرف کر لیا تھا یہاں تک مضائقہ نہ تھا، لیکن چونکہ اس نے اپنی زندگی تمام تر مادیات میں محدود رکھی، بالآخر مادہ سے ٹکرا کر پارہ پارہ ہو ہی ہے،

قومی عظمت کا صحیح معیار رتبہ نہیں ہے، حقیقی عظمت قابل پیمائش شے نہیں، ہر قوم کا

نصب العین بے شک نمو اور پھیلاؤ ہونا چاہیئے، مگر وہ پھیلاؤ مسطح ارض کے طول و عرض کا نہیں، بلکہ اپنی قد و قامت کی بلندی کا سب سے زیادہ معزز ملک وہ ہے جس میں انسانیت اپنے منتہائے بالیدگی پر پہنچ چکی ہوتی ہے۔

قوم متمول وہ ہے جس نے کوئی جدید شاہراہِ ترقی دریافت کی ہے، جس نے کوئی اعلیٰ اصولِ حیات پیش کیا ہے، قوم کی شوکت و اقتدار کا اصلی معیار صرف یہ ہے کہ اس نے دنیا میں روشنی کہاں تک پھیلائی، قوم صرف اسی وقت زندہ رہ سکتی ہے، جب تک وہ نوعِ انسان کی خدمت کرتی رہتی ہے، اور جونہی وہ اپنی خدمتگذاری سے دستکش ہونے لگتی ہے، وہ قوت جس کے بل پر اس کی زندگی قائم تھی اس سے منفک ہو جاتی ہے، اسی وقت سے قوم بھی گرنے لگتی ہے، تا آنکہ اس کا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے، اس لئے کہ اب اس کا وجود، انسانیت کے حق میں غیر مفید رہ جاتا ہے۔

روئے ارض جو سنّو ملکوں میں تقسیم ہے، حقیقۃً یہ سنّو مختلف ممالک نہیں، بلکہ ایک ملک ارض کے سنّو صوبے ہیں، اور سنّو قومیں جو ان میں آباد ہیں۔ وہ نسلِ انسانی کے سنّو خاندان ہیں لیکن کوئی قوم اس رشتہ کو نہیں تسلیم کرتی، ہر قوم اپنا مستقل بالذات وجود سمجھتی ہے، اور اکثر ایک دوسرے کے وجود سے بالکل بے التفات رہتی ہیں، اور ان کو کبھی آپس میں مل جل کر رہنے کا خیال تک نہیں آتا۔

(لیکن چند قومیں ایسی بھی ہیں جو دوسروں کی کافی خبر رکھتی ہیں، ان قوموں کی خود غرضی جامد و ساکن نہیں، ان کو تمام دنیا کی خبر رہتی ہے، اس لئے کہ ان کے اغراض سب سے وابستہ ہیں، یہ قومیں بے شک جماعت بنا کر رہتی ہیں، مگر ایسی جماعت جو صرف "دول عظمیٰ" سے مرکب ہوتی ہے، ان کے نزدیک "ترقی" کا مفہوم یہ ہے کہ انہیں اپنے اعمالِ حرص و ہوس میں کامیابی ہوتی رہے۔)

ان کی اصطلاح میں بربریت و وحشت کا اطلاق اس حالت میں ہوتا ہے، جبکہ اسلحہ جدید ترین طرز کے نہ ہوں، اور تمدن کی اصلی شناخت یہ ہے کہ اسلحہ کی طاقت سے امن قائم رہے، لیکن اگر کمزوروں پر جنگ ہوتی ہے تو کچھ مضائقہ نہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روز بروز زیادہ مہلک و برباد کن آلات تیار ہوتے رہتے ہیں۔

دنیا کے ہر میدان جنگ میں غالب یا مغلوب کی حیثیت سے انہوں نے اپنی مشترک

زندگی اور مشترک موت کا ثبوت دیا ہے، اور اپنا خون بہا بہا کر ایک ناخوشگوار حلقۂ اخوت قائم کیا ہے، لیکن ناگہاں ایک روز یہ خود باہمی منافرت سے نفرت کرنے لگیں گے،

جو درجہ قوم میں فرد کا ہوتا ہے وہی قوم کا نوع انسانی میں ہونا چاہیئے، فرد کی طرح ہر قوم کے جیسے فرائض ہیں ویسے ہی حقوق بھی ہیں، وقت آگیا ہے کہ افراد کے لئے جن فطری حقوق کے مساوی کرنے کا شرف اولیت فرانس کو حاصل ہے، یعنی حریت، مساوات و اخوت، انہیں حقوق کی اشاعت باشندگانِ ارض کے لئے بھی کی جائے، ہر قوم کو خواہ بڑی ہو یا چھوٹی، اپنی زندگی اور اپنی بالیدگی کے لئے پوری آزادی ملنا چاہیئے، کہ ہر قوم اپنے مذاق و مزاج کے مطابق اپنا فشو ونما کر سکے، حق کے سامنے تمام اقوام مساوی ہیں، پس نوع انسان کے پارلیمنٹ میں چند منتخب اقوام کی مخصوص مداخلت کا کوئی حق نہیں، بلکہ اس پر تمام اقوام کا یکساں حق ہے، تمام اقوام ایک دوسرے کے بھائی بہن ہیں، اور سب کے سب، اور گیتی کی اولادیں، وہ دن دور نہیں جب ہر شخص روئے زمین کے تمام ممالک کو اپنا وطن سمجھنے لگے گا، اور جس ملک میں قدم رکھے گا اسے خاندان انسانی کا مسکن پائے گا۔

کیا یہ نصب العین ضرورت سے زائد بلند ہے؟ کیا اس پر عملدرآمد کی توقع موہوم ہے؟ کیا اقوام سے یہ توقع رکھنا موہوم ہے کہ وہ متمدن اقوام بن کر رہیں، متمدن افراد کے اصول اخلاق پر عامل رہیں، اور اس طرح شقاوت و بربریت کا جو ان سب کے لئے بار گردن ہو رہا ہے۔ اس سے ایک دوسرے کو نجات دلائیں،

اگر حریت، مساوات و اخوت کا سررشتۂ اصول قابل قبول نہیں، تو اقوام موجودہ کے لئے مستقبل میں بجز جنگ، بربادی اور غلامی کے کوئی حصہ نہیں، ان کا اختیار ہے کہ وہ خواہ جنگ اور قتل کی آہنی زنجیروں میں بندھا ہوا اتحاد قبول کریں یا امن و آشتی کے آزادانہ برکات اتحاد سے فائدہ اٹھائیں،

امن و صلح، من و سلویٰ کی طرح آسمان سے اترنے والی چیز نہیں، یہ انسانیت کا معلول و ثمرہ ہے، لیکن خود انسانیت سے ابھی تک قلب انسانی ناآشنا تھا، امن کبھی قوت اور زبردستی کی بنا پر نہیں پیدا ہو سکتا جس طرح لینت و ملاطفت کی تخلیق کبھی ظلم و جبر سے نہیں ہو سکتی، پس جنگ کی قوت سے قیام امن ناممکن ہے، لیکن ساتھ ہی دوسری طرف فرقۂ مخالفین جنگ کی کمزوریاں بھی قیام امن میں بے بس ہیں، اس فرقہ کی کوششیں باوجود

اس قدر امید افزا دعاوی کے جتنی ابھی ناکام رہی ہیں شاید پہلے کبھی نہیں رہیں، امن کا مندر تعمیر کیا گیا، لیکن اسی وقت سے دُنیا کی ہولناک ترین جنگ شروع ہو گئی، لیکن آخر اس یورپین کوشش انسداد جنگ کی ناکامی کا سبب؟ سبب صرف یہ ہے کہ اس کا دائرہ صرف یورپ تک محدود رکھا گیا، اس کوشش کا مقصد یہ نہ تھا کہ ساری دُنیا، ساری دُنیا کے ساتھ مصالحت رکھے بلکہ محض یہ خود غرضانہ خیال کہ ہم خود صلح و امن سے بسر کر سکیں، اس وہم باطل کے لئے ناکامی یقینی تھی، قیام امن کی کوشش خارجی ذرائع سے کی گئی، حالانکہ صلح و امن کسی خارجی علت کے معلول نہیں ہو سکتے، اس کی بنیادیں خود نفس انسانی کے اندر ہیں، جنگ کی آفرینش نفس انسانی کے اندر ہوتی ہے، جب وہ انسانیت کی تحقیر کرنے لگتا ہے، امن کی آفرینش بھی نفس انسانی کے اندر ہی ہو سکتی ہے،

قتل و خون ریزی کو ہر حالت میں اور ہر موقع پر حرام قرار دیدینا چاہئیے، یہی ایک صورت دُنیا سے خاتمۂ جنگ کی ہو سکتی ہے .....

کوئی شخص اس وقت تک انسان نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ اس میں انسانیت کی رُوح نہ موجود ہو، یہ انسانیت محض ایک مجرد تصور نہیں بلکہ ایک زندہ ہستی ہے جس کا ایک زندہ جسم ہے اور جس کے اعضا جوارح اقوام عالم ہیں،

وقت آ گیا ہے کہ اس زندہ جسم کے لئے سوچنے والے دماغ کی آفرینش کی جائے، اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہر قوم کے ارباب فکر یکجا ہوں .....

(معارف)

کہکشاں کا ایک سانحہ

حضرت نیاز فتحپوری

(۱)

ہاں، اگر کہکشاں اور ملکۂ کہکشاں پر آسمان کی تمام دُوسری سلطنتوں اور فرمانرواؤں کو رشک تھا۔ تو جائے حیرت نہیں، کیونکہ کہکشاں سے زیادہ شاداب کہکشاں سے زیادہ حسین ملک، حقیقت یہ ہے کہ کرۂ ہوا کے متعلق ملکوں میں کوئی اور نہ تھا۔ یہ ایک ایسا ملک تھا جسے قدرت نے پھُولوں اور پھُولوں میں بھی یاسمین و نیلوفر کی پیداوار کے لئے مخصُوص کر دیا تھا، اور اس میں کلام نہیں کہ اگر یہاں کی فرمانروا ہستی کبھی چند دنوں کے لئے، خاص اسباب یا مصلحت کی بناء پر اپنے ہاں کی اس متبسّم و خنداں پیداوار کی برابر دُوسرے ممالک کیلئے بند کر دیتی تو سارا آسمان اور آسمان کے تمام دُوسرے ملک چیخ اُٹھتے، محافل طرب سنسان ہو جاتیں اور اتنے دنوں کے لئے تمام مراسم تہنیت و مسرت مسدود، کیونکہ آسمانی مخلوق میں اظہار شادمانی و نشر طرب کا مفہوم سوائے اس کے اور کچھ تھا ہی نہیں کہ ہر شخص پھُولوں کے ساتھ ہنسے اور کلیوں کے ساتھ مُسکرائے۔ ہاں اتنے دنوں کے لئے نیند مفقود ہو جاتی اور معابد ویران، کیونکہ بستیوں میں سو جانا صرف یہی تھا کہ پھُولوں کی بیدار شگفتگیوں میں راتیں بسر کر دی جائیں اور وہاں کی پرستش کچھ نہ تھی مگر یہ کہ پھُولوں کو سُونگھ سُونگھ کر معابد کی کنواری لڑکیاں بے ہوش ہو جائیں۔

کہکشاں کا دُوسرا نام بلدۃ النساء بھی تھا کیونکہ یہاں کی آبادی عورتوں، اور صرف عورتوں کی تھی، اور جب دُوسرے ملکوں کے مردوں کو ضرورت ہوتی کہ وُہ یہاں کی لڑکیاں حاصل کریں، تو وُہ التجاؤں کو جنہیں وُہ صرف آہ کی صُورت میں شہاب ثاقب کے ذریعہ سے پہنچا سکتے تھے، ملکۂ کہکشاں کے سامنے پیش کیا کرتے۔ اور اُسے اختیار ہوتا کہ اس مرد کی تمام حیثیات کو دیکھ کر ایک لڑکی منتخب کرے اور کثیر دولت کے عوض میں جو زیادہ تر موتیوں اور جواہر کی صُورت

میں قبول کی جاتی، اُس کے پاس کسی رات اس حال میں کہ وُہ اپنے بستر پر انتظار میں کروٹیں لیتا لیتا کچھ غافل سا ہو گیا ہو دفعتہً پہنچا دے۔ پہلے چند دنوں تک تو یہی دستور جاری رہا کہ لڑکیاں دُوسرے ملکوں میں اس طرح بھیج دی جاتی تھیں اور پھر واپس نہ آسکتی تھیں، لیکن جب یہ معلوم ہُوا کہ کہکشاں کی لڑکیاں دُوسرے ملکوں میں زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتیں تو پھر ملکۂ کہکشاں نے لڑکیوں کو باہر بھیجنا قریب قریب بند کر دیا، اور بجائے اس کے کہ لڑکیاں باہر بھیجی جائیں مردوں کو اجازت دے دی کہ وُہ اپنی مطلوبہ کے پاس مہینہ میں ایک دن رات آکر یہیں بسر کر لیا کریں، ہر چند کہکشاں کے آئین سلطنت و نظام مملکت کے خلاف تھا کہ کوئی مرد یہاں آکر ایک رات بھی گذار سکے لیکن ملکہ نے مجبوراً یہ معلوم کر کے کہ اس کے ملک کا بہترین حسن باہر جا کر فنا ہو جاتا ہے، اپنے قانون میں تھوڑی سی تبدیلی کو گوارا کیا اور اس طرح مردوں کی آمد و رفت کہکشاں میں شروع ہو گئی، اگر اس مواصلت "یک شب بہ ماہے" کا نتیجہ اولاد نرینہ کی صُورت میں ظاہر ہوتا تو مرد مجبُور کیا جاتا کہ اسے اپنے ملک میں لیجائے اور اگر لڑکی ہوتی تو یہیں رکھ لی جاتی اور مرد کو بالکل اختیار نہ ہوتا کہ وُہ کبھی اس کے لئے جانے کی خواہش کرے۔ الغرض کچھ اس قسم کا تھا نظام مملکت کہکشاں کا اس وقت جبکہ ملکۂ لالہ رُخ وہاں حکمراں تھی۔

یہ ملکہ کچھ تو اس دولت پر مغرور ہو کر جو بے اندازہ و بے شمار اس کی سلطنت میں ہر جگہ بکھری ہُوئی نظر آتی تھی اور کچھ اس خشونتِ مزاج کی بنا پر جو اس کی فطرت تھی ہر وقت چیں بہ جبیں نظر آتی اور یہ بات تمام جو سما میں اس قدر مشہور ہو گئی تھی کہ مردوں کو اپنی التجائیں پیش کرتے خوف معلوم ہوتا تھا اور بارہا ایسا ہُوا کہ اُس نے اگر وُہ کسی وقت خوش نہ ہوئی، ان درخواستوں کو بغیر سمجھے ہُوئے رد کر دیا، اور اس پر ایک لمحہ کے لئے بھی تاسف نہ کیا، تاہم اُسے مردوں سے نفرت نہ تھی اور یہ جذبہ اُس کے دل میں ابھی پیدا نہ ہُوا تھا کہ ایک رات جب کہ وُہ کسی تاثر سے مغلوب و ملول تھی، اس کا شوہر ملک عطارد کا بادشاہ آیا اور وُہ اس طرح کچھ مسرور سی نظر آنے لگی، لیکن آدھی رات گذر جانے کے بعد جب لالہ رُخ نے اس کو لیٹ جانے پر مجبُور کیا اور اس نے نہیں سُنا کیونکہ وُہ اشعہ نگہت پر اپنے جدید تجربات کو جو اسی دن حاصل ہُوئے تھے جلدی جلدی لکھ رہا تھا کہ

کہیں بھول نہ جائے، تو اس کو مردوں سے نفرت بھی ہو گئی اور اسی واقعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کی آمد و رفت اس نے بالکل بند کر دی اور رسم مناکحت قاطبۂ مہدود جس زمانہ کا ہم ذکر کرتے ہیں وہی زمانہ تھا جب لالہ رُخ کے سامنے یا کہکشاں کے ملک میں کہیں اور مرد کا نام لینا بھی سخت جرم سمجھا جاتا تھا، اُس نے حکم دیدیا تھا کہ اُس کے دربار میں، اُس کے ملک میں کسی جگہ مرد کا ذکر بھی نہ کیا جائے۔ اور مرد کی اس خود غرض جنس کو جو، اگر عورت نہ ملے تو یکسر اضطراب و اضطرار ہے۔ اور اگر مل جائے تو سراپا غفلت و پندار بالکل بھلا دیا جائے کہ اب یہ جنس پیدا ہونا ہی بند ہو گئی ہے جس وقت ملکہ کہکشاں نے یہ اعلان اپنے ملک میں شائع کیا اُس وقت اُس کی لڑکی ریحانہ کی عمر صرف دو سال کی تھی اور اس لئے اس کا نشو و نما ایسے زمانہ میں ہوا جب مرد کا وجود کہکشاں میں مفقود تھا اور اس کا ذکر ممنوع۔ اس اعلان کو پندرہ سال ہو گئے اور لالہ رُخ نے باوجود اس کے کہ تمام سلطنتوں نے اپنے آہ و شیون سے سارا آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ اپنے ارادہ کو بالکل متزلزل نہ ہونے دیا اور وُہ اپنے عہد پر بدستور قائم رہی۔

(۲)

شاہزادی ریحانہ اپنے حسین بالوں کے سیاہ و دراز ریشم کو پیٹھ پر منتشر کئے ہُوئے بیاض گردن کی نہ چھُپ سکنے والی برق صبیح کی عُریانیوں کو ان بادلوں کی آغوش میں چھُپائے ہُوئے، اپنے یاسمین زار شانہ و دوش پر یہ آبشار سنبلیں لئے ہُوئے ساحل بحر پر کھڑی دیکھ رہی تھی کہ جب آفتاب سمندر کے اندر سے تازہ نہایا ہُوا باہر نکلتا ہے تو کائنات کی ہر چیز اس کی پذیرائی کس طرح کرتی ہے، وُہ صبح کی ہلکی ہلکی ہوا میں اس طرح جنبش کھا رہی تھی جیسے ساحل پر ایک سرو زرین جھوم رہا ہو، اُس کے بالوں کی نرم نرم جنبش، ہوا کے ساتھ بالوں کے چھوٹے چھوٹے چھلوں کا پیٹھ پر گھوم گھوم کر رہ جانا کچھ اس درجہ لطافت پیدا کر رہا تھا کہ انہیں دیکھ کر یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ بال ہیں، بلکہ وُہی ہوا کی ہلکی ہلکی موجیں ہیں جو ریحانہ کی پشت اور شانہ و دوش کو چھو چھو کر سیاہ ریشمی لچھوں میں تبدیل ہوتی جاتی ہیں، ایک چادر جو صرف جوہی کے پھُولوں کو گھاس کے تنکوں میں پرو کر اور تنکوں کو باہم ایک دُوسرے سے ملا کر تیار کی گئی تھی، اس کے بلور

سے شفاف جسم کو لپیٹے ہوئی تھی، اس کے گورے گورے ہات شانوں تک کھلے ہوئے تھے

. . . . . .

. . . . . ہاں وہ اس وقت سپید پھولوں کے اس ملبوس میں جو اس کے جسم پر اک ہلکے گلابی رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا تھا، اپنے حسین اعضا کے تناسب کو بغیر اس خواہش کے کہ انہیں پوشیدہ رکھے، کسی کی نگاہوں میں اک حریص جستجو، اک پُرشوق نفوذ کی کیفیت پیدا کرے۔ چھپائے ہوئے طلوع آفتاب کے نظارہ کو اپنی نگاہوں کے مس سے شاندار بنا رہی تھی، وہ آفتاب کے ارغوانی چہرہ میں خدا جانے کیا چیز ایسی محسوس کر رہی تھی کہ ٹکٹکی باندھے کھڑی ہوئی تھی، وہ اس وقت کے خاموش منظر میں جب کہ سمندر کی لہریں ضیاء آفتاب کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں ایک طرف خاموشی سے مصروف تھیں، تنہا نہ تھی۔ لیکن اس کی کنیزیں جو دور ایک مودب فاصلہ پر کھڑی ہوئی شاہزادی کی اس محویت کو اپنے اندر سکوت و خاموشی میں تبدیل کئے ہوئے دم بخود کھڑی تھیں کچھ بول نہ سکتی تھیں کیونکہ شاہزادی کے سکوت میں دخل دینا ریحانہ ایسی جلیل القدر شہزادی کے انہماک میں بات کرنا خلاف آداب تھا، وہ جنبش نہ کر سکتی تھیں، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ جب ریحانہ کا جسم کسی خاص وجہ سے حرکت کو قبول نہ کرے تو انہیں بھی اپنی اپنی ہستیوں کو مجسمہ بنا لینا چاہئیے۔ اس وقت تک کہ ریحانہ خود ہی اپنے چشم سامری فن کے اشارہ سے ان میں جان ڈال کر بولنے کی اجازت نہ مرحمت کرے، صنوبر اپنے بربط کو اور سنبل اپنے ارغنوں کو ہاتھوں پر لئے ہوئے ریحانہ کے قریب ہی پیچھے کھڑی ہوئی تھیں اور منتظر تھیں کہ شاہزادی اس طرف مخاطب ہو تو اپنے نغمہ صباحی کے ہدایائے لطیف کو پیش کریں لیکن شاہزادی کی کیفیت وہی قایم رہی یہاں تک کہ صنوبر سنبل تھک گئیں، اور ان کے نازک ہاتھوں سے ساز چھوٹ کر زمین پر گر پڑے اور تار کے جھنکار نے ریحانہ کے خیال کو اپنی طرف مائل کیا، سنبل و صنوبر دونوں کھڑی کانپ رہی تھیں گویا التجا کر رہی تھیں کہ اگر ساز کے اندر بلا اجازت آہنگ ارتعاش پیدا ہو گیا ہے تو ہمارے جسموں کی تھرتھری پر رحم کھا اور معاف کر دے۔ ہمارے اعضا کی کپکپی کو دیکھ اور سمجھ لے کہ تیرے ساز کے تاروں کا ارتعاش ہم نے ہوا میں نہیں مل جانے دیا بلکہ اپنے جسم پر طاری کر لیا ہے اور اس طرح ہم مستحق عفو ہیں۔ صنوبر و سنبل نے چاہا

کرا پنے کانپتے ہُوئے ہاتھوں سے اپنا اپنا ساز اُٹھائیں، لیکن ریحانہ نے منع کر دیا، اور کہا کہ نہیں ان کو یوں ہی پڑا رہنے دو جب ساز سے نغمہ جُدا ہو جائے، جب موسیقی تاروں سے برہم ہو کر اپنا التفات ہٹا لے تو پھر ساز کا ٹوٹ جانا اور تاروں کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ہی خوب ہے، صنوبر تیرا ربط اور اے سنبل تیرا رغنوں پہلے ہی کب میری تسکین تھے کہ اب انہیں پھر درست کر کے میرے کانوں میں خراش اور میرے دل میں اضطراب پیدا کیا جائے گا"

ریحانہ کو گفتگو کرتے ہُوئے دیکھ کر بنفشہ بڑھی اور اپنے دامن کے پھُولوں اور کلیوں کا ایک انبار اس کے قدموں پر ڈال کر ادب سے خاموش کھڑی ہو گئی، ریحانہ نے سر سے پاؤں تک بنفشہ کو دیکھا اور بولی کہ کیوں تو نے اس نازک مخلوق کو صدمہ پہنچایا یا جب کہ ان کی نکہت کی خنکی مجھے مسرور نہیں کر سکتی، میرا بدن آپ سرد ہے، میرا خون خود رگوں میں جما جاتا ہے، تیرے باغ میں آتشیں پھول نہیں، تیرے چمن میں کوئی درخت ایسا نہیں، جو اپنی شاخوں سے انگارے پیدا کرے اور تو انہیں لا کر مجھے دے کہ میں انہیں اپنے سینہ سے لگا کر دل کی تپش میں کمی، اور ہونٹوں سے چھو کر ان کی جنبش میں کچھ تو سانس کی حرارت محسوس کروں۔ ہاں، اے سوسن تو ہر رات میرے سرہانے بیٹھ کر اپنے افسانوں سے میری پلکوں کو ایک دُوسرے سے ملا دینے کی کوشش کیا کرتی ہے، چلی جا اور اس وقت تک میری خوابگاہ میں آنے کا ارادہ نہ کر جب تک تو مجھے یہ نہ بتا سکے کہ بُلبل ایک پھُول کے لئے کیوں سر دھنا کرتا ہے، ایک بھونرا کلی کو اپنی آغوش میں لے لینے کے لئے کیوں اس درجہ بے تاب نظر آتا ہے، ایک فاختہ کے سامنے دُوسری فاختہ کیا چیز مست ہو ہو کر سُنایا کرتی ہے، ایک طائر کے ساتھ دُوسرا طائر کیوں خوش خوش نظر آتا ہے، جب کہ تم میں سے کسی کی بات اب مجھے پسند نہیں آتی اور نہ کسی کی معیت مجھے مسرور کر سکتی ہے، میں تم سے پوچھتی ہوں تم صرف ایک دُوسرے کا منہ تکنے لگتی ہو، میں کہتی ہوں جواب دو تم گردن جھکا لیتی ہو، میں جانتی ہوں کہ تم سب مجھ سے کوئی بات چھُپانا چاہتی ہو، اچھا تو جاؤ، سب جاؤ آج میں تنہا سمندر کے اندر لہروں کی آغوش میں اپنی کشتی سونپ دوں گی، اور کوشش کروں گی کہ اُس ساحل پر جا کر اگر کوئی ساحل اُس طرف ہے اِس ساحل کی اذیتوں

کو بھلا دوں۔ کنیزیں منہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں، اور ریحانہ جلد جلد قدم اُٹھا کر اپنے تئیں کشتی کی آغوش میں اور کشتی کو سمندر کی آغوش میں آنا دانہ چھوڑ کر نگاہوں سے غائب ہو گئی

(۳)

آفتاب جو صرف چند ساعتوں کے لئے ملک کہکشاں کی زمین پر چمک کر غائب ہو جاتا تھا، تھوڑی دیر میں سمندر کے اندر کہیں غرق ہو گیا اور ریحانہ کے سر پر ہالوں کے جھرمٹ نے اپنا نورانی سایہ ڈالنا شروع کیا، کہکشاں کی مملکت میں پورا چاند کبھی طلوع نہ ہوتا تھا، بلکہ وہ اتنے ہالوں کی صورت میں جتنے ایک پورے چاند سے تیار ہو سکتے ہیں ایک زنجیر ہلال کی صورت میں نمودار ہوا کرتا تھا، اس وقت سمندر پر سمندر کی موجوں پر ایک سکون طاری تھا اور کوئی ہلکی سی ہلکی آواز بھی علامت حیات کا پتہ دینے والی کانوں میں نہ آتی تھی، ریحانہ جس نے اس سے قبل کبھی ایسی جسارت نہیں کی تھی جس نے اس وقت تک کبھی اپنے تئیں تنہا نہ دیکھا تھا گھبرا گئی، ڈر گئی، وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح واپس جائے اور رات کے اس سنسان منظر سے جو اس پر مستولی ہوتا نظر آ رہا تھا کسی طرح سمٹ کر الگ ہو جائے۔ وہ اسی فکر میں تھی کہ دفعتہً سمندر کی سطح میں اس نے ایک جنبش محسوس کی اور پانی کے اندر سے نہایت تیز اور لانبی لانبی شعاعوں کو نکلتے ہوئے اور اُس کی کشتی کو چھوتے ہوئے دیکھا، اُس نے معلوم کیا کہ ان شعاعوں کا اثر کشتی پر اس طرح ہوتا ہے جیسے کوئی ہات سے اُسے دھکیلے اور یوں ساحل کی جانب اُس نے بڑھنا شروع کیا۔ وہ اس منظر سے جو اس لئے عجیب و غریب تھا بہت متاثر ہوئی اور تھوڑی دیر کے لئے بالکل بھول گئی کہ یہ شعاعیں اُسے کہاں لئے جا رہی ہیں اور کیوں وہ اسی خیال میں مستغرق، اسی لذت میں سرشار تھی کہ کشتی دفعتہً ساحل سے ٹکرائی اور ریحانہ اس طرح اکبارگی خشکی پر جا پڑی جیسے کسی نے اُٹھا کر پھینک دیا ہو، نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس صدمہ سے کتنی دیر بے ہوش و بے حس و حرکت پڑی رہی، لیکن جس وقت اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے ایسا محسوس کیا کہ اس کا سر کسی آغوش میں ہے اور اُس کے جسم کو کوئی چیز مس کر رہی ہے، وہ سمجھی کہ یہ کوئی خواب ہے اور نہایت پر لطف خواب کیونکہ باوجود رات کی خنک ہواؤں کے وہ اپنے اندر اس آغوش سے گرم گرم شعاعوں کو سرایت کرتی محسوس کرتی تھی، اور چاہتی تھی کہ اسی طرح پڑی رہے اور ہمیشہ

اس خواب کو دیکھتی رہی ہے، اُسے کسی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ وُہ کبھی کبھی یہ معلوم کرتی تھی کہ اس کے لبوں کو کسی چیز نے چھوا، اس کے جسم کو مس کیا وہ ہر مس کے ساتھ اپنے خون کے اندر ایک عجیب پُر مزہ حرارت نفوذ کرتی ہوئی پاتی تھی، مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وُہ چھونے والی چیز وہ اس کے جسم سے مس ہونے والی کیا شے ہے وُہ رات بھر اسی حال میں پڑی رہی اور صبح کو جس وقت آنکھ کھلی تو اس نے رات کی پُر مزہ کیفیات کی کوئی علامت اپنے پاس نہ پائی سوائے ایک تحریر کے جو اس کے بالوں کی ایک لٹ سے بندھی ہوئی تھی اور جسے ریحانہ نے پڑھنا شروع کیا۔

"اے ریحانہ، اے ملکۂ کہکشاں کی بیٹی تجھے خبر نہیں کہ تیرے لئے تجھ سے دُور کسی دوسرے ملک میں کیا کیا اضطراب برپا ہے، تیرا افسانۂ حسن رات کے تارے مجھے روز سُنایا کرتے تھے میں کڑھا کرتا تھا کہ تجھے کس طرح دیکھوں، کیونکہ لکھوں کہ میرے شوق کا کیا حال ہے اور میرے اضطراب کا کیا رنگ تیری اتنی عمر جو میری جنس کے ذکر سے ناآشنا ہونے کی حالت میں گزر گئی ہے کیونکر وفعتہً تجھے سمجھنے دے گی کہ میں کون ہوں، اور تیرے لئے کیوں اس قدر بے تاب تو افسوس ہے کہ جذبۂ محبت سے بالکل بے گانہ ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک بیگانہ رکھی جائے گی، ورنہ تو سمجھتی کہ محبت کیا ہے اور محبت ایک شخص کو کس قدر تڑپا سکتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو میرے پاس ہو اور کبھی جُدا نہ ہو، بے تاب ہوں کہ تو میرے پہلو میں ہو اور میں تجھے وُہ نغمۂ محبت سناؤں جس کے سُننے کے لئے تیری ہستی کا ایک مجہول گوشہ اپنے اندر لئے پھرتے ہے، لیکن ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ ملکۂ کہکشاں نے مردوں کی آمد و رفت اپنے ملک کے اندر ممنوع اور ان کی التجاؤں کے لئے در قبول کو بند کر دیا ہے اور اس طرح اگر اس نے ایک طرف آسمان کے تمام دُوسرے ملکوں میں بے چینی پھیلا رکھی ہے تو دوسری طرف خود اُس کے ملک میں بھی اک خاموش ماتم بپا ہے وُہ چاہتی ہے کہ مرد عورت سے نہ ملے، کہکشاں کی کوئی لڑکی کسی مرد کی صورت نہ دیکھ سکے۔ اس لئے میں کہ مرد ہوں کیونکر خواہش کر سکتا ہوں تیری کہ تو عورت ہے۔ آج جب کہ تو ساحل پر کھڑی ہوئی آفتاب کی شعاعوں کو اپنی نگاہیں، اپنے جسم کا رواج، اپنے بدن کا گداز چوسنے کی اجازت دے رہی تھی میں بھی تجھے افق سے دیکھ رہا تھا، درشن۔ ہاتھ جوڑ اپنی کنیزوں سے کہہ رہی تھی میں نے تجھے سمندر میں جاتے ہوئے دیکھا اور تڑپ گیا کہ آج شاید وُہ وقت آ گیا ہے کہ تجھے اپنے

شوق کی کہانی سناؤں اپنا افسانہ محبت تجھ سے بیان کروں، شام ہوئی۔ اور میں نے تیری کشتی کو اپنے ہاتھوں پر لے کر ساحل تک پہنچا دیا، تو بے ہوش تھی، اور میں کہہ رہا تھا جو کچھ مجھے کہنا تھا، تو بے حس و حرکت پڑی تھی اور میں بیان کر رہا تھا جو کچھ مجھے بیان کرنا تھا، میں نے رات بھر اپنے شوق کی کہانی اپنے لبوں سے تیرے لبوں کو، اپنے ہاتھ سے تیرے جسم کو سنائی، لیکن میں اپنی صورت تجھے نہ دکھا سکا۔ کیونکہ میں ایسا نہ کر سکتا تھا۔ ملکۂ لالہ رُخ کی اجازت حاصل کئے بغیر اس کے ملک میں میری اور کسی مرد کی صورت تیرے اور کسی عورت کے لئے مرئی نہیں ہو سکتی۔ اب میں جاتا ہوں اور بتائے جاتا ہوں کہ اگر تجھے اب موسیقی میں کوئی لذت حاصل نہیں ہوتی، اگر تجھے پھولوں کی خوشبو اب مسرور نہیں کر سکتی۔ اگر افسانوں میں اب تیری راحت پنہاں نہیں ہے، تو حیرت نہ کر، کیونکہ وہ موسیقی جس سے عورت کی جوانی لذت حاصل کر سکتی ہے صرف نغمہ عشق ہے، وہ خوشبو جو ایک لڑکی کے شباب کو مسرور کر سکتی تھی صرف نگہت محبت ہے اور وہ افسانہ جو تیری عمر کی ایک دوشیزہ لڑکی کے لئے راحتیں مہیا کر سکتا ہے وہ صرف افسانہ پرستاری ہے جو تجھے اب کہکشاں کے ملک میں نصیب نہیں ہو سکتا! اپنی ماں سے پوچھ کہ یہ سب کہاں سے میسّر آئے گا اگر یہ سُن کر وہ تجھ سے برہم ہو جائے تو یقین کر لینا کہ اگر وہ میری دشمن ہے تو کچھ تیری بھی دوست نہیں اور پھر تجھے اختیار ہے چاہے اپنی ماں کے اُن مظالم کو اپنے اور میرے لئے قایم رہنے دے چاہے ہمیشہ کے لئے اس کی ہو جا جو تیرے لئے اتنا ہی بیقرار ہے جیسی تو ایک نامعلوم شے کے لئے۔"

ریحانہ اس تحریر کو پڑھ کر اچھی طرح سمجھ بھی نہ چکی تھی کہ اس کی ماں کنیزوں کے ایک ہجوم کے ساتھ دفعتہً آگئی اور اس کو اپنے گلے سے لگا کر ساتھ لئے ہوئے چلدی۔

(۴)

ملکۂ کہکشاں اپنے قصر میں خاموش و متفکر بیٹھی ہوئی سوچ رہی ہے کہ ریحانہ کے دل و دماغ سے اس غم کو کیونکر دُور کر سکے، جس کے متعلق وہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ کیونکر پیدا ہوا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس وقت تک مرد کا نام بھی ریحانہ کے سامنے کبھی نہیں لیا گیا۔ اس کو یقین تھا کہ کوئی افسانۂ حسن و محبت ریحانہ کو اس وقت تک نہیں سُنایا گیا۔ پھر ریحانہ نے یہ سوال اس سے کیوں کئے اور کہاں سے اس کو معلوم ہو گیا کہ مرد

اور محبت کا بھی دُنیا میں کوئی وجود ہے۔ میں نے بہت پُوچھا لیکن اُس نے نہیں بتایا۔ وُہ کہتی ہے کہ خواب میں اُس نے کچھ دیکھا اور سُنا ہے اور اس وقت سے اس کے دل میں اک خاص اضطراب کی کیفیت پیدا ہے۔ مگر خواب دکھانے والا۔ نیند کو آکر بے چین کرنے والا سوائے شاہزادہ قمر کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تو کیا میں اپنے عہد پر اب ثابت قدم نہیں رہ سکتی کیا میں مجبور ہو جاؤں گی کہ اپنی ریحانہ کو ظالم و خود غرض مرد کے سپرد کر دوں صرف اس لئے کہ جب وُہ سیر ہو جائے تو اس کا دل دکھانے لگے اور جب اس کی خواہشات پوری ہو جائیں تو وُہ تنفر کرنے لگے۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا مجھے منظور ہے کہ ریحانہ اس غم میں گھل گھل کر ہلاک ہو جائے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ میں مرد اس ظالم و خود غرض مرد کی نفس پرستیوں پر اپنی بیٹی یا اپنے ملک کی کسی لڑکی کی قربانی کو جائز رکھوں۔ اس نے اپنی اک کنیز سے ریحانہ کو طلب کیا اور بولی کہ:-

"اے ریحانہ یقیناً مرد کی ایک جنس ہے جو تیری پیدائش سے قبل یہاں آمدورفت رکھتی تھی اور جس سے ہمارے ملک کی لڑکیاں ملتی جلتی تھیں میں نے ان کی ادائیں پسند نہیں کیں اور ان کا آنا جانا بالکل بند کر دیا اور حکم دے دیا کہ میرے ملک کی لڑکیاں اس کا ذکر بھی نہ کریں، کیونکہ یہ جنس جس کے لئے تیرے دل میں اک خلش اک جستجو پیدا ہوئی ہے بڑی خود غرض جنس ہے اور ہرگز اس قابل نہیں کہ اس پر اعتماد کیا جائے، اس کی محبت جھوٹی اس کے وعدے نااستوار اس کی باتیں سخت ناقابل اعتبار ہیں، وُہ بے تاب رہتے ہیں کہ ہماری جنس کا کوئی فرد ان کو مل جائے، لیکن صرف اس لئے کہ اس کی شیفتگی کی لذت کچھ دن حاصل کر کے اس کی طرف سے بے پروا ہو جائیں، پھر یہ کلی کو کچھ دیر دیکھ کر مل ڈالنے والا طبقہ، یہ پھول کی خوشبو سے چند لمحے مسرور ہو کر اُس کی پنکھڑیاں توڑ کر منتشر کر دینے والا گروہ، اگر اب بھی کسی چمن کے اندر اپنی پذیرائی کرنے والی کلیاں، اپنی نمائش شیفتگی پر مٹ جانے والے پھول رکھتا ہے، تو ایک باغبان کا فرض ہے کہ وُہ ان کلیوں، ان پھولوں کو گلبن پر یوں ہی خشک ہو جانے دے، اور اس لئے اے ریحانہ اگر آج میں تیری خواہش پوری کرنے پر راضی نہیں ہوں کہ مرد کا حال تجھ سے بیان کروں یا تیرے کسی شوق کی رعائیت ملحوظ رکھ کے اس کی

صورت تجھے دکھاؤں تو مجھے معذور سمجھ کہ میرے چمن ہستی کی کلی صرف تو ہی ایک ہے اور میرے باغ حیات کا پھول صرف اِک تیرا وجود اور اس لئے میں گوارا نہیں کر سکتی کہ وُہ میرے سامنے یوں تباہ و برباد ہو اور میں خاموش دیکھا کروں، مجھے معلوم ہے کہ تیرے دل کے اندر یہ خلش کیونکر پیدا ہوئی اور وُہ کون ہے جو تجھے مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے، لیکن یہ یقین کر لے کہ مَیں اپنے عزیز سرمایۂ مسرت و راحت کو یوں ارزاں و آسان نہ جانے دوں گی اور اپنی زندگی میں یہ کبھی روا نہ رکھوں گی کہ تجھے خود اپنے ہات سے زندہ دفن کر دوں، دیکھ اے ریحانہ تو ایسی بات کے لئے ملول نہ ہو جو اگر تجھے آج حاصل ہو جائے تو کل اور زیادہ ملول کر دے تو ایسی چیز کے لئے مضطرب نہ ہو کہ اگر وُہ تجھے صبح کو میسّر آ جائے تو شام کو وُہ تیرے اندر اور اضطراب پیدا کر دے"

وُہ اپنی تقریر کو ختم بھی نہ کر چکی تھی کہ دفعتہً دربار کے اندر ایک بقعۂ نور پھیل گیا اور شاہزادی ریحانہ اس کے اندر وہی شعاعیں دیکھ کر جنہوں نے اس کی کشتی کو ساحل تک پہنچایا تھا مبہوت و متحیر رہ گئی، ملکۂ لالہ رُخ نے فوراً سب کو رخصت کر دیا، کیونکہ وُہ سمجھ گئی تھی کہ یہ شاہزادۂ قمر کا پیام ہے جو ریحانہ کے لئے آیا ہے اور اس نے یہ پیغام سننے اور جواب دینے کے لئے اپنے تئیں معہ چند خاص کنیزوں کے کمرے کے اندر بند کر لیا +

(۵)

ریحانہ پھولوں کے بستر پر پڑی ہوئی اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں ان کے خوشبو کے ساتھ فضا میں منتشر کر رہی تھی، زنجبیر ہالی اس کے سامنے جگمگا رہی تھی اور وُہ اپنی نگاہوں میں ان کی برودت سے آنسوؤں کے ننھے ننھے موتی بنا بنا کر پلکوں سے ڈھلکا رہی تھی کہ دفعتاً اس کی دایہ آئی اور ریحانہ کو اس قدر مغموم و افسردہ دیکھ کر بے تاب ہو گئی، اس کو ریحانہ سے بڑی الفت تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح اس کے غم کو دُور کر سکے۔ لیکن اس کے بس میں نہ تھا کہ وُہ ملکۂ لالہ رُخ کو اس عزم سے ہٹا دے یا ریحانہ کے دل سے اس جذبۂ مہلک کو دُور کر سکے، ہفتوں گزر گئے اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور اس طرح ریحانہ کی حالت بد سے بدتر ہو گئی، اُس نے اپنے تمام مشاغل تفریح ترک کر دیئے اور

ساری خواہشیں محو، اگر اس کا جی چاہتا تھا تو صرف اس بات کو کہ ایک بار وُہ پھر اسی طرح کشتی میں تنہا نکل جائے، اور پھر ساحل پر بے ہوش ہو کر اسی خواب کو دیکھے جس کی لذتوں سے وُہ اب بھی اپنی ہستی کو لبریز اور اپنے دل کو مالا مال پاتی تھی لیکن وُہ ایسا نہ کر سکتی تھی، کیونکہ ملکۂ کہکشاں نے سخت ممانعت کر دی تھی اور بغیر اجازت قصر سے باہر قدم بھی نہ نکال سکتی تھی، اس غم نے ریحانہ کو بالکل نڈھال اور اس سوگ نے اس کو بالکل بے حال کر رکھا تھا جس کو دیکھ کر اُس کی دایہ کڑھتی تھی، اور پریشان کہ کیا کرے۔

ایک رات جب کہ ریحانہ کی بے قراریوں کی کچھ انتہا نہ تھی اس کی دایہ سے نہ دیکھا گیا اور بولی کہ:-

"اے ریحانہ بتا میں کیا کروں، میں آمادہ ہوں کہ تیری ماں کی بالکل پرواہ نہ کروں اگر اس طرح تیری مسرت واپس آ سکے مجھ سے اب یہ تیرا حال نہیں دیکھا جاتا، اُس دن جب شاہزادۂ قمر کا پیام تیرے لئے آیا تو میں نے دبی زبان سے کہا تھا کہ یہ رد نہ کیا جائے لیکن ملکہ نے نہیں مانا اور مجبوراً مجھے خاموش رہنا پڑا" ریحانہ یہ سُنکر چونک پڑی اور بولی کہ:-

"شاہزادۂ قمر کیا اور کہاں ہے، کیا میں اُسے دیکھ سکتی ہوں اور وُہ مجھ سے کیا چاہتا ہے دایہ نے کہا "اے ریحانہ آسمان کی تمام مخلوق میں، کرۂ ہوا کی ساری آبادی میں قمر سے زیادہ حسین شاہزادہ کوئی نہیں۔ وُہ بھی ایک وسیع سلطنت کا مالک ہے اور تم اسے تو نہیں لیکن اس کے چند خادموں کو ہر رات دیکھتی ہو اور اب بھی دیکھ رہی ہو

یہ ہالوں کا جھرمٹ جو تم اپنے ملک میں اس وقت درخشاں دیکھ رہی ہو اسی کے ادنےٰ ملازم ہیں" ریحانہ نے کہا اگر یہ اُسی کے خادم ہیں تو پھر کیوں انہیں واپس بلا کے کہکشاں کو تاریک نہیں کر دیتا" دایہ بولی:- کہ یہ اصُول نظام کے خلاف ہے، جب ایک ملک کے بعض خادم یا کارکن دُوسرے ملک میں چلے جاتے ہیں تو پھر واپس نہیں آ سکتے مثلاً جب کرۂ ارض میں راتیں تاریک ہوتی ہیں تو کہکشاں کے تمام قطعات گلزار مجبور ہو جاتے ہیں کہ رات بھر کھلے رہیں، اور اس طرح زمین کی تاریکی کو کچھ کم کر سکیں۔ اب اگر ملکۂ کہکشاں چاہے بھی تو اس کے خلاف نہیں ہو سکتا اور یہ ممکن نہیں کہ یہ اپنی خدمت کو جو زمانۂ قدیم سے چلی آتی ہے چھوڑ دیں، یہی تو بات ہے کہ ہماری ملکہ اس طرف سے مستغنی ہے ورنہ آج سارے کہکشاں میں اندھیرا ہوتا

اور کہکشاں کے تمام سمندروں کا مدوجزر مفقود۔

ریحانہ: (بیقرار ہو کر) اچھا تو تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ شاہزادہ قمر بہت حسین ہے؟

دایہ: اس کا اندازہ تم خود کر سکتی ہو کہ جس کے ادنیٰ خادم ایسے ہوں گے وہ خود کیسا ہوگا۔ وہ تو اس درجہ حسین ہے کہ اس کی ہر گفتگو شعاع ہے اور اس کا ہر لمس درخشندگی۔

ریحانہ: ہاں میں سمجھ گئی اس رات جب میں تنہا کشتی میں چلی جا رہی تھی تو اس نے مجھ سے گفتگو بھی کی تھی، اور اس نے میری کشتی کو چھوا بھی تھا کیونکہ میں نے ایسی درخشاں شعاعیں اس سے قبل کبھی نہیں دیکھیں، اچھا تو کیا میری مدد تم کر سکتی ہو۔ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بار پھر اس ساحل پر پہنچ جاؤں، آہ کاش یہ میری تمنا ایک بار اور پوری ہو سکتی۔"

ریحانہ نے یہ کہا اور بیقرار ہو کر زار زار رونے لگی۔

(۶)

سارے کہکشاں پر ایک سکون مطلق طاری تھا، رات کے سناٹے میں ہر چیز اپنی اپنی جگہ مصروف خواب تھی، ہلال اپنی متین و سنجیدہ شعاعوں کو سمندر کی سطح پر پھیلائے ہوئے پانی کی موجوں میں جھولا جھول رہا تھا اور ریحانہ اپنی کشتی میں خاموش تنہا بیٹھی ہوئی چلی جا رہی تھی وہ متحیر تھی کہ آج وہ شعاعیں کیوں نمودار نہیں ہوتیں آج اس کی کشتی کو ساحل کی طرف کیوں نہیں کوئی لے جاتا۔ کیا شاہزادہ قمر اب ملتفت نہیں رہا۔ کیا وہ اپنی رات کو اسی طرح بے کسی کے عالم میں سمندر پر تیر کر گزار دے گی وہ سخت مضمحل تھی اور نہایت آزردہ کہ دفعتہً سمندر ایک نہایت تیز نورانی لہر کے ساتھ شق ہوا اور کشتی تیر کی طرح سمندر کی تہ کی طرف خود غرق ہوتی چلی گئی۔

سب نے، ساری کائنات نے تمام آسمان والوں نے، آسمان کی ہر ہر مخلوق نے دیکھا کہ کہکشاں کا ایک نہایت ہی منور و درخشان تارہ ٹوٹا اور بہت دور تک ایک سیمیں خط بناتا ہوا چلا گیا۔ کہکشاں کا رنگ پھیکا پڑ گیا، لیکن سارا آسمان جگمگا اٹھا، تمام دنیا چمک اٹھی کچھ دنوں تک دیکھا گیا کہ ایک تارہ چاند کے پہلو میں جلوہ گر ہے، اور اب بھی کبھی کبھی نظر آ جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قمر نے اس کی وہ عزت نہیں کی جس کا وہ مستحق تھا، اس سے وہ محبت نہیں کی جس کی توقع کی جاتی تھی، کبھی کبھی چند راتوں کی صرف چند ساعتوں میں اس افسانۂ محبت کی یادگار ہماری نگاہوں کے سامنے نمودار ہو کر غائب ہو جاتی ہے۔

آہ کیسی دردناک ہے اُس دل کی داستانِ محبت جو اپنے محبوب کے لئے اپنی زندگی کی محفل کو اُجاڑ دے، اپنی ہستی کی ساری رونق بزمِ خاک میں ملا دے صرف اس توقع پر کہ محبت کا جواب صرف محبت سے دیا جاتا ہے صرف اس امید پر کہ جس جلوۂ محبت کے نوید سے دل کو گرویدہ بنایا گیا وُہ ہمیشہ قایم رہنے والی چیز ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہوتا اور کیسی خطرناک ہے وُہ داستانِ شوق جو ایک نازک دل والی کو صرف اس لئے سُنائی جائے کہ وُہ اس کی تاب نہ لا سکے گی، اور رو دے گی، وُہ اس کو سُنے گی اور اس کو صحیح جان کر اپنی زندگی کو قربان گاہِ قریب پر چڑھا دے گی، حالانکہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر اظہارِ تاسف نہیں کیا جاتا کہ ہم اپنی ایک ادنےٰ خواہش کے لئے کیسی کیسی حسین صُورتوں کو برباد، کیسی کیسی بلند فطرتوں کو پست و ذلیل کر دیتے ہیں۔ سچ ہے دُنیا میں عورت محبت کرتی ہے صرف اس لئے کہ وُہ محبت پر مجبُور ہے اور مرد محبت کرتا ہے صرف اس لئے کہ وُہ اس پر مسرور ہے۔ پھر یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وُہ مجبوری جاتی رہے اور ہمیشہ ہوتا ہے کہ یہ مسرت ناپائدار ثابت ہو۔ (از کہکشاں اگست ۱۹۱۸ء)

برسات

(ایک صحرانشین کے نقطۂ نظر سے)

(۱)

ساون کی وُہ سیاہ رات، رات کی وُہ امنڈ پڑنے والی تاریکی، وُہ پہاڑوں اور جنگلوں کو ہلا دینے والی گرج اور پھر اُس کے تاریک پردہ سے فطرت کا وُہ زہرہ گداز تبسم برق، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب اس رات کی صُبح کبھی نہ ہوگی، یہ بارش کائنات کی ہر چیز کو بہالے جائے گی، یہ گرج آسمان و زمین کو پاش پاش کر دے گی اور یہ برق تمام عالم کو پھونک کر رکھ دیگی، اے انسانی آبادیو، مجھے یقین نہیں کہ تم آرام و سکون کے ساتھ اس وقت زندگی بسر کر رہے ہوگے، مجھے معلوم ہے کہ تمہارے بدن کانپ رہے ہوں گے، تمہارے دل لرز رہے ہوں گے، تمہاری جانیں گھُل گھُل کر تحلیل ہو رہی ہوں گی، اور تمہارے سینے اس منظرِ فطرت کے حسین رُخ سے بے خبر دہل رہے ہوں گے، لیکن میرے غار میں آؤ اور سنگین فرش پر بیٹھ کر اُس

حُسن کا نظارہ کرو جس کو تمہارے محلوں کی اُونچی دیواریں، تمہارے کمروں کے بھاری بھاری پردے اور تمہارے دلوں کی بند آنکھیں نہیں دکھا سکتیں یہ نگاہوں کے سامنے غیر محدود وسعت کا رفیق میدان، یہ غیر متناہی بسط والی سیال زمین، مجھ سے پوچھو کہ جب بجلی دفعتاً آسمان کو شق کرتی ہوئی تمام عالم کو منور کر دیتی ہے، تو اُس روشنی میں سبزہ کا ہوا کے ساتھ لہریں سی لینا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تمام صحرا، سارا میدان ہچکولے کھاتا ہوا چلا جا رہا ہے، لیکن بجلی کے گم ہو جانے کے بعد اُس تاریکی میں بھی میری نگاہ کا بڑا جزو اُس درخشان منظر کے ساتھ ساتھ ہے، وُہ ہوا کی سرسنسناہٹ، وُہ آبشار کی پرشور روانی، وہ کبھی کبھی درندوں کی ہولناک آواز اور غار کے اندر ان تمام باتوں سے لطف اُٹھانے والی تنہا میری جان۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر میں نہ ہوں تو یہ سارا نظام بدل جائے۔ ہوا ساکن ہو جائے، آبشار کا پانی جم جائے، بجلی مچلنا اور بادل پانی برسانا چھوڑ دے۔ میں کیسا خوش ہوں کہ اس منظر سے لطف اُٹھانے والا سوائے میرے اور کوئی نہیں ہے کہ اپنی نگاہ سے اس کو جھوٹا کر دے۔ میں ہوں اور فطرت کے یہ مناظر، میری نگاہ ہے اور ان مناظر کی یہ دوشیزگی۔ اگر میرے غار میں پانی بھر رہا ہے، تو بھرنے دو، کہ قدرت میرے مسکن کا فرش دھو رہی ہے اور میرے پاس کوئی سامان نہیں کہ اس کی تباہی کا درد مجھے بے تاب کر دے، اگر سرد ہوا سے میرا جسم کانپ رہا ہے تو کانپنے دو کہ صبح گرم آفتاب کا نکلنا صرف اسی پر منحصر ہے، اگر میرے بدن کو گرمی پہنچانا مقصود نہ ہو تو وُہ نکلے کیوں +

اے محفوظ محلوں میں آرام کرنے والو، اپنی زندگی پر تاسف کرو کہ تمہارا حصّہ اس میں نہیں ہے سو جانے کے بعد ایک ساون کی مست رات بھی اُسی طرح عالم بے خبری میں بسر ہو جاتی ہے۔ جس طرح گرما کی خشک گھڑیاں پھر تمہیں کیا معلوم کہ زمانہ کا کونسا لمحہ تم سے بیداری چاہتا تھا جسے تم نے غفلت و خواب کی کروٹوں میں بسر کر دیا۔ جس وقت صبح کو بارش بند ہو جاتی ہے۔ تو تم اپنے سامان و اسباب کے جائزہ اور اُس کی بربادی کے ماتم میں مصروف رہتے ہو، اور میں ایک شفاف چشمہ کے کنارے اطمینان سے اس پھیلے ہوئے سکون کو دیکھتا رہتا ہوں جو اس وقت موجوں کے اضطراب کے ساتھ بھی بہتا نظر آتا ہے، آہ، مجھ سے پوچھو کہ جس وقت صبح اپنے کاسۂ طلائی میں شراب زرچھلکاتی ہوئی نکلتی ہے، تو اس وقت میری تنہائیاں، پہاڑ کی ویرانیاں صحرا کی وسیع خلوت زاریاں اُس سے کیسی شرابور ہو جاتی ہیں تمہارے آئینے صرف تمہاری بگڑی ہوئی صورتوں کو پیش کر سکتے ہیں، آؤ میرے ساتھ اس چشمہ میں فطرت کے اُس

حسن کا مطالعہ کرو جس کو کبھی زوال نہیں اُس دلکشی میں غرق ہو جاؤ جس کو کبھی انحطاط نہیں تمہارے اسباب تعیش گراں ہیں اور ناپائیدار، میرے سامان تفریح مفت ہیں اور لازوال، اُس سے تم تھک جاتے ہو کہ وُہ بہت محدود ہیں اور تنگ، اس سے میں اپنے اندر ایک سچا جوش، ایک حقیقی مسرت پاتا ہوں کہ یہ وسیع ہیں اور غیر محدود۔

(۲)

افق بعید کے وُہ ساحر بادل جن کے حیات بخش کناروں سے آفتاب کی کرنیں چھو کر آبشار رنگ میں تبدیل ہو جاتی ہیں، اُس وقت جبکہ شفق کی ارغوانی شراب ساری وادی کو کناروں تک لبریز کرتی ہُوئی بہ نکلتی ہے، ہاں مجھ سے پُوچھو کہ پہاڑ کی چوٹی پر ایک سنسان اور ویران جھوپڑے میں وُہ بادل مجھے کیا نظر آتے ہیں۔ میں اپنی آنکھوں میں طوفانی رنگ کی روشن لہروں کو لئے بیٹھا رہتا ہوں اور ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میری آنکھوں سے اس وقت موسیقی نکل نکل کر تمام وادی کو گونجا رہی ہے، پہاڑ اور اُس کے درختوں کا سکوت وادی اور اُس کی گہرائی کی خاموشی، پانی اور اُس کی موجوں کا سکون۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا اس موسیقی میں ڈوب کر سو گئی ہے۔

میری وُہ ایک چیز جو غار کی تنگ آغوش اور تاریکی کے ایک محدود قفس میں اپنی وسعت کو سمیٹے ہوئے پڑی سو رہی تھی، اس وقت بیدار ہو کر انگڑائی لیتی ہے اور آفتاب کے چہرہ سے نقاب زر اُٹھا کر اُس کا منہ چُوم لیتی ہے، اور اس کی کرنوں کے ساتھ ساتھ آغوش سحاب میں کھل کھلا کر گر پڑتی ہے، اور پھر روشنی کی ہلکی ہلکی موجوں کے ساتھ میری آنکھوں میں اُتر آتی ہے اور خون میں رقص کرنے لگتی ہے، اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ رُوح ہے، یہ حیات ہے، اس کا نام زندگی و زندگانی ہے، میں اس وقت غار میں، غار کے چاروں طرف، پہاڑ میں، پہاڑ کے ہر ہر جامد پتھر میں، درخت میں، درخت کی ہر ہر پتی میں، زمین میں، آسمان میں، ساری کائنات میں اور خود اپنے اندر ایک جنبش ہیولائی محسوس کرتا ہوں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کے اندر اس وقت شباب موجزن ہے، اور اگر کوئی ایک چیز دُوسری سے مل گئی تو پھر کبھی جُدا نہ ہوگی۔

کسے خبر ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس وقت میری پلکوں کی ہر جنبش ایک آغوش ہے جو کامیابی سے معمور اور معموری سے مطمئن نظر آتی ہے۔

آزاد اور سچی موسیقی کی لذتیں، پاک و غیر آلودہ مسرت کا جوش۔ نزاکت و لطافت کی فراوانی مکلف محفلوں، آراستہ مجلسوں اور اُن افسردہ و مضمحل آغوشوں میں نہیں ہے جن کو صرف تمہاری دولت نے مہیا کیا ہے، ادھر آؤ، اس شفق کے سمندر میں شاخ بلوط کی موج کو دیکھو اور رشک کرو اس شما پر جس کی ننھی سی منقار سے نکل کر سچی موسیقی کی روشنی تمام دُنیا میں پھیل جانا چاہتی ہے، سنجورِ نغمہ سے کائنات معطر ہے،

وُہ صنوبر کی چوٹی پر فاختہ کا جوڑا، یہ معصوم و پاک محبت کا اظہار، یہ طمانیت قلب، یہ جمع خاطر، معلوم ہوتا ہے کہ فطرت اُس کے سکون مسرت کو لیکر ہر ہر ذرہ پر چھڑک رہی ہے، یہ جنگلی پھولوں کی شراب لالہ رنگ سے بھرے ہُوئے کٹورے! تیتری سے پوچھو جو ابھی ابھی ایک جرعہ پی کر اپنے رقص سے فضا کو مست بنائے ہوئے ہے۔ یہ ناز ک پتیوں کی شاداب و مسکراہٹ بھنبھیریوں کو دیکھو اور اُن کی مخمور تھرتھری سے ارتعاش نگاہ کو! کیا تمہاری شرابِ رنگین نے کبھی یہ موج پیدا کی ہے؟

مَیں تو یہی سمجھتا ہوں۔ اچھا اگر غلط ہے تو مجھے بتاؤ، اپنی تمدن کی دلچسپیوں میں میرے لئے کوئی کشش پیدا کرو، اپنے مادی اسباب طرب میں میرے دل کے لئے کوئی جاذبیت ثابت کرو، میری رُوح کو اپنی مسرتوں کی طرف کھینچ لو، مجھے اپنی لذتوں کی طرف بُلا لو اگر بلا سکتے ہو۔ تم کو اگر میری ویرانِ زندگی پر افسوس ہے، اگر میری تنہائیوں یا میری بے سروسامانیوں پر تم اپنا دل دکھاتے ہو تو اپنی متمدن حیات، اپنی عشرت سامانیوں، اپنی محفل طرازیوں پر اُس تنغص و انحلال کو پہلے دُور کر دو، جس سے ہر صبح تمہاری رُوح مغلوب نظر آتی ہے تم اپنے اندر اک تھکن محسوس کرتے ہو اور چاہنے لگتے ہو کہ کچھ زمانہ کے لئے اپنے اسباب طرب سے جُدا ہو کر کہیں اور زندگی گذار دیجائے۔

مَیں تو اپنی صبح و شام سے کبھی بیزار نہیں ہوتا، میرے رات دن تو مجھ میں کبھی حزن و ملال پیدا نہیں کرتے، تمہاری مادیت ایک فریب ہے، خدا کے لئے میری روحانیت کو اس میں مبتلا نہ کرو، فطرت کی طرف سے مجھ میں خواہش انحراف نہ پیدا کرو، میری زندگی مجھ سے چھیننے کی کوشش نہ کرو کہ میرے نزدیک۔

(حیات نام ہے صرف اُن تاثرات کا جو مناظر فطرت کی اچھوتی فضا میں پیدا ہوں اور اسی میں تحلیل ہو جایا کریں۔)

(نگارستان)

گلستان

(جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم بی۔ اے (آکسفورڈ) مسلم یونیورسٹی)

آج سے دس ہزار برس قبل کا ماجرا ہے۔ بحر ہند میں ایک جزیرہ تھا جو اب ناپید ہے چاندنی رات تھی، سطح آب پر سکون مطلق طاری تھا اور اس سکون پر چاند اپنی شعاعیں ڈال رہا تھا۔ فضا میں خاموشی، بے پایان سمندر، ڈراؤنی تنہائی، وحشت انگیز سکوت، کوئی صدا نہیں، کوئی اثر حیات نہیں۔ ایک غیر محدود مگر روشن تنہائی، ایک محشر سکون! یہ عالم ہے۔ چاند خاموشی کے ساتھ گویا سوچ رہا ہے، موجیں بھی سوچ رہی ہیں، چاند کی کرنوں کے سیلان سے بچا ہوا سایہ سوچ رہا ہے، بادلوں کے منتشر ٹکڑے سوچ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا، اس خاموشی کا بھید چپکے چپکے سمندر کے کان میں کہنا چاہتی ہے اور نہیں کہہ سکتی! سمندر کا سینہ سانس لینے کی کوشش کرنا چاہتا ہے، تمام موجودات میں گویا ایک کروٹ لینے کی خواہش معلوم ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بے پایان سستی اور سکوت میں اگر کہیں سے ذرا سی صدا بھی آجائے تو دنیا ہنس پڑے گی، اچھل پڑے گی۔

نسرین نوش جزیرے کے دامن میں، سمندر کے ریت پر ایک سرو زرین کی طرح جو زمین پر گر پڑا ہو لیٹی ہوئی تھی کہ موجوں میں کچھ حرکت پیدا ہوئی، اور وہ نسرین نوش کے عریاں جسم، چاند جیسے عریاں جسم پر، گردن پر، بانوں میں سے گزرنے لگیں، ادھر سلسبیل قمر اس کے بدن پر پڑ رہی تھی، ادھر چھوٹی چھوٹی موجیں ایک دوسرے کو ہٹاتی آتی تھیں اور اس سیمیں تن کے کبھی بالوں میں سے گزرتی تھیں، کبھی اس کے گورے بازوؤں سے لپٹتی تھیں۔

کبھی اس کے ارغوانی پاؤں کو سہلاتی تھیں، اور اسے چوم چوم کر آگے چلی جاتی تھیں، اور پھر لوٹ کر آتی تھیں اور فرط سجدہ سے موتی لا لا کر اس کے پاؤں پر نثار کر کے نہایت تعظیم اور احترام کے ساتھ واپس جاتی تھیں۔

نسرین نوش ایک پُر لطف تھکن سے، ایک بیہوش نشہ سے آہستہ آہستہ بیدار ہوتی! اس کے چاروں طرف جو پریاں ایک ہالہ بنائے کھڑی تھیں، ان پر نظر ڈالی، اور اپنے لعل لبوں سے برق تبسم گرا کے کہا، "میری پیٹھ ملو"۔ اس پر چند خدامہ تعمیل حکم میں مصروف ہوئیں،

اور اس کے بعد چند اور پریاں جو ریشمی تولیا، چادر وغیرہ لئے کھڑی تھیں، انہوں نے اُس کے بازوؤں، سینے اور پاؤں کو پونچھنا اور بالوں کو سُکھانا شروع کیا۔ نسرین نوش اس شاہراہ زرّین کو جو چاند نے اس تک بنا رکھی تھی، دیکھنے اور موجوں کی ارگن کو سننے لگی۔

اتنے میں ایک قسم کی چھوٹی پریاں، صدف بحر کی بنی ہُوئی نفیریاں اور دف اور سارنگی اور ستار غرض کہ پُورا ساز لئے ہُوئے نسرین نوش کے گرد اُڑنے اور ستار بجانے لگیں، نسرین نوش اُٹھ کھڑی ہُوئی اور ماہتاب کی طرف ہاتھ بڑھا کے، اس رات کے لئے اسے "خدا حافظ" کہا اور اپنی سہیلیوں کے کبھی کندھوں پر ہاتھ رکھ کے، کبھی ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے، پھُولوں سے چھپے ہُوئے راستے پر نسیم کی طرح خرام ناز سے چلنا شروع کیا۔

اس وقت پھُول جُھک جُھک کے سلام کرتے تھے، اور ایک دُوسرے سے ٹکر کر گویا تالیاں بجاتے، بنفشہ اس کے پاؤں چُومنے اور روندے جانے کی تمنّا سے راستہ میں آپڑا تھا، نسرین نوش پانچ منٹ تک چلی ہوگی کہ ایک کاشانۂ بلّور میں داخل ہوئی۔

چاند کا عکس اس محل کی کُل دیواروں، اور صحن کے فوارے پر پڑتا تھا، اور اس فوارہ نور سے ایک زمزمۂ رُوح نواز پیدا ہو رہا تھا۔ حوض کے کنارے نیبو، نارنگی، ترنج کے پودے پھُولوں سے لدے ہُوئے دماغ کو فرحت دے رہے تھے، یہ سب ایک دسترخوان پر بیٹھ گئیں، زبرجد کے طباقوں میں طرح طرح کے کھانے اور میوے لائے گئے، خُرمے، انار، انگور، سیب، شکار کے گوشت، مچھلیاں لائی گئیں، لالے کے پیالوں میں شراب، شربت، گلاب پیئے گئے۔

حوض کے دُوسری طرف، ناچنے والیوں، گانے والیوں نے ایک حلقہ باندھا، اور رباب، مزمار، بربط، ستار پر نسرین نوش کے حسن اور ادا کی تعریف میں قصیدے، غزلیں، ٹھمریاں گانی شروع کیں، گانا بھی وُہ گانا جو ایک جوئے رواں کی طرح مسلسل تھا۔

ادھر سہیلیوں نے چھیڑ خانی شروع کی، رفتہ رفتہ لالوں، اور پھُولوں کو پھینک کے لڑائی شروع ہُوئی، اور تھوڑی دیر میں پھُولوں سے زخم کھا کھا کے پریاں گرنے لگیں۔

لذیذ شراب کے نشہ سے نسرین نوش ہنستی ہوئی ایک سہیلی کی گود میں گر پڑی، اور اپنے ہونٹ چُوس چُوس کر نظر اس طرح دور دور ڈالنے لگی، گویا عالم خیال میں ہے، سہیلیاں، اپنی مالکہ کے ہاتھ چُوم چُوم کے، اُس کے پاؤں کی خوشبو سے دماغ معطر کر کے شراب کا ایک ایک گھونٹ پیتی تھیں۔

نشہ کا خمار چڑھنا شروع ہوا تھا کہ ناچنے والیوں کو پھر حکم ہوا۔
ساز پر پریوں کا ایک خاص ناچ، ایک رقیق، نازک، لوزانی ناچ ناچا گیا۔
وُہ گلابی، چمپئی، دھانی، ریشمی ساڑھیاں جو پریوں کے سڈول جسموں سے لپٹی ہُوئی تھیں، وُہ اس ناچ کے چکروں میں ملکر طرح طرح کے نئے رنگ پیدا کرتی تھیں، پریاں تیتری کی ہلکی پرواز کی طرح اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر ٹھمک ٹھمک کے آتی جاتی تھیں۔ کبھی وہ ایک دوسرے سے ملیں کبھی علیحدہ ہو جائیں، کبھی دو کے درمیان میں سے تیسری گذر جائے کبھی حلقہ بندھ جائے کبھی ٹوٹ جائے، اس ملنے، جُدا ہونے چکر کھانے سے رنگ اور نور کا اختلال اور اجتماع ایسا مختلف ہوتا جیسے ہشت پہلو شیشے میں آفتاب کی کرنیں گزر رہی ہوں ان پریوں کا تھرک تھرک کر ملنا، پھر تتر بتر ہو جانا، شانوں کا ہلنا، بالوں کا بحر سنبل کی طرح لہرانا، نازک کمروں کا لچکے کھانا، جُھک جُھک کے دُہرا ہو جانا، یہ سب باتیں سلیس دلیغ گتوں سے (جو ساز ندے پریاں بجا رہی تھیں) مل کر ایک نشہ آور منظر پیش کرتی تھیں۔ کہ کان موسیقی اور رقص میں تمیز نہیں کر سکتے تھے اور آنکھ نہیں بتا سکتی تھی کہ آیا موسیقی رقص کر رہی ہے، یا رقص نغمہ ساز ہے، کیا ہو رہا ہے۔

نسرین نوش ان تمام تموجات رقص و آہنگ کو، ایک سہیلی صبح خنداں کے زانو پر سر رکھے ہُوئے ایک بے پروا، لاابالیانہ نگاہ سے دیکھ رہی تھی، اور ایسا نظر آتا تھا کہ وُہ ان چیزوں کی طرف زیادہ ملتفت نہیں، کیونکہ اس کی نگاہ کسی دور نقطہ پر گڑی ہُوئی تھی۔
یہ ٹیپ ٹاپ، یہ ناچ گانا، وُہ رات دن دیکھتی تھی، اس لئے اُس کی رُوح خفتہ کو جگانے یا اس کی دل میں حرکت پیدا کرنے کے لئے یہ کافی نہ تھے۔

اس رات محل میں داخل ہونے کو اُس کا دل نہ چاہا! اس کی طبیعت میں چاند کو دیکھ دیکھ کر یہ اُمنگ پیدا ہوتی تھی کہ اس کے جسم سے جاکر لپٹ جائے، وُہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی سہیلیوں نے، اس کی طبیعت بہلانے کے لئے لطیفے، کہانیاں بوجھ پہیلیاں کہنی شروع کیں، کہ چاند اور سورج میں کیسی دوستی ہے۔ شہد کی مکھیاں پھول سے کیا کہا کرتی ہیں، بھونرا چنبیلی کے کان میں کیا بھنبھنایا کرتا ہے، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اُن نورانی آنکھوں میں نیند آنی شروع ہُوئی، اُس کے نرم جسم کو سہلا سہلا کے،

اُس کے دماغ کو تھپکا تھپکا کر ہلکے ہلکے بادلوں کے نیچے بھاگتے ہوئے چاند کو پیش نظر کر کر کے غرض کہ عجب عجب دھوکے دے دے کے، نیند اُس کی آنکھوں میں چپکے سے آگئی اور اُن گھنی پلکوں کو ملا دیا۔

نسرین نوش کا نیند میں جانا تھا کہ ناچ بند کر دیا گیا، لطیفے پہیلیاں ختم ہو گئیں۔ نہ صرف یہ بلکہ فوارے بند ہو گئے، وہ عندلیب جو پنجرے میں بیٹھی گا رہی تھی، چپ ہو گئی؛ ہوا کی سنسناہٹ بند ہو گئی، تاکہ نسرین نوش آرام سے سوئے، تمام رامشگر پریاں، سہیلیاں دبے پاؤں علیحدہ ہو گئیں، گھونگرو آہستہ آہستہ اُتار ڈالے گئے، اتنے میں سفید بازوؤں والی چھوٹی چھوٹی پریاں حلقہ باندھ کے آئیں، اور نسرین نوش کے گرد اُڑنے لگیں۔ اُن کے پروں سے کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ یہ پریاں نسرین نوش کی نگہبان تھیں۔

دو تین منٹ بعد ایک بڑھیا درختوں سے نکل کے جریب ٹیکتی ہوئی آہستہ آہستہ نسرین نوش کے پاس آئی اور نسرین نوش کے بدن پر جو چادر ڈال دی گئی تھی، اُسے چہرہ پر سے ہٹا کر غور سے دیکھنے لگی۔ اُس کے سوکھے چہرے پر آثار اطمینان ظاہر ہوئے اور "الحمدللہ" کہہ کے جیسی آئی تھی ویسی ہی غائب ہو گئی۔

یہ نسرین نوش کی ماں تھی۔ اپنی لڑکی کو نہایت احتیاط اور بدگمانی سے رکھتی تھی، اور اس طرح پر ہر شام کو آ کر تحقیقات کرتی تھی۔

یہ معمر عورت سوچا کرتی تھی کہ: "میرے بالوں کو سفید کرنے والے، میرے دانتوں کو گرانے والے، میرے چہرے کو خراب کرنے والے یہ مرد ہی تو ہیں، ان کے ظلم ہی تو ہیں، اپنی اولاد کو میں ان مصیبتوں سے بچاؤں گی۔ اسی لئے میں اس لڑکی کو اس جزیرے میں لائی ہوں۔ اُسے کھیل تماشے، دل بہلاوے، ہنسی دل لگی، آرائش و نمائش سب کچھ دوں گی، لیکن مرد کیا شے ہے، یہ نہ جاننے دوں گی، وہ فلاکت جس کا نام مرد ہے، اُسے اس کے قریب نہ آنے دوں گی، لیکن اگر ڈر ہے تو اتنا کہ مجھے اطلاع ہوئے بغیر اس جزیرے میں کوئی مرد نہ آ جائے، بہرحال اس وقت تو میری کل تدبیریں مکمل ہیں اور میرے دل کو اطمینان ہے۔"

ماہتاب دھیما ہو ہو کے غائب ہو گیا، مگر نسرین نوش کے جسم نازک کو نور طلوع آفتاب کے سپرد کرتا گیا۔ سفید بازوؤں والی نگہبان پریاں ہٹ گئیں، اور اُن کے بجائے سہیلیاں،

اور گانے والی آگئیں، جنہوں نے نرم و نازک آواز سے اُسے جگانے کے لئے پیاری پیاری راگنیاں گانا شروع کیں۔ تھوڑی دیر میں نسرین نوش نے اپنی مخمور آنکھیں کھول دیں، اور انگڑائیاں لیتی ہوئی اور اپنے پریشان بالوں کو سنوارتی ہوئی اُٹھ بیٹھی، پھر ایک صاف شفاف نہر کے کنارے، نیلوفر کے پھولوں کی ایک چوٹی پر جاکر بیٹھ گئی، پریاں بھی آکر اُس کے گرد جمع ہوگئیں۔

مشاطہ پریوں نے نسرین نوش کا سنگار کیا۔ نسرین نوش نہر کے صاف پانی میں اپنے عکسِ جمال کو دیکھ رہی تھی۔ تیتریاں ایک دُوسرے کا پیچھا کرتی ہُوئی اُڑ رہی تھیں، نہر کی روانی سے نرم صدا پیدا ہو رہی تھی، سہیلیوں نے پھر ہنسی کی باتیں شروع کیں، جن کو سُن کر وُہ پیارے باریک ہونٹ تبسم میں کھِل کھِل جاتے تھے۔

سہیلیوں اور خادمہ پریوں کے نام گل چکاں، زہرہ جبین، ناز آفریں، موج نور، بعضوں کے نام پھُولوں پر مثلاً نیلوفر، سوسن وغیرہ، بعضوں کے پرندوں کے اوپر، مثلاً طاؤس خرام، کبک ادا، وغیرہ وغیرہ تھے اور ان سب کے نام اور عنوان کے مناسب ان کا لباس تھا۔

سنگار کے بعد، اس صبح کے لئے ایک خاص رنگ کا لباس پہن کر نسرین نوش نیلوفر کے پتّوں کی کشتی میں بیٹھ کر سہیلیوں کے ساتھ تھوڑی دُور تک نہر میں گئی، پھر یہ سب کنارے پر پہنچیں، جہاں بلّور اور پھُولوں کی ایک بگھی تیار کھڑی تھی، اس بگھی میں دو مادہ سیمرغ جُتی ہوئی تھیں، اور اس انتظار میں کہ اُن کی مالکہ بگھی پر سوار ہوگی، آمادہ روانگی کھڑی تھیں، جوئے رواں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نسرین نوش گاڑی میں سوار ہوئی، اور جُوئے رواں کو اپنے پاس بٹھا کر "دیارِ گُل" کو چلنے کا حکم دیا۔ اس حکم کے سُنتے ہی چند چھوٹی چھوٹی پریوں نے جو چھوٹے چھوٹے بگل لئے کھڑی تھیں، کُوچ کا بگل بجایا، اور اس تزک و احتشام کے ساتھ سواری روانہ ہوئی، سامنے طاؤس، کبوتر، قمریاں، طوطی، ناچتے، ہوا میں اُڑان بھرتے، گاتے چہچہاتے اور طرح طرح کے تماشے کرتے جاتے تھے۔

سڑک پر پھُول کی پتّیاں، گلال اور چاندی کے ذرّے بکھرے ہُوئے تھے، جو پہیوں کے چلنے سے اُڑ اُڑ کر گاڑی کے بلّورین پہیوں میں، پرندوں کے پروں میں جم جاتے تھے، اور اس قافلہ پر قوسِ قزح کا رنگ پیدا ہو جاتا تھا۔

آفتاب، اُفق سے اپنے نورانی بالوں کو سنوارتا ہُوا، کچھ اُونچا ہوا تھا کہ یہ قافلہ اس بلدۂ شعر و خیال میں جسے نسرین نوش نے "دیارِ گل" کہا تھا، پہنچا۔ یہاں کی وادی حقیقتاً وادیٔ گل تھی۔ نسرین نوش کی تشریف آوری کی خوشی میں، تمام غنچے ایک دم کھل گئے اور اُن کی خوشبو نکل نکل کے اُس کے جسم کو، کندھوں کو، چہرے کو احاطہ کر کے چُومنے لگی، نسرین نوش گاڑی سے اُتری، اسکے میں سہیلیاں، نوکرانیاں، اور سازندے وغیرہ بھی پہنچ گئیں۔

اب نسرین نوش نے اس زمان و مکانِ لطافت میں آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا، سہیلیاں، تعظیم اور احترام کے انداز سے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں، اُونچے درخت بھی اس ملکۂ ملاحت کے سامنے جُھک جُھک کر اُس کی خدمت میں پھول پیشکش کرتے تھے، اور نسرین نوش اُن پھولوں کو اپنے ان پیارے ہاتھوں سے (جن میں اور پھولوں میں صرف اس قدر فرق تھا کہ یہ پھولوں سے زیادہ خوبصورت تھے) چھو چھو کر سہیلیوں کو ایک عظمت آمیز نیم غمزہ سے حکم کرتی تھی کہ "انہیں توڑو"، زہرہ جبین، گل پیکاں کی گود ان پھولوں سے بھر گئی، ان پھولوں کا ایک تاج بنایا گیا، جسے نسرین نوش نے پہنا۔ غرض کہ اس طرح، نسیم صبح کے ساتھ اور نسیم صبح کی مانند سب آہستہ آہستہ چل کے ایک اُونچے موقع پر پہنچیں، جو مطلع آفتاب کے مقابل تھا۔ نسرین نوش کھڑی ہو کر آفتاب کی طرف جُھکی اور پھر سیدھی ہو گئی، زاں بعد اپنے ہاتھ کو چُوم کر گویا سورج کو ایک بوسہ بھیجا۔ یہ ایک آئین آفتاب پرستی تھا، اس بوسہ کے بھیجتے ہی، سہیلیاں ہنس ہنس کے، دوڑ دوڑ کے ایک دُوسرے سے لپٹ لپٹ کے، بالوں میں پھول لگا لگا کے، ہاتھوں میں پھولوں کے پنکھے ہلا ہلا کے، نازک کمروں کو بل دے دے کر آنکھوں کو شرارت سے پھرا پھرا کے، نسرین نوش کے گرد چکر لگانے لگیں، پھر کھڑی ہو کر آفتاب کی شان میں گانے گانے لگیں۔ پھر ان سب نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر کبھی ہوا میں اُڑ کر، کبھی زمین پر پاؤں مار کے آفتاب کے لئے ایک مستانہ ناچ ناچا، اور ایک دلربا گانا گایا، اس گلبانگِ رقص و آہنگ کی لطافت میں درخت بھی جھوم جھوم کے، نسیم آہستہ آہستہ چل کے شریک ہوئی، پھول، درخت، ہوا، سب حالت وجد میں آ گئے۔

نسرین نوش اس نشہ شعر کی کیفیت سے لذت یاب معلوم ہوتی تھی، اور اس

آئین آفتاب پرستی میں دل سے شریک تھی۔ آخر میں اس کو ختم کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ختم کرنے پر پریاں دل سے راضی نہیں تھیں، کیونکہ آئین ختم ہوتے ہی درختوں کی شاخوں میں پھولوں میں بنے ہوئے جھولے ڈالے اور اڑ اڑ کے ایک جھولے سے دوسرے جھولے پر جانا، جھولنا، ہنسنا، اور کودنا اچھلنا شروع کیا، ایک مدت تک اس طریقہ سے وقت گزرا۔

آخر کار نسرین نوش پھر گاڑی پر سوار ہوئی، اور اسی انتظام کے ساتھ واپس ہو کر کاشانۂ بلور میں جو دسترخوان کھانوں سے حاضر تھا، اس پر مع سہیلیوں کے بیٹھی۔

غرض کہ دن اس طرح گزرتے تھے۔ اکثر نسرین نوش صبح کے کھانے کے بعد قیلولہ کرتی تھی، اور تیسرے پہر کو شکار کے لئے نکلتی تھی۔ نازک پیار سے ہاتھوں میں تیر کمان لے کر کبھی کبھی مشق تیر اندازی کرتی تھی، کبھی غروب آفتاب کے قریب ساحل بحر پر غسل کیلئے جاتی تھی، اور تیر اندازی کے بعد تھکن اتارنے کے لئے گلاب یا بنفشہ کا ابٹنا مل کے، سمندر میں نہاتی تھی، رات کو سہیلیوں کو بلا کے گانا، پہیلیاں، کہانی وغیرہ سے دل بہلاتی تھی، کبھی کوئی بحث شروع ہو جاتی، اور یہ مزمزہ مکالمہ کبھی پُر حدت ہو جاتا گویا ایک منبع شفاف سے پانی گر رہا ہے، کبھی تیز اور بلند قہقہہ کی آواز آتی، گویا ساز زور سے بجا، کبھی آہستہ آہستہ باتیں ہوتے ہوتے خاموشی طاری ہو جاتی، گویا بادِ نسیم پھولوں میں ہلکے ہلکے چل کے رک گئی چاندنی رات ہوتی تو ایک دو سہیلیاں ساتھ لے کر سیر کو نکل جاتی، اس وقت نسرین نوش کا چلنا، اس نہر کے پانی کی مانند ہوتا تھا، جو بلور کی زمین پر بہ رہی ہو اور جس کے پانی کو معطر نسیم جنبش دے رہی ہو، جس کے کنارے پھول کھلے ہوں، اور بلبلیں اڑ رہی ہوں۔

نسرین نوش پانچ برس کی تھی جب اس جزیرے میں پہلے پہل آئی تیرہ برس سے اسی طرح، خوشبوؤں میں، آرام میں، ناز و نعم میں، بے فکریوں میں، لاڈ پیار میں زندگی بسر کر رہی ہے، اور مجہول، غیر مجسم خیالات میں مستغرق رہ کر، دن ہنسی کے ساتھ، اور رات متبسم خواب میں گزارتی ہے۔

لیکن ایک صبح خلاف معمول اس کے دل میں ایک جلن محسوس ہوئی، اٹھی، کاشانۂ بلور کے قریب جو نہر بہتی تھی اس تک گئی اور نہر کے اندر جا کر لیٹ گئی اور دیر تک اس میں بے حرکت پڑی رہی، پھر نکل کے اور بدن کو سکھا کے، سفید ریشمی بستر پر جا لیٹی۔

نسرین نوش پر ایک سخت نیند غالب ہوئی، اور وہ شام تک سوتی رہی یہاں تک

کہ سورج ڈھلا، سورج کی شعاعیں اُس پر آکر پڑیں اور وُہ جاگی، اُس وقت اُس کی طبیعت ایک ایسی شے چاہتی تھی، ایک ایسے مبہم وجود کی آرزو کر رہی تھی جو اُس کے بازوؤں کو پکڑے، کمر کو سنبھالے، اُس کے جسم کو اُٹھالے، ایک غیر معنی تمنا اس کے دل میں پیدا ہو رہی تھی، اور اس کا دل چاہتا تھا کہ ایک ذات، ایک وجود آئے، جو اس پر قادر ہو، جو اس پر حاوی ہو،

اس نے دیکھا کہ اُس کے پاس ایک سفید براق ہنس پھر رہا ہے، اُسے ہی اُس نے گود میں لیا، اور اُس کے سفید سینے کو اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا لیا، اور اس کی گردن کو اپنی گردن سے ملا دیا۔ اور اپنی تمام قوت سے اسے بھینچنا شروع کیا۔ اور اس طرح پرندے کے نرم پروں میں، اپنی آنکھوں کو کچھ کھولے، کچھ بند کئے بدن کو جھکائے دیر تک بے حرکت پڑی رہی۔

نسرین نوش، ان خوشبوؤں سے، اُن رنگوں سے، اُن پھولوں سے، ان کھیل تماشوں سے، اُکتا گئی تھی، اور اُن سے چھٹکارا چاہتی تھی۔

اب پھولوں کا اُس پر نثار ہونا، اُس کی رُوح کو مشغول نہ کرتا تھا، ناچنے والیوں کے ناچ اور عشوے اور غمزے اس کے دل کو نہ بہلاتے تھے، سہیلیوں کا اس کے بدن کو ملنا، اُسے آرام نہ دیتا تھا۔ وُہ ایک شے تلاش کرتی تھی جسے وُہ نہیں جانتی تھی کہ وُہ کیا ہوگی کیا نہ ہوگی ایک مبہم چیز چاہتی تھی جو اُسے دُکھ دے، اُس کے دل میں درد پیدا کرے، اُسے مسل ڈالے، ایک ایسی پُر قوت، پُر جرأت شے کہ باوجود اُس کے حسن و جمال کے، باوجود اس کے کہ وُہ جزیرے کی ملکہ تھی، اس سے نہ دبے، اُس کے زیر میں نہ آئے بلکہ اُسے پکڑے، اُسے مارے، ٹکڑے کر ڈالے۔

(مخزن)

اے مادرِ وطن

(سید سجاد حسین سابق ایڈیٹر اودھ پنچ)

(ایک ترک کا خطاب اپنے وطن سے)

تیرے بچے، مصیبت و فلاکت کے سمندر کی سب سے زیادہ تاریک گہرائیوں میں ڈوب رہے ہیں، اُن کے سینوں سے خون کے فوارے نکل رہے ہیں، اور وہ دل خون اور سینہ چاک تیرے مہیم مگر نرم قلب میں جمع ہوتے ہیں۔ اپنے سینے کو کھول، اے تیرہ خاک! اور اپنے شہیدوں کے لئے جنہوں نے تیرے چھوٹے سے روڑے کی خاطر، لمبے لمبے زخم کھائے مگر دشمن کو تجھ سے دُور رکھا، ہمارے بہادر آبا و اجداد کے پہلو میں جگہ تیار کر۔

تیری متبرک، تیری خشک، تیری فراموش شدہ پتھریلی وادیوں کو سفید ریش بڈھوں سے لے کر معصوم ترک بچوں تک کا اپنے آنسوؤں سے تر کرنا کیا کافی نہیں ہے؟

کیا تو ہم سے ناراض ہو گئی، اے مادرِ وطن؟ اس بے گناہ، اس مردِ قوم سے نہ پوچھ کہ کن قزاقوں نے، کن خائنوں نے اپنے پاؤں سے تجھے پامال کیا، تیری ہڈیاں توڑیں، کن درندوں نے اپنے ناخنوں سے تجھے مجروح کیا۔ اے مادرِ وطن! تو جو نیلی موجوں کی آغوش میں سو رہی ہے، تو جس کے پہاڑوں کے خطوط نازک، جس کا سایہ رنگین، جس کا افق رنگین، جس کا سما شفق گوں، جس کی سحر لطیف، جس کے بادلوں کی رفتار دلبر و عشی آور ہے، تو ہمیں یتیم چھوڑ کر کن بیگانہ آرزوؤں کے تعاقب میں جا رہی ہے۔

سُن! تجھے نہ محتشم قدیم روما، نہ فیلسوف قدیم یونان نے، ایسے وفاکار، ایسے آتشیں، ایسے نفس دلپسین تک کے جذبہ سے چاہا ہے جیسا ہم چاہتے ہیں، اور نہ کوئی قوم مستقبل میں چاہ سکتی ہے۔ ترکوں کی سب سے زیادہ دلدوز خشوع و تضرع، ترکوں کے منزہ و مجرد امید و استغراق تیرے لئے ہیں۔ ترک تیرے لئے زندہ رہتا ہے، تیرے لئے مرتا ہے، تیرے لئے برباد ہوتا ہے، تیرے لئے آہ و زاری کرتا ہے۔ سب تیرے لئے۔

کسے معلوم ہے کہ تیرے خمیر میں کتنے ترک شہدا کا خون ہے جنہوں نے اپنے قیمتی قطرہائے خون تیرے سینے پر گرائے، کتنے ترک سپاہیوں کی ہڈیاں ہیں، جنہوں نے اپنی جان و شان تیرے

قدموں پر فدا کردی۔ تیرے سینے پر جان دینے کے لئے، اور اپنی ہڈیاں تجھے سپرد کرنے کیلئے صدہا سال تک، غربت زدہ، آبلہ پا، رہ پیما، خستہ اور اُس پر بے یار و مددگار، ترک آئیگا۔

اس خطرناک زمانے میں، وُہ باعظمت ترک فاتح جو تیرے لئے شہید ہوئے اور جنہوں نے تیرے لئے مرنا ہی اپنی مکافات ابدی سمجھی، ان کی رُوحیں تیری لطیف ہوا میں تیرے افق پر جہاں دُشمن کے تاریک سائے پڑ رہے ہیں پھر رہی ہیں۔ ماضی کی وسعت میں سے یہ خاموش، مگر قوی و معظم رُوحیں آرہی ہیں اور تیرے زندہ فدائیوں کی بلند پیشانیوں کو اپنے پرّاں بازوؤں سے مَس کرتی ہیں۔

ہماری قسمت میں اگر جینا ہے، تو تیرے لئے جینا ہے، لیکن اگر قسمت میں یہ ہے کہ ہمارے قلب کے نازک ترین احساسات کو دُشمن اپنے ہاتھوں سے ٹھیس لگائے۔ تو بہتر یہی ہے کہ ہمیں مار ڈوال اور ہمیشہ کے لئے اے تیرہ خاک، اپنے میں دفن کرلے۔

اے مادرِ وطن! جو دن تیرے لئے خطرے کا دن ہو، اُس دن وُہ معصوم سر جو پالنے میں سربلند ہو رہے ہیں، اُن سے لے کر اُن کہنہ کمروں تک جو مزار کی طرف جُھک رہی ہیں، سب اپنا خون تیرے لئے بہانے کو تیار ہیں۔ اُس دن وُہ موت کے ڈراؤنے چہرے سے اُلفت کرتے ہیں۔

اے کمال کی، اے رحمت کی ماں! اے فاتح، اے سلیم کی آغوشِ خواب! اگر تیرے پاک گوشوں میں، تیری منزّہ و صاف محرمیت میں کسی بے ادب کا قدم داخل ہو جائے، تو ہم سب، ہمارا سرغروش اللور، ہمارا بہادر نیازی (ہمارا مصطفیٰ کمال اعظم) ہماری شیر فوج کے ساتھ، مردِ عورت یتیم بچے، سب کے سب اُس نجس اجنبی قدم کو تیرے پاک سینے سے ہٹا دینگے لیکن اگر نہ ہٹا سکیں تو ہم تیرے سب سے گہرے گڑھے میں گڑ جائیں، مگر اُس وقت تو ہمیں ایسا گہرا گاڑ لیو کہ تیرے نرم سینے میں دشمن کے ناخن پڑیں تو ہمیں احساس نہ ہو۔

نہیں، نہیں، اگر تو ہماری ماں ہونے سے گریز کرتی ہے، تو تُو بھی ہماری طرح محو ہو جا۔ اپنے شاندار محلوں، اپنے اُونچے گنبدوں، اپنے پُراسرار جنگلوں، اپنے شاداب مرغزاروں سمیت محو ہو جا۔ تعرِ دُنیا کی سب سے تاریک، سب سے دُور تنہائی میں جا سو۔

نہ انسانوں کے حافظے میں، نہ کتابوں کی سیاہ تحریر میں تیرا نام و نشان، باقی رہے۔

ہم سب کے ساتھ، تو بھی اُن معمُوروں کو لیکے جو راکھ ہو چکے ہوں، کتمِ عدم میں چھُپ جا۔

(خالدہ خانم)

(ہمایوں)

آرزو

(سرذوالفقار علی خاں صاحب کے بی۔آئی۔ای)

انسان خلاصۂ کائنات ہے وسعتِ عالم کی تمام بیرنگیاں اس کے انوارِ سینہ کا عکس ہیں یہ اجمال ہے۔ دُنیا، مافیہا وماوراہا اُس کی تفصیل ہے۔ جو لوگ اِس راز کے سمجھنے سے قاصر ہیں وُہ مناظرِ موجودات پر ہر ایک لمحہ کے لئے نظر دوڑائیں۔ پھر چشمِ بصیرت اپنے اندر وا کریں۔ اور دیکھیں کہ قدرت کی ہر بیرونی نیرنگی کے بالمقابل اُن کے اندرونِ سینہ کوئی نہ کوئی لطیف جذبہ یا احساس ہے جس کی کیفیت اضطراری اُس نیرنگی سے علی الدّوام وابستگی پر مجبور ہے، اسی مجبورِ جذبہ کا نام آرزو ہے۔ اگر ہمارا علم اپنی تمام عنایتوں کو پا سکتا اور پھر اس علم کے ساتھ ہمیں قدرت ہوتی کہ عالم کی نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف بوقلمونیوں کو گن سکیں۔ ساتھ ہی اپنے جذبات کی گوناگونی کا بھی اندازہ کر سکیں تو یقیناً ہم اس نتیجہ پر پہنچتے کہ جس قدر قدرت میں نیرنگیاں ہیں اُسی قدر ہمارے دل کے اندر آرزوئیں اور حسرتیں ہیں۔

صانع مہربان نے اپنی محبوب ترین مخلوق کے سینہ میں جہاں آرزو جیسا درخشندہ جوہر پیدا کیا۔ وہاں اس جوہر کی ضو افگنی کے لئے وُہ وسعتیں اور فضائیں تیار کیں کہ اگر وُہ ابد تک چمکتا دمکتا رہے تو بھی ان فضاؤں کی حدّوں کو نہ پا سکے۔ صُورت ہے تو ایک سے ایک بڑھ کر۔ رنگ ہے تو ایک سے ایک انوکھا۔ بُو ہے تو ایک سے ایک بھینی۔ غرض کیا کیا ہے اور کس کس کیف میں نہ ہم شمار کر سکتے ہیں۔ نہ یہ شمار کے احاطہ میں ہے۔ اگر مناظرِ ہستی شمار میں آ سکتے تو پھر ہستی مدتوں اس سے پہلے فنا ہو چکی ہوتی۔ کیونکہ انسانی آرزوئیں مدت کی معدود و محدود ہو چکی ہوتیں +

جو چیز دُنیا میں نیا منظر پیدا کرتی ہے یا ایک پنہاں منظر کو آشکارا کرتی ہے وُہ پہلوئے انسان کی نئی آرزو یا نئی آشکارا ہونے والی آرزو ہے۔ اگر نئی آرزوئیں نہ اُٹھیں تو نئے مناظر بھی پیدا نہ ہوں۔ یاد رہے کہ لفظ مناظر اپنے وسیع ترین معنوں میں یہاں استعمال ہوا ہے۔ ناظرین کی نظر میں محض قدرتی مناظر تک نہ رہے۔ تمام مادی، عقلی، روحانی مقاصد لفظ منظر کی تعریف میں شامل ہیں +

منظر و آرزو سے منظر میں صرف حواسِ خمسۂ ظاہر کا رشتہ نہیں۔ نہ حواسِ ظاہری کے اطمینان سے آرزو کا اطمینان مراد ہو سکتا ہے۔ نگاہِ غور سے دیکھو تو آرزو کا مقصدِ حصول

منظر اور آرزو کی تکمیل تصرفِ منظر ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ بعض مناظر کی دید یا شنید ہی آرزو کا مقصد ہو اور اُس کی تکمیل بھی۔ مگر یہ صرف مناظر کی بعض اقسام میں نہ سب۔

یہ تو قلبِ انسان کا قصہ ہے اور عالمِ نشرح۔ حقیقت آشنا نظریں اور پتے دیتی ہیں نہ صرف انسانی دل و دماغ ہی سے خواہشات و مقاصد مُستلزم ہیں۔ بلکہ ہر جاندار و بے جان میں جو قوتِ عمل یا اُس کی ہیئتِ کذائی نظر آتی ہے۔ اہلِ بینش کی نگاہ نکتہ آگاہ میں سب جوہرِ آرزو کا کرشمہ ہے۔ اور اُس کی مادی نمود۔ علامۂ اقبال جنہوں نے ہم پریشاں خاطروں کو سیرِ آرزو سے از سرِ نو رُوشناس کیا ہے۔ آرزو کے اِس اعجاز کو اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں یوں فرماتے ہیں:۔

چیست اصلِ دیدۂ بیدارِ ما ۔۔۔ بست صُورت لذتِ دیدارِ ما
کبک پا از شوخیِ رفتار یافت ۔۔۔ بُلبل از سعیِ نوا منقار یافت
نے بروں از نیستاں آباد شُد ۔۔۔ نغمہ از رندانِ اُو آزاد شد

ہر چیز کی ہیئتِ کذائی اس کی باطنی آرزو کا نتیجہ ہے۔ یہی باطنی آرزو اصل زندگی ہے زندگی جب مادہ کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے تو اپنی بقا و حفاظت کے لئے طرح طرح کے اسباب و آلات وضع کرتی ہے۔ مذہب کی زبان میں یوں کہیں گے۔ کہ وہ احسن الخالقین جب جوہرِ حیات کو مادہ میں ودیعت رکھتا ہے۔ تو اِس جوہر میں وُہ زور تابانی مخفی رکھ دیتا ہے۔ جو اپنی خود نمائی میں اپنے لباس یعنی مادہ کو جس نشو و نما ہیئت و صُورت میں چاہے بتدریج بدل دے۔ زندگی نے جس قوت و انداز سے مادہ کو احسن التقویم میں بدلا ہے۔

اور پھر آج تک اس انتہائی و اعلیٰ پیکر سے بڑھ کر کسی اور احسن تر لباس میں جلوہ پیرا ہونے کی جستجو نہیں کی۔ اُسے اقبال کی کفائیت نگاری نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ ؎

بینی و دست و دماغ و چشم و گوش ۔۔۔ فکر و تخیل و شعور و یاد و ہوش
زندگی مرکب چو در جنگاہ باخت ۔۔۔ بہرِ حفظِ خویش ایں آلات ساخت

عقل و جذبات جو بشر کے مایۂ امتیاز ہیں۔ سب کے سب زندگی یعنی حقیقتِ آرزو ہی کی نُدرت آفرینیوں کے مظاہر ہیں۔ یہ نُدرت آفرینیاں جو علوم و فنون۔ قوانین و مقاصد اختراع و ایجاد کرتی ہیں۔ اُنہیں کی تنظیم و تنسیق سے عالمِ موجودات خاص قیام و نظام میں صورت پذیر ہوتا ہے۔ زندگی کی یہ غیر مادی مخلوق اس کی تمام مادی مخلوق کی محافظ و مُصلح ہے۔ مگر جب تک عقل و جذبات اپنی جدّت میں روز افزوں نہ ہوں۔ حفاظت و اصلاحِ مادہ میں تبدیل و تغلیب

سے کام نہ لیں۔ نئے مقاصد و مناظر منصۂ شہود پر نہ لائیں۔ اُن کی ہستی معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے نہ صرف اُن کی ہستی بلکہ وُہ زندگی پژمُردہ ہو کر مر جاتی ہے۔ جس زندگی کا وُہ حاصل ارتقا ہے۔ مگر عقل و جذبات کی تمام جدّت طرازیاں خود آرزو کی قُدرت کوششوں پر مبنی و موقوف ہیں۔ اگر آرزو میں نیرنگی ہے تو عقل و جذبات بھی نیرنگی دکھانے پر مائل ہیں۔ اگر آرزو خوابیدہ ہو گئی ہے تو عقل و جذبات کو پہلے مُردہ شمار کرو۔ عقل یا جذبہ کی ایک پرواز اگر تمہارے مقاصد کو عرش کی بلندی تک اُٹھا سکتی ہے تو ترکِ آرزو کی ایک جھٹک تمہارے عرش پر پہنچے ہوئے مقاصد کو ایک دفعہ زمین پر گرا سکتی ہے۔ بقول اقبال ؎

ناامیدی از آرزوئے بیہیم است — نا امیدی زندگانی را سم است
نا اُمیدی ہمچو گور افشاردت — گرچہ الوندی ز پا افشاردت

آدم کا خُلد سے نکلنا ایک قصّہ ہے جو لوگوں کی زبان پر ہے۔ مگر ایک حقیقت ہے جس سے لوگ ناآشنا ہیں۔ ایک آرزو کے پتلے کو جنّت سی ازلی۔ ابدی۔ غیر منقلب و غیر متبدّل جلوہ گاہ میں پیدا کرنا اور پھر وہاں آباد ہونے کا حکم دینا محض ایک بہانہ تھا اور ایک حکمت۔ خُدا جانتا تھا کہ آدم کی آنکھ کھُلتے ہی اس کا جی ان مناظر پر للچائے گا۔ یہ جو کچھ دیکھے گا اُس کے حصُول کا خواہشمند ہو گا۔ جسے حاصل کرنے کا اُس پر تصرّف کی سعی کرے گا۔ مگر بغیر آدم کو جنّت میں پیدا کرنے اور پھر اُسے وہاں سے نکال کر زمین پر پھینکنے کے خود اس ہستی کو پیدا کرنے اور اُسے نامور کرنے کا کوئی بہتر ذریعہ مصلحت میں نہ تھا۔ پیدا تو آدم کو دُنیا میں کرتے مگر دُنیا کے مناظر کے کب ہم پلّہ ہو سکتے تھے؟ مقصُود یہ تھا کہ آدم کے سینے میں آرزوئیں تو مناظرِ جنّت کی بھری جائیں اور پھر دُنیا میں اُتارا جائے۔ تاکہ قیامت تک اگر مناظرِ ہستی ختم بھی ہو جائیں تو اُس کی آرزوئیں ختم نہ ہوں۔ ان میں جو تصرّف کی حسرت ہے وُہ نکل جائے تو پھر جب آدم ایک طوفان آرزو بن چُکا آرزوئیں اپنی خامی سے پُختگی تک پہنچ چکیں حتیٰ کہ ایک خاص دلکش منظر کے تصرّف پر مائل ہوا بلکہ تصرّف کر ہی چکا تو حکم دیا گیا۔ کہ بس یہ مناظر تصرّف کے لئے نہیں۔ تصرّف کی خواہش کو پیدا کرنے کے لئے تھے۔ تیرے تصرّفات کے لئے تیرے لئے اور جنّت (ادنےٰ جنّت یعنی دُنیا) تیار ہے جاؤ۔ اس میں اپنی آرزوؤں کی طاقت کو آزماؤ۔ ان کی جولانیاں دیکھو۔ تصرّفات میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھو۔ ہماری شانِ خالقیت متقضی تھی ایک کرشمہ جو کرشمہ پرور طلسم پیدا کیا جائے۔

جس سے ہماری ذات بے نیاز و مستغنی ہے۔ اسے تمہارے دل کے اندر رکھ کر اس کی نیرنگیوں کو آشکار کریں۔ اب تم اسے دل میں رکھو۔ دُنیا کی جنت میں اس کے کرشمے دیکھو اور دکھاؤ اعتدال میں رہو گے "کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا" پر کاربند رہو گے تو یہ دُنیا تمہارے ہی لئے ہے اور تمہاری ہے۔ اس کی دی ہُوئی نعمتوں کو ہماری دی ہُوئی نعمتیں سمجھتے رہو گے۔ تو یہ نعمتیں جتنی چاہو گے جتنی تلاش کرو گے اُتنی بڑھتی جائیں گی۔ اور جب بالآخر تمام پا چکو گے اور جب ہماری مشیئت ہو گی کہ یہ ختم کر دی جائے اور دیکھ لیں گے کہ تمہاری تصرف کی حسرتیں نکل چکی ہیں تو پھر تم اُسی گھر میں جس سے نکالے جا رہے ہو آباد کر دیئے جاؤ گے۔ پھر کبھی ابد تک نہ یہاں سے نکلو گے اور نہ یہاں واپس آؤ گے۔

معلوم ہُوا یہ دُنیا اسی غرض کے لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس میں انسانی آرزوئیں اپنی نشو و نما پائیں مناظر اپنے جلوے دکھائیں۔ ہر نئے دن نئی آرزو نئے مقصد سے ہم آغوش ہو۔ ہر سینہ ہجوم تمنا سے معمور ہو۔ دُنیا کا کوئی جلوہ۔ کوئی کرشمہ۔ کوئی مقصد۔ کوئی منظر ایسا نہ ہو۔ جس کا کوئی چاہنے والا نہ ہو۔ غرض ہر انسان پابند آرزو ہو +

کُوئے عشق است ہمہ دانہ و دام است اینجا
جلوۂ مردم آزار و حرام است اینجا

آرزوئیں اُسی وقت تک زندہ رہ سکتی ہیں جب تک وہ نئے مقاصد پر مائل ہوتی رہیں خود نئے مقاصد پیدا کرتی رہیں۔ ایک مقصد کے حصول کے بعد آرزو کو نیا مقصد پیدا کرنا چاہیئے نئی اُمید کی آگ انسانی دل کے اندر لگانا چاہیئے۔ نئے مُدعاؤں کے مناظر اُس کی آنکھ کے سامنے لانا چاہئیں۔ جب یہ ہو گا تو حواس ظاہری از خود آمادۂ کار ہوں گے۔ زندگی ایک مسلسل جستجو بن جائے گی۔ مقاصد کے رستہ کی تمام رُکاوٹیں بہ آسانی مغلوب ہو کر رُکاوٹیں نہ رہیں گی۔ بلکہ رستہ کے طے کرنے میں ممد و معاون ہوں گی۔ مقاصد کے حصول کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنی قوت و طاقت کا احساس ہوتا جائے گا۔ حتیٰ کہ اُس کی اُن مقامات پر رسائی ہو گی جن کا پہلے اُس کے وہم میں آنا ناممکن تھا۔

آرزو بُری بھی ہو سکتی ہے۔ مگر بُری آرزو کا پیدا ہونا نفس کی کمزوری اور عقل کی خامی سے ہے۔ ایسی آرزو کو آرزو نہیں کہیں گے۔ وہ حقیقت میں ترکِ آرزو ہے۔ کیونکہ صحیح و پاک رُوح آرزو سے بعید ہے۔

اتنی توضیحات کے بعد اب ہمیں یہ دکھانا ہوگا کہ قوتِ آرزو نے دُنیا میں کیا کیا انقلاب پیدا کئے ہیں؟ انسان کی کن عالی مقاصد تک رہنمائی کی ہے۔ اور ضعفِ آرزو یا ترکِ آرزو نے کتنے افراد کو زندہ درگور کیا ہے۔ کیسی درخشندہ ہستیوں کو قعرِ ظلمت میں پنہاں کر دیا ہے۔ کتنی اقوام اس کے ہاتھوں اپنے عروج سے گر کر ہمیشہ کے لئے سطحِ عالم سے رُوپوش ہو گئی ہیں۔ مسئلہ تنازع للبقا یا حفظِ خودی اب ایک عام مسئلہ ہے وُہ تصوّف یا فلسفہ جو نفیِ وجود کے سبق دیتا تھا۔ ماسوا کے مقابلہ سے قاصر جستجو و تصرّف کے کرشموں سے ناآشنا۔ علیحدگی و پستی کے گڑھوں میں سکون و راحت کی منزل کا پتہ دیتا تھا۔ اب عقلمند و بالغ نظر افراد و اقوام کی نگاہ میں مکروہ و باطل ہو رہا ہے۔

علامہ اقبال کی حقیقت شناسی و شعلہ نوائی نے ہمارے نوجوانوں کی آنکھیں کھولدی ہیں۔ اگرچہ ان کی ذہنی ترقی ابھی تک اس منزل تک نہیں پہنچی کہ کماحقہٗ اقبال کے اسرار و رموز کو سمجھ سکیں۔ تاہم انہیں یہ پتہ لگ گیا ہے کہ ہم وُہ نہیں جو ہمیں ہونا چاہیئے تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک چنگاری اُن کے سینوں میں بھڑک اُٹھی ہے کہ ہم وُہ کب ہوں گے جو ہم تھے اور آج ہم کیوں وہ نہیں جو کل تھے۔

اسرارِ خودی

اُدبا و حکماءِ مغرب کی نظر میں

(چوہدری محمد حسین صاحب ایم۔ اے)

زمانۂ حال کے فلسفہ مذہب۔ شاعری اور عام علم ادب میں علامہ اقبال کا کیا پایہ ہے۔ یا علامہ اقبال کے فلسفہ مذہب اور شاعری کا زمانۂ حال پر کیا اثر ہو رہا ہے اور یہ اثر اس "حال" کو کس "مستقبل" میں بدلنا چاہتا ہے؟ ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات سے بصورتِ موجودہ مشرقی اقوام کے عام افراد قاصر ہیں۔ کیوں قاصر ہیں؟ اس کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے زمانہ کو زمانہ کے محقق کی نگاہ سے دیکھا ہو۔ مشرق و مغرب دونوں کی سیر کی ہو۔ دونوں کے علوم و فنون۔ تمدن و معاشرت۔ مذہب و سیاست۔ اخلاق و رجحانِ طبائع کا وسیع مطالعہ کیا ہو۔ اور پھر یہ اہلیت رکھتا ہو کہ صحیح مطالعہ کے بعد صحیح نتائج مترتب کر سکے۔ ایسے شخص کو بے چون و چرا کہنا پڑے گا کہ جس طرح زوال و انحطاط کی زندگی کو "صحیح زندگی" سے کوئی نسبت نہیں۔ کوئی علاقہ نہیں۔ اسی طرح انحطاط میں بسر کرنے والے افراد کے خیالات کو صحیح یعنی "زندہ خیالات" سے کوئی نسبت اور علاقہ نہیں۔ چہ جائیکہ وہ ان کا موازنہ کریں اور اُن کی قدر و قیمت کا پتہ لگائیں۔ اور اگر کوئی نسبت ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ "زندہ خیالات" ایک نئی اور الگ دُنیا کے خیالات تصور کئے جائیں اور اُن کی انتہائی داد جو دی جا سکے وہ حیرت و استعجاب ہو اور بس۔

اقبال بھی مشرق میں پیدا ہوا! یہ سچ ہے مگر کون ہے جو ارتقاء کے کرشموں سے واقف ہو علل و اسباب کی عجائب آفرینی کا معترف ہو اور پھر اس بات سے انکار کرے کہ قدرت کو جب کسی قوم کو نئی رُوح بخشنی ہوتی ہے اُسے نئے قالب میں ڈھالنا مقصود ہوتا ہے تو اُس قوم ہی سے پہلے نئی رُوح۔ نئی عقل اور نئے احساس کے افراد پیدا کئے جاتے ہیں۔ وہ افراد جن کی ہستیاں ایک عظیم الشان انقلابِ زندگی کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ وہ افراد جن کے اقوال اگرچہ ابتدا میں عالمِ بالا کی باتیں متصور ہوتی ہیں مگر جونہی لوگ ان کی صداؤں

سے مانوس ہوتے ہیں۔ اُن کی دعوت پر کان دھرتے ہیں۔ اُن کے خیالات و ارشادات کو جذب کرتے ہیں اور اُن کے کہنے پر عمل کے لئے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وُہ خود ویسا ہی سوچنا اور ویسا ہی سمجھنا شروع کر دیتے ہیں تو پھر نہ وُہ ہستیاں رہتی ہیں۔ اور اُن کے خیالات معمُولی خیالات متصوّر ہوتے ہیں۔ غرض فطرت کو جن اقوام میں انقلاب منظور ہوتا ہے غیر معمُولی افراد بھی انہیں سے پیدا ہوتے ہیں۔

اقبال کس مضبُوط فلسفہ کی بنیاد ڈال رہا ہے! ابنائے جنس کو کن مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک انسان کیا ہستی ہے۔ فرد کیا ہے؟ وُہ کامل کس طرح ہو سکتا ہے۔ قوم کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ تمام دُنیا ایک ہی قوم کیسے بن سکتی ہے؟ پھر اقبال کے پاک جذبات کس عالمگیر اخوت کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ اس کی باریک نگاہ تمام عالم کو کس ایک معاشرت اور ایک تمدن میں دیکھنے کی آرزومند ہے۔ اُس کا محبت بھرا دل کس مساوات کا متمنی ہے۔ وُہ کس وحشت کے ساتھ دوئی سے گریزاں ہے۔ کس درد سے یک رنگی کا وارفتہ ہے؟ یہ سب ایسے حقائق ہیں کہ افراد کو افراد بننے کے لئے۔ قوموں کو ایک قوم میں ظاہر ہونے کے لئے اور دُنیا کو ایک دُنیا کہلانے کے لئے بغیر ان کی طرف رجوع کئے چارہ نہیں۔

سال گذر رہے ہیں۔ علامہ موصوف نے خدا جانے کتنے عرصہ کے فکر و تدبّر اور دماغ سوزی کے بعد اپنی صحیح و اعلیٰ قوّتِ فکریہ کی بدولت بنی نوع کے لئے مکمل حیاتِ فردیہ کے حصُول کا نسخہ تجویز کیا۔ مثنوی اسرار خودی کی شکل میں یہ نسخہ چھپا اور لوگوں نے دیکھا بنی نوع پر تو یہ ایک عام احسان تھا۔ مخصُوص مور و اس انعام کے ہم مشرقی لوگ تھے اور پھر ان میں مخصُوص ہم ہندوستانی۔ جن کی زندگی اصلی انسانی زندگی سے کہیں دُور ہے۔ جن کے نفس مُردہ ہو چکے ہیں۔ جن کے قوائے ضعف کا شکار ہیں۔ جن کی ہمتیں سو چکی ہیں۔ جن کے دماغ پست خیالات کا گھر ہیں۔ اور جن کی زندگی ایک طویل شیریں حالتِ نزع ہے۔ مگر افسوس نہ صرف ہم مریضوں کو بلحاظ افراد ابھی تک پُوری واقفیت ہوئی کہ یہ نسخہ ہمارے ہی مرض کا علاج ہے۔ بلکہ ہمارے مدعی نباضوں کی تشخیص اب تک یہ دریافت کرنے سے قاصر ہے کہ یہی وُہ دوا ہے جو کافی و شافی ہو سکتی ہے اور ہم جو اور علاج آج تک عمل میں لا رہے ہیں وُہ مریض کو اور مریض بنانے میں ممد ہیں نہ کہ اُسے صحت و تندرستی عطا کرنے میں۔ اور نہ صرف یہ کہ قومی پیشواؤں اور مبلغوں نے اس کتاب میں نگاہ نہیں کی اور افرادِ ملت کو مکمل افراد بنانے کے درپے نہیں ہوئے بلکہ

اُدبا و شعرا جن کی نظر عام نظروں سے گہری ہونا چاہیئے اور جن کا مذاقِ سخن عام مذاقوں سے زیادہ لطیف اور زیادہ پاکیزہ ہونا ضروری ہے۔ وُہ بھی بلحاظ شعر و ادب کے ابھی تک اس کی خوبیوں سے ناآشنا ہیں۔ مگر ناآشنا ہوں بھی کیوں نہیں۔ ہم خود کہہ چکے ہیں کہ زوال و انحطاط کے زمانہ کے خیالات اور مذاق اس قابل نہیں ہوتے کہ اُن کی حقائق و دقائق تک رسائی ہو۔ جب ہم حقیقی زندگی ہی سے روشناس نہیں ہو تو حقیقی ادب اور حقیقی شعر کو کیا سمجھیں گے اور ہمارے اس کتاب کی طرف ابھی تک بہت تھوڑا تامل ہونے کی وجہ بھی یہی ہے۔ ہم علم ادب کی انتہائی وسعتوں سے آشنا نہیں۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ شعر سے دُنیا میں کیا کیا کام لئے جا سکتے ہیں۔ زندہ اقوام کے اشعار میں مضامین کیسے ہوتے ہیں اور کیوں ہوتے ہیں۔ اُن کے اسلوب بیان میں کیا سحر ہوتا ہے پھر شعریت کیا ہے اور شعریت کے کونسے اثرات زندگی بخش ہیں اور کونسے مرگ آور؟

ہمارے نقاد مثنوی اسرارِ خودی کی کسی ایک خوبی کو آج تک پُورے طور پر واضح نہ کر سکے۔ اس کے مطالب و معانی کو کما حقہٗ ادراک نہ کر سکے۔ یہ نہ جان سکے کہ سلسلۂ حیات کس مرکز سے کس ربط و ضبط کے ساتھ زمین سے اُٹھا ہے اور کس قوت و اعجاز سے آسمان تک پہنچ کر تمام فضا میں بسیط ہو رہا ہے۔ بلکہ علم ادب کی حقیقت سے اپنے بے بہرہ ہونے کا ثبوت اس طرح دیا کہ اسرارِ خودی میں خواجہ حافظ علیہ الرحمتہ کے ادب پر جو تنقید تھی اُسے اپنی کم فہمی سے خواجہ کی بزرگی پر حملہ سمجھا۔ گویا نہ صرف ادب کو سمجھنے سے قاصر رہے بلکہ نقاد کہلا کر تنقید کے سمجھنے سے درماندگی کا ثبوت دیا۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کس قدر علم ادب کی حقیقت سے ناآشنائی کا اظہار ہے۔ کہ اسرارِ خودی کے ادب کو جو آج مغرب کے اُدبا کو محوِ حیرت کر رہا ہے نہ سمجھنا تو درکنار ہمارے نقاد اس میں ایک معمولی ادبی تنقید کو نہ سمجھ سکے۔ اور پھر اس پر جو ہمہ دانی کے دعوے ہیں وُہ خدا ہی جانتا ہے۔

ہم پھر بھُول رہے ہیں۔ ہمارا افسوس ناحق ہے اور ہمارے گِلوں کی بنا ناحق پر ہے۔ ہم اس وقت تک اسرارِ خودی کو نہ سمجھ سکتے جب تک کہ زندہ قومیں اُسے پہلے نہ سمجھ لیتیں۔ اور ہمارے سمجھانے کے لئے اس کی تشریح میں کچھ نہ کچھ لکھ نہ چکتیں۔ مثنوی مذکور کے انگلستان میں انگریزی زبان میں ترجمہ ہونے کے بعد کئی مغربی اُدیب اور فلسفی اور نقاد اس پر رائے زنی کر چکے ہیں۔ انہیں تنقیدوں میں ایک تنقید کا ترجمہ ہم ناظرین اور بالخصوص نقاد حضرات

کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ جان لیں ہم اسرارِ خودی کو کیا سمجھتے تھے اور "خودی" کے مالکوں نے اسرارِ خودی کو کیا سمجھا ہے۔ اس مضمون سے یہ بھی واضح ہوگا۔ کہ علمِ ادب کی کیا حقیقت و وسعت ہے اور اگر دُنیا "آج" کی دُنیا بنی ہے تو ادب ہی کے اثرات سے بنی ہے اور اگر "کل" کی دُنیا بنے گی تو اسی کے کرشموں سے۔ اس تنقید میں یہ حقیقت پڑھ کر ہمارے نقادانِ ادب کی اور بھی آنکھیں کھلیں گی کہ زندہ اقوام کے ادبا کے نزدیک اگر کوئی مفید اور زندہ ادب کا لکھنے والا۔ مفید اور زندہ شعر کا کہنے والا۔ مفید اور زندہ فلسفہ کا سبق دینے والا اس وقت تمام دُنیا میں زندہ ادیب۔ زندہ شاعر۔ زندہ فلسفی ہے تو وہ صرف ایک اقبال ہے۔ اور بس۔ اور حیاتِ انسانی کا اصل راز اگر کسی نے آج تک سمجھا ہے تو اسی نے +

فاضل نقاد نے جس خوبی اور قابلیت سے "اسرارِ خودی" کے اصلی جوہر کو ہمیں دکھایا ہے ہم فی الحقیقت اس کی داد نہیں دے سکتے۔ دُنیا کے دو مشہور ترین فلسفی ادبا نٹشا اور وٹمین سے جن کا سکہ موجودہ وقت میں تمام اہلِ مغرب پر ہے اقبال کا مقابلہ کرکے دکھا دیا ہے کہ وہ دونوں حضرات مدت العمر میں انسان کے متعلق جس نکتہ کو نہ سمجھ سکے۔ اُسے اقبال کی حقائق شناسی نے کس خوبی اور سادگی سے دُنیا کا صحیح مطمحِ نظر بنا کر دُنیا کے سامنے رکھ دیا ہے +

اس تنقید کا لکھنے والا امریکہ کا مشہور فاضل۔ فلسفی۔ ادیب اور نقاد مسٹر ہربرٹ ریڈ ہے اس مضمون کو پڑھنے اور سمجھنے کا لطف تو اصل زبان انگریزی ہی میں ہے۔ ترجمہ اس مفہوم کو کیا ادا کرے گا۔ جو مضمون نگار کے انگریزی الفاظ میں مضمر ہے۔ یہ مضمون امریکہ کے اخبار نیو ایج (NEW AGE) مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۲۱ء میں چھپا تھا۔

وٹمین امریکہ کا سب سے بڑا فلسفی شاعر ہے اُس کے کلام پر امریکہ کے ایک نقاد مسٹر لارنس نے اپنی تنقید شائع کی تھی۔ مسٹر ہربرٹ ریڈ یہ شکایت کرتا ہوا کہ صحیح تنقید اب ادبی دُنیا میں مفقود ہے۔ اس تنقید پر نظرِ ثانی کرتا ہے اس کی داد دینے کے بعد خود بتاتا ہے کہ وٹمین کے کلام میں کیا کیا خصوصی کمالات تھے۔ پھر اس کے کلام کے بعض نقائص پر جو مسٹر لارنس نے لکھے ہیں۔ بحث کا آغاز کرتے ہوئے اس طرح قلم کو جولانی دیتا ہے :-

"مسٹر لارنس نے جس خوبی کے ساتھ "وٹمین" کی متذکرہ بالا حقیقت آفرینی کو بے نقاب کیا ہے بعینہٖ ویسی تدقیق و تنقید سے اُس "شاعرانہ کذب" کے عنصر کو بھی جو اُس کے کلام میں پایا جاتا ہے بالتشریح واضح کر دیا ہے۔ کیونکہ "وٹمین" باوجود اپنی تمام عظمت و علوِ مرتبت کے

"کامل شاعر" نہ تھا۔ مگر اُس کے کلام کی تصویر کے اُس رُخ پر چنداں اصرار کی ضرورت نہیں جہاں تک اس "شاعرانہ کذب" تخیل کی محدود جولانی اور تعینات عالم سے چشم پوشی کے مسئلہ سے تعلق ہے اُس کے کلام سے عیاں ہے اور بالکل اظہر من الشمس۔ اُس کی شاعری کے اور بھی پہلو ہیں ضبطِ تخیل، اثباتِ تعینات اور یہ وُہ پہلو ہیں جن کے سامنے لطیف اندرونی احساس کی بوقلمونی ہیچ نظر آتی ہے۔ اور یہی پہلو ہیں جو زیادہ مستحق توجہ ہیں۔ ان معنوں میں "ڈیمین" کی استعدادِ نادرہ کی بہترین توضیح اور اُس کے فن کی مکمل ترین تعریف خود "ڈیمین" کے قلم سے حسنِ نگارش پا چکی ہے۔ یہ "ڈیمین" کی کتاب "ڈیموکریٹک وسٹازہ (مناظرِ جمہوریہ) کے صفحات میں پوشیدہ ایک "فٹ نوٹ" ہے جو اس قدر جلی نہیں کہ قاری کی توجہ کو مجبور بخود اپنی طرف مبذول کرلے۔ اس لئے مجھے حق ہے کہ میں اُسے اس مقام پر نقل کردوں:۔

"ادبی صناعت و بداعت کی معنی آفرینی کا منتہائے عروج۔ اُس کا حاصل۔ اُس کی حظ و انبساط کی انتہائی وسعتیں جو رُوح انسانی کی بلند پروازی کے لئے ممکن ہو سکتی ہیں۔ سب "مابعد الطبیعیات" کے حقائق و لطائف ہیں۔ عالمِ رُوحانی کے غوامض و اسرار۔ خود رُوح۔ اور ہمارے تشخیص ذاتی کی بقاء و دوام کا مسئلہ بھی اسی میں شامل ہے۔ تمام قرون میں نفسِ انسانی کی رسائی اس منزل تک ہوتی رہی ہے اور آئندہ ہوتی رہے گی۔ کم سے کم اس نکتہ میں تو بلا امتیازِ نسل و زمانہ تمام بنی نوع ایک ہی مقام پر کھڑے ہیں۔ بلکہ اس کی تحسین و توصیف میں بھی متقدمین و متاخرین تمام کے تمام ہم آہنگ ہیں۔ انسانی نگاہ میں وُہی مصنفین محبوب ترین ہیں جو اس میدان کے شہسوار ہیں اور اگرچہ اُن کا صلہ چاندی سونے کے چند سکوں کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ اور اگر بالآخر کچھ ہو تو صرف یہ کہ شہرت اُن کے قدم اور عظمت و فضیلت کا تاج ان کے سر پر رکھا جائے۔ مگر بایں ہمہ ابتذال اُن کے رشحاتِ قلم (جن میں اگرچہ از رُوئے حسنِ بیان سقم بھی ہوں) وُہ انمول موتی ہیں جن کو دُنیا جان سے بڑھ کر عزیز و محفوظ رکھے گی۔

ادب و شاعری کا منتہیٰ ہمیشہ سے مذہب رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ویدِ۔ ژندِ۔ اوستا تالمود۔ زبورِ مسیح اور اُس کے تلامذہ کی اناجیل۔ تصانیف افلاطون۔ قرآن۔ علیٰ ہذا القیاس ہمارے زمانہ میں سویڈنبرگ کی تحریریں۔ پھر لیسنگ۔ کانٹ اور ہیگل کے گرانبہا افکار ایسے اعلیٰ پائے کے ادبی ذخائر ہیں جو علم ادب کی حقیقی بلندیوں اور عروج کو اس طرح نمایاں کرتے ہیں

جس طرح دُنیا کے عظیم الشان پہاڑ سطحِ دُنیا سے بلند و نمایاں سر بفلک نظر آتے ہیں۔ پھر ان کے دوش بدوش شعرا کے وُہ نتائجِ طبع بھی ہمیشہ حرزِ جان بنے رہیں گے۔ جن میں اشخاص و واقعات جذباتِ بہیمیہ انسانی اور مناظرِ عالمِ مادی کے متعلق رائگنیاں الاپنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے کلام میں مذہبی انداز اور شعورِ اسرار کے علاوہ مستقبل۔ غیب۔ شہود۔ مشیئتِ غائت تکوینِ عالم وغیرہ وغیرہ مسائل پر حصُولِ اطلاع کے مضامین کو بھی کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا بلکہ بالواسطہ ہر ادائے بیان میں ان نکات کو ادا کر جاتے ہیں۔

مگر یہ علمِ ادب کے نقادِ ماہیت کی بجائے اُس کی وسعتِ استعدادی کی تعریف ہے جو "ڈیمن" نے کی ہے۔ یعنی یہ ادب کا "کم" ہے نہ کہ اُس کا "کیف"۔ یہ تعریف "اندازِ بیان" و "حسنِ ادا" کے مسئلہ کو حل نہیں کرتی بلکہ اپنے الفاظ کی سادگی میں اسے پامال کر جاتی ہے یہ گرامی تصانیف جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔ علم حسن الاعیان کے نظریہ سے خواہ کتنی سقیم ہوں اپنی ذاتی خوبی میں ہمیشہ پاک و بے عیب ہیں۔ اُن کی طاقتِ فکر کی آتش سیری دشتِ خیالات میں نیا جادُو پیدا کرتی ہے۔ اور قلوبِ انسانی کو پگھلا کر تمام عالم کو نئی شکل میں متشکل کر جاتی ہے، مگر ان توضیحات کے زیرِ شرائط "ڈیمن" کا مذکورہ صدر "منتہے" وہ صحیح و نقد "منتہے" ہے جو "عمل" و "بلاواسطہ افادہ" کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر طرح موزوں و مناسب ہے۔ آج اس مقام اور اس زمانہ میں اس "منتہے" کو نگاہ رکھتے ہوئے میرے ذہن میں اگر کسی زندہ شاعر کا خیال آسکتا ہے جو اس میزان میں پُورا اُتر سکتا ہے تو وُہ ایک ہی ہے اور وُہ بھی لازمی طور پر نہ ہمارا ہم قوم اور نہ ہمارا ہم مذہب۔ میری مراد اقبال سے ہے۔ جس کی نظم "اسرار خودی" ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ڈاکٹر رینلڈ نکلسن کے قلم سے اصل زبان فارسی سے انگریزی میں ترجمہ ہو کر میسرز میکملین کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ ہمارے ہموطن متشاعر بلبّیوں اور بٹیروں پر تک بندیوں سے اپنے یاروں کی ضیافتِ طبع کا سامان پیدا کر رہے تھے اور کیٹس[1] کے انداز پر پیش پا افتادہ مضامین پر طبع آزمائیوں میں مشغول تھے عین اس وقت لاہور میں یہ نظم جس کی نسبت ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس نے ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں کے خیالات میں ایک محشر برپا کر دیا ہے۔ تصنیف کی گئی اور شائع کی گئی ایک ہندی مسلمان نے لکھا ہے کہ "اقبال ہم میں مسیح بن کر نمودار ہُوا ہے جس نے مُردہ اجسام

[1] انگریزی شاعر [2] ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم۔

کو جنبش دے کر اُن میں حیات تازہ کی لہر دوڑا دی ہے"۔ تم پوچھو گے یہ کیا ٹوٹکا تھا جس نے خریداروں کے دلوں کو موہ لیا؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ کوئی ٹوٹکا نہ تھا۔ کسی سیاسی مجذوب کی بڑ نہ تھی۔ کسی مکتی فوج کے نجات فروش کا نسخۂ نجات نہ تھا۔ بلکہ یہ اُس نظم کا اثر تھا جس کا حسن معنوی موجودہ فلسفہ کے تمام اہم ترین نکات و دقائق پر حاوی ہے۔ یہ اُس نکتہ آفرینی کا طلسم تھا جس نے افکار کی گوناگونی سے وحدتِ ایمانی پیدا کر دی ہے۔ یہ اس حقیقت ترجمانی کا سحر حلال تھا جس نے ایک ایسی منطق کو جو محض مدرسوں کے طلبا تک ہی محدود و مخصوص تھی ایک عالمگیر الہام کی صورت میں بدل کر عالم کے سامنے رکھ دیا ہے۔

اقبال اس بات سے انکار کرتا ہے کہ اُس کے افکار نٹشا کے خیالات سے متاثر ہوئے ہیں بایں ہمہ نٹشا سے اُس کا موازنہ ناگزیر ہے۔ نٹشا کا "فوق الانسان" اقبال کے "انسان کامل" سے صرف اتفاقی اوصاف میں مختلف ہے۔ اگرچہ اوّل الذکر کی بنیاد اُمرائے باطل تمدن پر ہے۔ اور موخر الذکر جہاں تک میرا خیال ہے ان معنوں میں زیادہ یقینی اور مستحکم بنا پر مبنی ہے کہ اُس کی تعریف میں "منتہیے" (یعنی کسی سقراط۔ کسی مسیح۔ کسی محمدؐ) کا صحبت آشنا ہونا یا اس کا از روئے پیدائش مکمل ہونا تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ اُسے فطرت کے قوائے مولدہ کا مآل و مقصود ٹھیرایا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس کے اقبال کا "انسانِ کامل" ارتقاء جمہور کا منتہیٰ ہے۔ وہ ایک اصول ہے جو اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ ہر انسان ایک مستتر طاقت کا مرکز ہے جس کے ممکناتِ زندگی ایک خاص طریقِ عمل سے ترقی پا سکتے ہیں۔ انسانیت کا یہ نصب العین حقیقت کے زیادہ قریب ہے اور اس لحاظ سے وہ نفس کے "نفس متوسط"[1] سے زیادہ مناسب و متشابہ ہے۔ تاہم تینوں نصب العینوں کی تہ میں ایک ہی ابتدائی خواہش یا خیال مضمر ہے۔ ان میں فرق صرف اسی قدر ہے جس قدر اُنکے دیکھنے میں پیش بینی سے کام لیا جاتا ہے۔ از روئے مذہب ان سب کی بنیاد یہ اعتقاد ہے کہ انسان ایک قوت الہیہ کی کشش و جذب سے پیدا ہوتا اور ارتقاء پاتا ہے جس کا نام "خدا" ہے۔ از روئے سائنس مفروضہ یہ ہے کہ ہیئت واقعات میں ایک قوتِ مولدہ داخل کی جاتی ہے۔ جو شعورِ انسانی پر از خود جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور نفسِ انسانی کے شعور و ادراک کو ہمیشہ ترقی دیتی رہتی ہے۔ از روئے مابعد الطبیعات یہ دونوں پہلو جن میں سے ایک مذہب نے اختیار کیا اور دوسرا سائنس نے متحد ہیں۔

"زندگی (میں اقبال کی نظم کی تمہید سے نقل کرتا ہوں) ایک متقدم حرکتِ جذب و ہضم ہے۔ یہ اپنی پیش

---

[1] وکذالک جعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا (قرآن)

روحی میں اپنے رستہ کی تمام رکاوٹوں کو خود اپنے اندر جذب کر کے دُور کرتی جاتی ہے۔ آرزوؤں اور نصب العینوں کا مسلسل پیدا کرتے رہنا اس کا اصلی جوہر ہے۔ اور اس نے اپنی حفاظت و توسیع کے لئے ایسے ایسے آلے (حواس عقل وغیرہ وغیرہ) ایجاد کئے ہیں یا خود اپنی ہی ذات میں سے پیدا کر لئے ہیں جو اس کے سنگہائے راہ کو جذب کرنے اور اس کے اپنے مشابہ بنانے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ زندگی کے رستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ ہے یا یوں کہو کہ نیچر ہے۔ تاہم نیچر اس لحاظ سے کہ وہ زندگی کی اندرونی طاقتوں کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ عدم سے وجود میں آئیں۔ اپنی ذات میں "شر" نہیں۔ لہٰذا زندگی ایک سعیِ آزادی ہے۔ اور اس سعی کا طریق "اَنا" کی تعلیم ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں جیسے خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تخلقوا باخلاق اللہ (اپنے اندر اخلاق اللہ پیدا کرو) یہ حدیث ہمیں ٹمین کا یہ قول یاد دلاتی ہے "میں مکمل اشیاء کی انتہا ہوں اور پیدا ہونے والی اشیاء کا محیط"۔

ٹمین نے یہ بھی کہا ہے کہ میں خدا کو مردوں اور عورتوں کے چہروں میں دیکھتا ہوں اور خود اپنے چہرے میں جب آئینہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں۔ نٹشا نے اسی نصب العین کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے "خالق اپنے ایسے اور خالقوں کی جستجو میں رہتا ہے"۔ اور فی الحقیقت سارے کا سارا مذہب اور سارے کا سارا فلسفہ بالآخر اسی تکمیلِ خودی کے اصول میں آ جمع ہوتا ہے۔ ازروئے نفسیات بھی انسان کسی ایسی الوہیت کو تسلیم نہیں کر سکتا جس کا کہ وہ خود مظہر نہیں۔ اور معلوم بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ امر ایک صداقتِ طبعیہ ہے۔ اقبال نے اس صداقت کا نٹشا یا ٹمین کی نسبت زیادہ وثوق سے ادراک کیا ہے۔ ٹمین کا "نفس متوسط" مبہم و غیر مشخص ہی ہے۔ اور نہ اس قدر جامع ہی ہے جیسا کہ ایک منتہیٰ کو ہونا ضروری ہے۔ نٹشا کا "فوق الانسان" صحبتِ انسان سے گریزاں اور نفور ہے۔ اس لئے جبلتہً باطل ہے۔ مگر اقبال کا "انسان کامل" "نفس متوسط" ہے اور جلیسِ ہمدرد اور اقبال کا "نفس متوسط"، "انسانِ کامل" گویا ؎ "خود صنم ہے خود پرستار صنم"

باخودے بشنید زاذکارِ خودی
نعرہ زد از گنجِ "اسرارِ خودی"
وانگشتہ بر من بے خود ہنوز
سرّے از "اسرار" و رمزے از "رموز"

(ہمایوں مئی ۱۹۲۲ء)

حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک

(جناب مہدی حسن صاحب افادی الاقتصادی مرحوم)

سرسید کی "بزم ادب" بچے کھچے پرانے لائق پرستش بزرگوں کی گویا نچوڑ تھی۔ اب ان اصحاب کی تعداد بھی کم ہو رہی ہے۔ جنہوں نے جما جمایا نقشہ یعنی پچھلے پہر کا خواب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

ان میں سے ہر فرد اپنے دائرہ کا مالک تھا اور مستقل ہستی رکھتا تھا۔ آج وقار الملک اور محسن الملک کی یادگار میں چند سطریں لکھنے والا بھی کوئی نظر نہیں آتا۔

یہ بات بھولنے کے لائق نہیں ہے کہ جہاں تک سرسید کی ادبی تبلیغ کا تعلق ہے یہ دونوں گویا اُن کے دست و بازو تھے، سرسید کے ساتھ محسن الملک کی نوک جھونک، ادبی راز و نیاز جس کا ایک خاکہ مراسلات دلچسپ میں دکھایا گیا ہے اور جس کے عالمانہ اور سخن گسترانہ شواہد "مرحوم تہذیب الاخلاق" کے سینزدہ سالہ فائل میں بکثرت ملیں گے، فتوحاتِ ادبیہ کا بہترین سرمایہ ہیں، جن پر مستقلاً اظہار خیال کی ضرورت ہے، میرے موضوع کے صفحاتِ محدودہ میں ان کے پھیلانے کی گنجائش نہیں یہاں صرف چشم سخن کے اشارہ پر قناعت کرنی ہوگی،

بہرحال کس کس کو یاد کروں، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، ذکاء اللہ، نذیر احمد، حالی و شبلی وغیرہ وغیرہ، سجی سجائی محفل تھی جو دیکھتے دیکھتے درہم برہم ہو گئی، "سرسید کی بزم ادب" ایسا وسیع موضوع ہے کہ اگر مولوی وحید الدین سلیم نے اپنی عمر ضائع نہ کی ہوتی اور سرسید اور ان کے رفقاء کے ساتھ جو وابستگی ان کو رہی ہے اور جس کے آثار "معارف" کے نقش اوّل میں بافراط موجود ہیں، وہ افسانۂ یارانِ کہن کی حیثیت سے ایک ضخیم الاوراق اور نہائیت دلچسپ کتاب تیار کر سکتے تھے، اگر یہ صحیح ہے کہ کسی شخص کی اخلاقی فوقیت کا راز دراصل اس کی پاکیزہ سوسائٹی میں مضمر ہوتا ہے تو "سیر الصحابہ" کی طرح علیگڈھ کی یہ آخری بزم ادب ہمارے لئے وقت کی چیز اور نتیجہ خیز رہتی،

خیر ان تصریحات کے بعد اصل موضوع کی طرف لوٹیئے، سرسید نے ہمیشہ معاصرین ادب کی حوصلہ افزائی کی، ان کی با اثر شخصیت خاموش تصرف کے ساتھ دوسروں کی قلب ماہیت کرتی رہتی تھی، شبلی نے "مولویت" علیگڈھ میں پہنچ کر چھوڑی، ان کے خیالات کی کایا پلٹ

مذاق تصنیف اور وسیع النظری، غرض یہ جو کچھ ہوئے سرسید کے دامن تربیت کا اثر تھا، شبلی نے الماموں کا دوسرا اڈیشن جب شائع کیا ہے تو سرسید نے جس خلوص کے ساتھ اس پر دیباچہ لکھا وہ آج بھی ان کی شرافت ادبی کا پتہ دیتا ہے، اسی طرح حالی کی نیچرل شاعری خیالات کے لحاظ سے سرسید کے فیض صحبت کی ممنون ہے، ابھی یہ فیصلہ باقی ہے کہ حالی کی روش جدید نے پروفیسر آزاد کی ڈالی ہوئی داغ بیل یعنی اُن کے نتائج فکر سے کہاں تک فائدہ اُٹھایا جن کو تاریخی حیثیت سے کم سے کم اوّلیت کا شرف حاصل ہے، مختصر یہ کہ متاخرین ادب کے ساتھ سرسید کا درجہ متناسبہ صرف مربیانہ تھا اس لئے ایسی باوقار ہستی سے چشمک تو خیر اس کی کسرات بھی بمشکل ہاتھ آئیں گی،

پروفیسر آزاد اس قدر بلند خیال اور اُستادانہ دل ودماغ رکھتے تھے کہ ان کے ہاں بھی جہاں تک معاصرین کا تعلق ہے چشمک، کا گذر نہیں، ایک واقعہ دلچسپ اہل ذوق کی ضیافت طبع کے لئے لکھتا ہوں، لاہور میں پہلی دفعہ جب ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا تو پروفیسر آزاد زندہ تھے، گو دماغ کسی حد تک متاثر ہو چکا تھا، نذیر احمد ملنے کے لئے گئے، حالی اور غالباً شبلی بھی ساتھ تھے، نذیر احمد کا لکچر ہونے والا تھا جو چھپا ہوا اُن کے ہاتھ میں تھا، آزاد رسالہ کی طرف متوجہ ہوئے تو نذیر احمد نے یہ کہہ کر آگے بڑھا دیا کہ ایک نظر دیکھ لیجئے، کانفرنس میں پیش کرنا ہے، آزاد فوراً قلم سنبھال کر بیٹھ گئے اور کاٹ چھانٹ شروع کر دی، نذیر احمد آزاد کی اس بے تکلفی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جوش محبت سے آنکھیں نم ہو گئیں، اُن کو قدرتی طور پر یہ خیال آیا کہ ابھی ان کے دائرہ میں ایک شخص ایسا موجود ہے جو ایک "بوڑھے بچہ" کی مشق سخن پر نظر ثانی کر سکتا ہے،

حالی بھی آزاد کی اُستادی کا لوہا مانتے تھے، اُن کی مخلصانہ عقیدت کیشی کے لئے وہ تقریظ و تنقید دیکھئے جو "آب حیات"، اور "نیرنگ خیال" پر حالی نے لکھی ہے، اور جس میں ضمناً یہ طے کر دیا ہے کہ نیچرل شاعری دراصل آزاد کی صنعت فکر کا نقش اولین اور ان کی ادبیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے، حالی لکھتے ہیں، "نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے، یعنی لٹریچر کے رقبہ کا طول وعرض بڑھ گیا، لیکن اس کا ارتفاع جہاں تھا وہیں رہا، یعنی اخلاقی سطح بہت اُونچی نہیں ہوئی، لیکن آزاد کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی نے یہ کمی پوری کر دی" "نیرنگ خیال" کی بہت کچھ داد دی ہے، کیونکہ آزاد کے قلم نے "پہلے پہل جذبات انسانی کی تجسیم وتشخیص کی، اور معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں، اور خصائل انسانی کے فطری خواص

ایسے موثر اور دلکش پیرایہ میں بیان کئے ہیں جن سے اُردو لٹریچر اب تک خالی تھا۔"

شبلی بھی آزاد کا ادب کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے "آزاد اُردوئے معلّٰی کا ہیرو ہے، اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں، وُہ اصلی معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے" تاہم ایک ہلکی سی چشمک لیجئے،

ہندوستان کے سب سے بڑے انشا پرداز نے نیرنگ خیال میں جہانگیر کی یہ تصویر کھینچی ہے "اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا، وُہ خود نشہ میں چُور تھا، ایک عورت صاحب جمال (نورجہاں) اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی، وُہ جو کچھ دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اس کی زبان سے کہتا تھا، اس پر بھی ہاتھ میں ایک فرد کاغذ کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا، یہ سوانگ دیکھ کر سب مسکرائے۔ مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ تھی، اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا، اس لئے بدمست بھی نہیں ہوتا تھا، جب نشہ سے آنکھیں کھُلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔"

"تزک جہانگیری" کی ریویو میں شبلی فرماتے ہیں "آؤ دیکھیں اس جھوٹ میں کچھ سچ بھی ہے؟ ہمارے انشا پرداز نے جہانگیر کے کبھی کبھی ہوش میں آنے کا جو کارنامہ بتایا ہے وُہ اس کی کتاب تزک جہانگیری ہے۔" اس کے بعد شبلی نے جو کچھ لکھا ہے نافدانہ اور سخن گسترانہ ہے، یعنی بے ضرر چشمک کی ایک خوبصورت مثال ہے، جو عنوان زیر بحث کے تحت میں آسکتی ہے،

"شعر العجم" جس زمانہ میں لکھی جا رہی تھی میں نے شبلی کو توجہ دلائی کہ آزاد کی تالیف مرغوب پر نگاہ رکھئے گا، جو موضوع مشترک پر نکلنے والی ہے، وُہ سمجھے میرا مطلب، "سخندان فارس" سے ہے، ایک دوست کو لکھتے ہیں،

"آزاد کا سخندان پارس حصہ دوم نکلا، سبحان اللہ، لیکن الحمدللہ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"

"مجھے تحریر فرماتے ہیں" آزاد کی کتاب آئی، جانتا تھا کہ وُہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں، تاہم اِدھر اُدھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو وحی معلوم ہوتی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیارہ لیکچر تک اُس نے میری سرحد میں قدم نہیں رکھا، بارھویں میں یہ میدان میں اُترا ہے، لیکن زور پہلے صرف ہو چکا تھا یونہی سرسری چکر لگا کر نکل گیا۔"

میں نے لکھا، میری غرض سخندانِ فارس سے نہیں بلکہ آزاد کے "تذکرۂ شعرا" سے تھی، اس پر تحریر فرماتے ہیں، "میں آزاد کی طرف سے بالکل مطمئن ہو گیا تھا، لیکن آپ نے پھر ڈرا دیا، مجھ کو پہلے سے معلوم ہوتا تو اس مضمون پر ہاتھ نہ ڈالتا" یہ جزئیات جو دکھا رہا ہوں خارج از موضوع نہیں ہیں، اُن سے یہ پتہ چلے گا کہ شطرنج کی اصطلاح میں بساط ادب کے یہ شاطر مہرے آپس میں کس طرح گتھے ہوئے تھے۔

نذیر احمد بھی تنقیص پسند نہیں تھے، ان کی لے دے زیادہ تر سرسید پر رہتی تھی، لیکن اس طرح کہ:-

"وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی"

خلوص تھا کہ حرف حرف سے ٹپکا پڑتا تھا، طبیعت میں منقولانہ رنگ غالب تھا۔ اِس لئے شروع شروع سرسید کے اجتہادات سے ان کو جھجھک سی تھی جو رفتہ رفتہ گئی، اور اس طرح گئی کہ سرسید کے عقیدت کیشان باصفا میں یہ کسی سے پیچھے نہیں تھے، اور اُس پر فخر کرتے تھے، یہ فراخ دلی جس کے شواہد اُن کے لٹریچر میں کثرت سے نظر آئیں گے، سرسید تک محدود نہ تھی، اوروں کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا، ایک آدھ واقعہ اشتہاداً لیجئے،

علیگڈھ کے اسٹریچی ہال میں کانفرنس کی مقتدر جماعت کا اجلاس ہے، اطراف ملک سے پڑھے لکھے اور روادار لوگ آ آ کر جمع ہوئے ہیں، خلیبانہ بلند آہنگی کے سلسلہ میں ایک آواز یوں گویا ہوتی ہے، "میں نے کسی زمانہ میں عربی اچھی پڑھی تھی اب تو ایسا بھول گیا کہ مولوی شبلی ایک صیغہ پوچھ بیٹھیں تو بغلیں جھانکنی پڑیں" ان فقروں کا نکلنا تھا کہ اس زمانہ کے مولوی شبلی جو نئے نئے علیگڈھ آئے تھے ہزاروں نگاہوں کے نقطۂ شعاعی بنے ہوئے تھے، اور یہ اُن کی قابلیت کا پہلا اعتراف تھا جس کا اثر بجلی کی طرح ہال کے ایک سرے سے دُوسرے سرے تک دَوڑ گیا،

اسی طرح نذیر احمد لکچر سے پہلے کبھی کبھی اپنی نظم سُنایا کرتے تھے، ایک موقع پر فرماتے ہیں:-

"جس طرح یسعیاہ پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی منادی کرتے تھے کہ میرے بعد مجھ سے ایک بہت بڑا پیغمبر آنے والا ہے، اسی طرح میری نظم گویا ندائے عام ہے کہ میرے بعد مولوی الطاف حسین حالی اپنی نظم پڑھیں گے، اور میں اپنی پندار میں ان کی نظم کی رونق کا باعث ہوتا ہوں"

اخلاقاً ایک ہم عصر کی شاعرانہ فوقیت کے اعتراف کا یہ کتنا بلیغ اور خوبصورت پیرایہ ہے،

اب میں اپنے مطلب سے قریب ہوتا جاتا ہوں، یہاں تک صرف بیانات اضافی تھے اصلی کام حالی و شبلی کو باہم ٹکرانا ہے، لیکن ترتیباً پہلے یہ دیکھئے کہ حالی نے شبلی کی نسبت جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُس میں "چشمک" کا کوئی عنصر موجود ہے، یا نہیں؟ معارف میں نامۂ حالی و شبلی کا سلسلہ کچھ عرصہ سے جاری ہے، ان خطوں میں حالی، شبلی کو اس خلوص حسن، اشتیاق سے یاد کرتے ہیں، ان کی ایک ایک تصنیف کا جس شوق و ذوق سے نام گناتے ہیں وہ بھی اس آرزو کے ساتھ کہ کوئی کتاب ان کی لائبریری کے آغوش میں جگہ پانے سے رہ نہ جائے، اخلاص کی آخری حد ہے، خط دیر میں ملتا ہے، تو کہتے ہیں "اس قدر مدت کے بعد عنایت نامہ کے ورود نے میری آنکھوں کے ساتھ وہی کیا جو پیراہنِ یوسف نے چشم یعقوب کے ساتھ کیا تھا" جس خط کو دیکھئے درد و محبت اور ایک خاص طرح کی صدق مقالی جو بڑے بوڑھوں کا حصہ ہوتی ہے لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے، شبلی کے پاؤں کا واقعہ پیش آتا ہے تو گھبرا کر ان کے فرزند رشید یعنی حامد شبلی سے خیر و عافیت دریافت کرتے ہیں، اور باوصف اس کے کہ آنکھ نے جواب دیدیا ہے، قویٰ میں باقتضائے سن عام اضمحلال ہے، پھر بھی اعظم گڈھ کے سفر کی آمادگی ظاہر کرتے ہیں، یہاں تک کہ الندوہ میں شبلی کے احباب کی رباعیات دیکھ کر حالی کو خیال آتا ہے کہ وہ مولانا (شبلی) کے زمرۂ احباب میں ہونے کا فخر حاصل کریں، اس لئے ایک رباعی موزون کرکے بھیجتے ہیں کہ الندوہ کے کسی آئندہ نمبر میں اُسے بھی جگہ دے دیجئے گا،

سیرۃ النعمان جب شائع ہوئی تو حالی نے اس پر ریویو لکھا، فرماتے ہیں "اُنہوں نے (یعنی شبلی) نے اپنی ہر ایک پہلی تصنیف میں جس بلندی پر آپ کو دکھایا ہے، اس کے بعد کی تصنیف میں ان کی لیاقت اور روشن دماغی اس سے بلند تر منظر پر جلوہ گر ہوتی ہے، اور جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے سیرۃ النعمان کو ان سب سے اعلیٰ منظر پر پاتا ہوں" کتاب کی ترتیب، اصول استنباط، اور طرز اجتہاد کے لحاظ سے "شبلی کو حالی نے" فاضل، ادیب، محقق اور اگر وہ منظور کریں تو منشی اور شاعر" کی حیثیت سے یاد کیا ہے اور دکھایا ہے کہ "جس طرح حسن تناسب اعضا کا نام ہے، سیرۃ النعمان میں روایت و درایت کی تطبیق، اور جس نہج طریقہ پر رائے اور قیاس سے کام لیا گیا ہے، اس طریقہ استدلال سے فلسفۂ مذہب کی بنیاد قائم ہوتی ہے، اور مصنف (یعنی شبلی) نے اپنی فضیلت اور لیاقت پر سے بہت سے پردے

اُٹھا دیئے ہیں۔"

شبلی "دستۂ گل" ہدیۃً بھیجتے ہیں تو حالی جواباً لکھتے ہیں:۔

"کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں، غزلیں کاہے کو ہیں، شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے، غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اُس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔"

آپ کہیں گے کہ ان مسلسل انکشافات میں سوائے بہکی ہوئی باتوں کے مقصود اصلی یعنی چشمک کا اب بھی پتہ نہیں، لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ میں اصلی نکتہ سے قریب تر ہوتا جاتا ہوں، اصولاً اخلاق کے ساتھ تھوڑی سی کج ادائی بھی ہو تو زیادہ اجاگر ہوتی ہے، جو آنکھیں روشنی کی عادی ہوتی ہیں اُن کو تاریکی گراں گذرتی ہے، اسی طرح نفس انسانی کا رُخ روشن اس کے دوسرے رُخ کو زیادہ نمایاں کر دیتا ہے، اس لئے میری اضافی تصریحات بے کار نہیں ہیں، بہرحال اظہار خلوص کی حد ہو چکی، کچھ اصل موضوع یعنی "چشمک" کی مثالیں لیجئے،

حیات جاوید میں ایک موقع پر حالی فرماتے ہیں، "اعلےٰ تعلیم کی حمائیت کے جوش میں سرسید کے قلم سے بعض مواقع پر ایسے الفاظ نکل گئے ہیں کہ ترجموں کی غرض سے سوسائیٹی قائم کرنے کو وہ اپنی ایک غلطی تسلیم کرتے تھے، اور اسی بنا پر شمس العلماء مولانا شبلی نے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم میں اس غلطی کا جس کو سرسید ۷۰ برس پہلے ایجوکیشن کمیشن میں تسلیم کر چکے تھے ذکر کیا ہے، اور اس بنا پر کہ مغربی علوم و فنون کا دیسی زبان میں ترجمہ ہونا ممکن نہیں ہے، سائنٹفک سوسائیٹی قائم کرنے کو سرسید کی ایک غلطی قرار دیا ہے، اور اپنے اس دعویٰ پر کہ ترجمہ ممکن نہیں زیادہ تر وہی دلیلیں جو خود سرسید نے بعض مواقع پر بیان کی تھیں پیش کی ہیں۔"

حالی کہتے ہیں کہ "اگر مولانا (یعنی شبلی) کی یہ اصلی رائے ہوتی تو ہم کو اس سے تعرض کی ضرورت نہ تھی، لیکن چونکہ انہوں نے خود سرسید کے بعض بیانات سے یہ رائے استنباط کی ہے، اس لئے ہم کو سرسید کے خیالات کا اصل منشاء ظاہر کرنا ہے۔" حالی نے ایک ایک اعتراض کی تردید کی ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے۔ کہ شبلی کے اعتراضات

کا زیادہ تر حصہ خود سرسید کے خیالات سے ماخوذ ہے" چشمک" کی یہ پہلی مثال ہے جس میں حالی کی حیثیت نسبتی، اقدامی نہیں بلکہ دفاعی ہے اور جس میں ناقدانہ اظہار خیال کے سوا در پردہ کوئی چوٹ نہیں ہے

یہاں تک تو آپ نے دیکھا کہ حالی کا شبلی کے ساتھ کیا رنگ تھا، لیکن یہ شراب اب تیز ہوا چاہتی ہے۔ اب یہ دیکھئے شبلی کے خیالات و مقالات کا جہاں تک خوش صفات حالی کا تعلق ہے کیا حال ہے، شبلی نے ابھی المامون نہیں لکھی ہے، یا لکھی ہے لیکن لکھنے سے پہلے "حیات سعدی" پیش نظر ہے، ایک عزیز کو لکھتے ہیں "ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفتہً بھیجی ہے، شیخ سعدی کی نہائیت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے میں نے بے اختیار اس کو تمہارے لئے پسند کیا، اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیج دیں، واقعی بے مثل ہے، اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہائیت ضروری ہے، لیکن یہ دیکھنا ہے کہ شبلی جب خود تصنیفات کے مالک ہوئے تو حالی کے ساتھ ان کا یہ حسن ظن کہاں تک قائم رہا؟

سوانح مولانا روم میں شبلی یوں اظہار خیال کرتے ہیں "تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ سعدی، عراقی اور مولانا روم ہیں، اس لحاظ سے مولانا کے دیوان پر ریویو کرتے ہوئے ہمارا فرض تھا کہ سعدی اور عراقی سے ان کا موازنہ کیا جاتا، تینوں بزرگوں کے نمونے دکھائے جاتے۔ اور ہر ایک کی خصوصیات بیان کی جاتیں، اور چونکہ مولانا ہمارے ہیرو ہیں، اس لئے مذاق حال کے موافق خواہ مخواہ بھی اُن کو ترجیح دی جاتی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا واقعہ نگاری کے قوانین کے بالکل خلاف ہے"

اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی یہ مان لیا جائے کہ شبلی کا روئے سخن حیات سعدی یا یادگار غالب کی طرف ہے تو "چشمک" کی یہ نہائیت ہی چبھتی ہوئی مثال ہوگی، جو ناظرین کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے، لیکن ایک نکتہ سنج پوچھ سکتا ہے کہ کیا یہی طریقہ نمایاں طور پر "موازنہ انیس و دبیر" میں اور ایک کافی حد تک "شعر العجم" میں اختیار نہیں کیا گیا؟ کلیات خسرو جس کی تہذیب و ترتیب بزعم علی گڈھ آج کل کے معرکۂ ادبی میں پیش پیش ہے اور جس میں تنقید کے سلسلہ میں معاصرانہ کلام کا موازنہ کیا گیا ہے، کہاں تک واقعہ نگاری کے خلاف "مذاق حال" سے بے نیازی کا دعویٰ کر سکتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آیا حالی اس نکتہ کے سمجھنے سے قاصر تھے؟

چشمک کی دوسری مثال یہ ہے:-

تذکرۂ گلشن ہند کے حاشیہ میں شبلی لکھتے ہیں:- "مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے

مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز پڑھا تھا، یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں، اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا مانند ار نہ ہو سکتی ہے۔"

اسی طرح جیسا کہ دیباچہ گلزار نسیم کے حاشیہ ذیل میں تصریح کی گئی ہے شبلی نے لائق چکبست کو لکھا تھا کہ "گلزار نسیم کی تنقید میں مولانا حالی نے سخت بے رحمی اور ناانصافی سے کام لیا ہے۔"

میں اس کے متعلق خود کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ مولوی عبدالحق کے ذمہ دار قلم سے ٹپکی ہوئی سیاہی جس طرح پھیلی ہے ایک نظر دیکھنے کے لائق ہے، جس طرح ناممکن ہے کہ کسی ٹکسالی اسٹینڈرڈ کتاب پر ان کا مقدمہ نہ ہو، یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی نہ کسی حیثیت سے حالی کی پاسداری میں یہ شبلی پر چوٹ نہ کرتے ہوں، یعنی "چشمک" کے جراثیم ان کے مقدمات میں اس کثرت سے ملیں گے کہ یہ اُن کے لٹریچر کے خصائص کا ایک جزو ہو گیا ہے۔ پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ موقع کے تاک میں رہتے ہیں اور اظہار خیال سے کبھی نہیں چوکتے، لیکن اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ جو کچھ لکھتے ہیں نکتہ سنجانہ لکھتے ہیں، یعنی شبلی کی تنقیص مقصود بالذات نہیں ہوتی۔

یہاں تک تو "چشمک" کی صرف نرم مثالیں تھیں یعنی تلخ گولیاں غلاف شکر میں، اب ذرا قوی تر شواہد لیجئے، مناقب عمر بن عبدالعزیز کے ریویو کے سلسلہ میں شبلی فرماتے ہیں:۔

"سوانح نویسی کے فرائض میں سے جو بڑا فرض مصنف سے رہ گیا وہ تنقید ہے، یعنی مصنف نے اپنے ہیرو کی خوبیاں دکھائی ہیں، اس کے کسی قول و فعل پر نکتہ چینی نہیں کی، لیکن یہ اس زمانہ کے تمام سوانح نگاروں کا انداز ہے۔"

اس سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"مصنفین اسلام آج کل کے فریب دہ طریقہ سے بالکل آشنا نہ تھے، آج کل کی سوانح نگاری کا انداز یہ ہے کہ حقیقت نگاری کے ظاہر کرنے کے لئے ہیرو پر نکتہ چینی کی جاتی ہے، لیکن اس طرح کہ محاسن نہایت وسعت اور عمومیت کے ساتھ ہر پہلو سے دکھائے جاتے ہیں، پھر نہایت کمزور اور ضعیف الفاظ میں ایک آدھ اعتراض بھی کر دیا جاتا ہے، جس سے دراصل مداحی کو اور قوت دینی مقصود ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے یہ ظاہر کرنا منظور ہوتا ہے کہ مصنف نے واقعہ نگاری کے

لحاظ سے کسی واقعہ کو چھپانا نہیں چاہا ہے، اور اس لحاظ سے ممدوح کی چھوٹی سی چھوٹی برائی کا بھی ذکر کر دیا ہے، ورنہ ایسے محاسن اور خوبیوں کے مقابلہ میں ایک ذرا سی برائی بالکل نظر انداز کرنے کے قابل تھی، یہ طریقہ ہماری زبان کے سوانح نگاروں نے یورپ سے سیکھا ہے، اور اردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں کا یہی انداز ہے، لیکن یہ طریقہ قدیم طریقہ سے بہت زیادہ قابل اعتراض بلکہ خطرناک ہے، قدیم طریقہ صرف سکوت کا مجرم تھا، لیکن موجودہ طریقہ درحقیقت خیانت اور خداعی ہے جو واقعہ نگاری سے بہراحل دور ہے،

یقیناً ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ شبلی کا روئے سخن کس کی طرف ہے، اور اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمری سے ممدوح کا مقصود کیا ہے؟ شیش محل میں بیٹھ کر اوروں پر پتھر پھینکنا ایک خوش ادائی سہی، لیکن کیا دانائی بھی ہے؟ اس کا جواب صفحات زیر تحریر میں مل جائے گا، لیکن جلدی نہ کیجئے اور لیجئے ماثر رحیمی کے ریویو میں ارشاد ہوتا ہے،

اس کتاب میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ خانخانان کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی ہیں، نکتہ چینی کا نام نہیں، حالانکہ آج کل کے مذاق کے موافق سوانح عمری اور لائف کی یہ ضروری شرط ہے، لیکن اس طریقہ کو ہم آج کل کے پُرفریب طریقہ سے زیادہ پسند کرتے ہیں، جس میں راست نویسی اور تنقید کا بہت کچھ دعویٰ کر کے بھی سوانح عمری کے بجائے مناقب کی کتاب لکھی جاتی ہے، اور کوئی عیب اور دُوہ بھی خفیف کر کے لکھا جاتا ہے تو اس غرض سے کہ محاسن کے یقین کرانے کے کام آئے یعنی جب عیب نہیں چھپاتا ہے تو محاسن کیوں غلط لکھے ہوں گے، بہتر سے بہتر سوانح عمری جو ہماری زبان میں لکھی گئی ہے، اس طریقہ کی عمدہ مثال ہے، ابھی اور لیجئے،

موازنہ انیس و دبیر میں اسی خیال کا اعادہ یوں کیا گیا ہے۔

"ہمارے زمانہ میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں باوجود دعوے آزادی کے تنقید اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا، اور اس کا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رُخ اس کو دکھائے جائیں، لیکن عذر کرنے والے خود اپنی نسبت غلطی کر رہے ہیں، جس چیز نے ان کو اظہار حق سے روکا ہے وہ ایشیائی شخص پرستی ہے، جس کا اثر رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور عذر کرنے والوں کو خود اس کا احساس نہیں ہوتا، اس غلامانہ شخص پرستی سے ایک بڑا ضرر یہ ہے کہ جو لوگ ان اکابر کی تقلید کرتے ہیں، ان میں ہزاروں ایسے ہوتے ہیں

جن کو نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی، اس لئے وہ اچھی باتوں کے ساتھ اکابر کی غلطیوں کی بھی تقلید کرنے لگتے ہیں اور سلسلہ در سلسلہ تمام قوم میں اس کا اثر پھیل جاتا ہے"

اخلاقی حیثیت سے مولانا کی نگاہ جس نکتہ پر بار بار پڑتی ہے، اس کے اہم نتائج سے کون انکار کر سکتا ہے آپ دیکھیں گے ابھی تک اظہار خیال پر ایک نقاب پڑی ہوئی ہے، مگر یہ نقاب اس قدر ہلکی ہے کہ باریک تاروں سے چھن چھن کر "چشمک" کی شوخیاں آپ کے ذوق پرہ دری کو اکسائیں گی، لیکن ذرا ٹھہریئے اس کا حسن عریانی دیکھنے کے لائق ہے، یعنی اس وقت تک تصریحات کی جگہ صرف اشارات و کنایات تھے، اب صاف صاف لیجئے شبلی کہتے ہیں:

"حیات جاوید میں مولانا حالی نے سید صاحب کی ایک رسمی تصویر دکھائی ہے، اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے مصائب دکھانے تنگ خیالی اور بد طینتی ہے، لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں، پھر ایشیائی شاعری میں کیا برائی ہے، سوائے اس کے کہ وہ محض دعویٰ کرتے تھے، واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے، بہرحال حیات جاوید کو محض تدلل مداحی سمجھتا ہوں"

اس پر بھی تسکین نہیں ہوتی ایک دوست کو پھر لکھتے ہیں،

"اختلاف آرا بھی کیا چیز ہے حیات جاوید کو میں تالیف نہیں سمجھتا بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں، اور وہ بھی غیر مکمل خیر الناس فیما یعشقون مذاہب۔

یہاں یہ دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "آجکل کا پُر فریب طریقہ سوانح نگاری" جو شبلی کے خیال میں ایک طرح کی "خیانت اور خداعی ہے" اور جس پر بار بار بے چینی کے ساتھ زور دیا گیا ہے، دراصل حالی کی ایجاد ہے، یا شبلی کی تصنیفات اسی دائرہ میں آجاتی ہیں، تاریخی تنقید کا یہ ایک نہایت نازک نکتہ ہے جس پر مولانا نے اگر مزید روشنی ڈالی ہوتی تو دنیائے ادب کے لئے ایک جدید انکشاف ہوتا۔

اسی طرح حالی کی صنعت گری جہاں یورپ کے طرز تحریر سے ماخوذ بتائی گئی ہے۔ شبلی یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اس پر فریب طریقہ سے جو ایشیائی شاعری سے ملتا جلتا ہے"، موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں گی" لٹریچر کی طرف سے مولانا کی اس نی الوقت دقیقہ رسی اور جوش التفات کا شکریہ، لیکن ایک نکتہ دان یہ سوال کر سکتا ہے کہ جس خطرے کا احتمال ظاہر کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے مغربی زبان کی کوئی سوانح عمری ایسی دکھائی جا سکتی ہے،

جس میں محاسن کے ساتھ معائب اُبھار کر دکھائے گئے ہوں، کم سے کم جتنی مستند کتابیں سیرۃ (الالف) کی حیثیت سے انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں، وہ اکثروں کے دائرہ نظر میں ہونگی، لیکن افسوس ہے کہ حیات جاوید کی طرح کسی کتاب سے مولانا کی توقعات پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتیں، یعنی ان میں ایسے مستقل ابواب نہیں ملتے جن میں "یکے از اقوالم جرائیم پیشہ" یا "باب الاشرار" کے عنوان سے کسی شخص کے حفظ غیب کا غیر ضروری خاکہ اُڑایا گیا ہو۔

ایک ادیب معارضہ بالمثل کی حیثیت سے پوچھ سکتا ہے کہ بلحاظ فن حالی کے جس اقتصار کی طرف نیک نیتی سے شبلی کا ذہن منتقل ہوا ہے خود اُن کی تصنیفات میں یہ رعایت کہاں تک ملحوظ رکھی گئی ہے یعنی المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، اور الغزالی میں انسانی کمزوریاں کس حد تک اُبھار کر دکھائی گئی ہیں؟ اس کا جواب مجھے خوف ہے خیر امید افزا ہوگا، کیا یہ علم النفس کی حق تلفی نہیں ہے جو ایک نکتہ سنج مورخ کے قلم سے ہو سکتی ہے کیونکہ عظمت خود "ملک کے سب سے بڑے مورخ" کے خیال کے مطابق واقعات کو بدل نہیں سکتی۔

بہرحال یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیات جاوید کے لئے حالی کی طرف سے اعتذار (اپالوجی) کی بالکل ضرورت نہیں، ایک شریف نے ایک شریف تر انسان کی ہمدردانہ سرگذشت لکھی اور آشنائے فن ہو کر لکھی، اور یہی اُونچے سے اُونچا معیار تحریر ہے جو ایمان بالغیب کی حیثیت سے یورپ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے:-

یہ قطعی ہے کہ حیات جاوید کا رئیس التذکرہ فرشتہ نہیں تھا، انسان تھا لیکن اُس کے اخلاقی اوصاف اس کی اضطراری لغزشوں پر جنہیں انسانی کمزوری سمجھئے غالب تھے، یہی مابہ الامتیاز ہے جس کی بنا پر سوانح نگار کسی بڑے سے بڑے شخص کو دُنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے، سرسید کی کمزوریاں جن کی بے نقابی پر شبلی کو اس قدر اصرار ہے اور جن کے اظہار میں حالی نے صرف بے دردی سے کام نہیں لیا، دراصل سرسید کی زندگی کے وہ عناصر ہیں جن کے بغیر انسانی اخلاق کی تکمیل ناممکن ہے، لیکن اس قسم کی اضافی تصریحات کا بے ضرورت پھیلانا اور تنقیصی پہلو کا اس طرح نمایاں کرنا کہ اصلی محاسن دب دبا جائیں بالکل ایسا ہی ہوگا جس طرح زندہ کے آخری مناقشات کو شبلی کی ادبی زندگی سے وابستہ کیا جائے، جس پر مولانا کا سوانح نگار کبھی راضی نہیں ہوگا، اور جسے شبلی کی علمی "نفسیت" (سائیکالوجی) سے دراصل کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ غور طلب ہے کہ غالب کی طرح شبلی کی افراط خود داری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہیں ہے، شبلی نے الکلام لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا، حالانکہ سرسید پہلے شخص ہیں جنہوں نے دورِ جدید میں مذہب کو معقولات عصریہ سے تطبیق دینے کی کوشش کی اور یہ امر باختلاف اُن کی ادبیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے، ہم کو مصر کے مذہبی لٹریچر کی اوقات معلوم ہے، اس لئے مصطلح جُبّہ و دستار کی فضیلت سے اگر قطع نظر کر لیجئے تو سرسید اور ان کے رفقاء نے جو کچھ لکھ دیا ہے مشکل سے اس پر کچھ اضافہ ہو سکتا ہے، اور یہ سرسید کے اختراعی دماغ اور اُن کے زبردست اجتہاد کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ عدم اعتراف در اصل لٹریچر کی خوش ظرفی ہوگی، میں یہاں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا، کہ عقائد کو جو جذباتی چیز ہیں معقولات سے بھڑانا جس پر ہمارے متکلمین کو اس قدر ناز ہے در اصل کہاں تک "گول خانہ میں چوکھٹی چیز" کا مصداق ہے، میرا منشاء صرف یہ ہے کہ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت لکھا گیا یا آئندہ لکھا جائے گا وہ محض سرسید کے قلم کی آواز بازگشت ہوگی۔ یہ دلچسپ سوال ابھی باقی ہے کہ حالی کے ہیرو کے ساتھ شبلی کو اس قدر چشمک، کیوں ہے کیا یہ جامع حیثیات شخصیت شبلی کے نامور ان اسلام کا رنگ پھیکا کرنے والی ہے؟ جس طرح ایک خوبصورت عورت دوسری پر کالۂ آتش کو دیکھ نہیں سکتی در اصل جذبۂ رشک اس کی تہ میں ہے؟ ملک کے ایک بہت بڑے فاضل کی رائے کے مطابق سرسید کے بعد اگر اردو میں کوئی قلم اٹھا سکتا ہے تو وہ حالی ہیں، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حالی نے سرسید کی صرف کثیر الاوراق لائف نہیں لکھ دی" بلکہ یادگار لٹریچر میں ایسا اضافہ ہے جو حالی کی ذات پر ختم ہو گیا، لیکن کیا، شعر العجم، کے مصنف کو بھی اس پر رشک کرنا چاہیئے۔ اس کا جواب آگے چل کر تاریخ دے گی، نہ جاننا کبھی کبھی جاننے سے زیادہ باکیف ہوتا ہے، اس لئے سردست میں اس لطف کو کھونا نہیں چاہتا۔

لیکن شعر العجم کے ساتھ جو ایک ذوقی چیز ہے میری بڑھی ہوئی حسن عقیدت اس موازنہ کو جائز نہیں رکھنے گی، اس لئے حیاتِ جاوید کے مقابلہ میں شبلی کی صرف ان تصنیفات کو رکھئے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے جنس مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں، آج کل کی عوائد رسمیہ (ایٹی کیٹ) کی نزاکتیں شائستہ سوسائٹی میں موازنہ اوصاف کو جائز نہیں رکھتیں، لیکن مصنفین کے دماغوں کی رگاڑ، فن تنقید کا ایک سخن گسترانہ فرض ہے، جس سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی، اس لئے چشمک کے وہ عقدہائے سربستہ جن میں حالی کے مقابلہ میں لائق عزت شبلی کا

پہلو کچھ دبتا ہوا سا ہے، کھلے ہوئے راز کی حیثیت سے پیش کئے گئے ہیں۔

قبل اس کے کہ میں اسے ختم کروں ایک فقرہ مترنمہ بار طبیعت ہو رہا ہے جس سے اسی سلسلہ میں نپٹ لینا چاہتا ہوں "چشمک" جس کے متعدد نظائر جہاں تک گنجائش تھی بہم پہنچائے گئے ہیں، وراثت طبعی کے اثر سے اس کا سلسلہ اور بڑھتا ہے، ایک زاویۂ علمی کا نوجوان سید الطائف جسے آگے چل کر نظام ادبی کا ایک قوی تر عنصر ہونا ہے، ایک غیر متعلق تصنیف کے سلسلہ میں یوں اظہار خیال کرتا ہے،

"مولوی نذیر احمد بھی اس گناہ کے مجرم ہیں، جس قلم نے مرآۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت اور ایامیٰ لکھنے میں زندگی بسر کی ہو وہ الفرائض، اجتہاد، ترجمہ قرآن، امہات الامۃ کے لئے سنجیدگی عبارت، متانت کلام، اور ثقاہت بیان کہاں سے لائے گا، مقصود یہ ہے کہ مذہبی کتابوں اور بزرگان دین کی تاریخ کے لئے سنجیدگی چاہیئے، شوخ اور ظریفانہ عبارت اور سخیف محاورات موزوں نہیں"

یہ مولوی نذیر احمد کون؟ وہی جن کا تصنیفی نام عوام میں "ڈپٹی نذیر احمد" ہے، آہا! آقائے علامہ نذیر احمد، ایل ایل ڈی! جو ملک میں السنہ مشرقیہ کا سب سے بڑا ادیب تھا، جس کی عربیت اس پایہ کی تھی کہ سخت سے سخت منحرف بھی اس کا لوہا مانتے تھے اور اس کے تبحر علمی سے مرعوب رہتے تھے، جس نے اردو سی کم مایہ زبان کو اپنے خاص طرز ادا اور زور فصاحت سے ایسا کر دیا کہ آئندہ اس پر ادب العالیہ (کلاسیکس) کا اطلاق ہو گا، جس کی طبیعت میں قدرت نے عربی کا مذاق اس لئے رکھا تھا کہ وہ عرب کے صحیفۂ آسمانی کا قالب بدل سکے، پہلے ترجمۂ قرآن کا یہ رنگ تھا۔

"دستی نکالتیاں اور یار کرتیاں چھپ کر"

اب وہ شستہ رفتہ اور فصیح اردو کا ایسا مرقع ہے جس پر انشا پردازی ناز کر سکتی ہے "نذیر احمد نے مرآۃ العروس کے سوا اگر کچھ نہ لکھا ہوتا جب بھی ان کے کمال انشا پردازی کے ثبوت کے لئے یہ اکیلی کتاب کافی تھی ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ اس وقت ایک گراں پایہ مصنف تھے، جب ہمارے لائق ادب بزرگوں میں بہتیروں نے قلم ہاتھ میں نہیں لئے تھے، رہی ان کی ظرافت جو انہی کا حصہ ہے اور جسے آپ کھانے میں نمک سمجھتے اور میں الطریچر کے چہرے کا تبسم کہونگا جو نئی تحقیقات کے مطابق صرف خوش ادائی نہیں بلکہ اخلاقی پاکیزگی کے ساتھ کامل صحت

یہ غور طلب ہے کہ غالب کی طرح شبلی کی افراط خود داری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہیں ہے، شبلی نے الکلام لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا، حالانکہ سرسید پہلے شخص ہیں جنہوں نے دورِ جدید میں مذہب کو معقولات عصریہ سے تطبیق دینے کی کوشش کی اور یہ امر بلا اختلاف اُن کی ادبیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے، ہم کو مصر کے مذہبی لٹریچر کی اوقات معلوم ہے، اس لئے مصطلح جُبّہ و دستار کی فضیلت سے اگر قطع نظر کر لیجئے تو سرسید اور ان کے رفقاء نے جو کچھ لکھ دیا ہے مشکل سے اس پر کچھ اضافہ ہو سکتا ہے، اور یہ سرسید کے اختراعی دماغ اور اُن کے زبردست اجتہاد کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ عدم اعتراف در اصل لٹریچر کی خوش ظرفی ہوگی، میں یہاں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتا، کہ عقائد کو جو جذباتی چیز ہیں معقولات سے بھڑانا جس پر ہمارے متکلمین کو اس قدر ناز ہے در اصل کہاں تک "گول خانہ میں چوکھٹی چیز" کا مصداق ہے، میرا منشاء صرف یہ ہے کہ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت لکھا گیا یا آئندہ لکھا جائے گا وہ محض سرسید کے قلم کی آواز بازگشت ہوگی۔ یہ دلچسپ سوال ابھی باقی ہے کہ حالی کے ہیرو کے ساتھ شبلی کو اس قدر "چشمک" کیوں ہے کیا یہ جامع حیثیات شخصیت شبلی کے نامور ان اسلام کا رنگ پھیکا کرنے والی ہے؟ جس طرح ایک خوبصورت عورت دوسری پر کالۂ آتش کو دیکھ نہیں سکتی در اصل جذبۂ رشک اس کی تہ میں ہے؟ ملک کے ایک بہت بڑے فاضل کی رائے کے مطابق سرسید کے بعد اگر اردو میں کوئی قلم اُٹھا سکتا ہے تو وہ حالی ہیں، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حالی نے سرسید کی صرف کثیر الاوراق لائف نہیں لکھ دی" بلکہ یادگار لٹریچر میں ایسا اضافہ ہے جو حالی کی ذات پر ختم ہو گیا، لیکن کیا "شعر العجم" کے مصنف کو بھی اس پر رشک کرنا چاہیئے۔ اس کا جواب آگے چل کر تاریخ دے گی، نہ جاننا کبھی کبھی جاننے سے زیادہ باکیف ہوتا ہے، اس لئے سر دست میں اس لطف کو کھونا نہیں چاہتا۔

لیکن شعر العجم کے ساتھ جو ایک ذوقی چیز ہے میری بڑھی ہوئی حسن عقیدت اس موازنہ کو جائز نہیں رکھنے گی، اس لئے حیات جاوید کے مقابلہ میں شبلی کی صرف ان تصنیفات کو رکھئے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے جنس مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں، آج کل کی عوائد رسمیہ (ایٹی کیٹ) کی نزاکتیں شائستہ سوسائٹی میں موازنہ اوصاف کو جائز نہیں رکھتیں، لیکن مصنفین کے دماغوں کی رگاڑ، فن تنقید کا ایک سخن گسترانہ فرض ہے، جس سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی، اس لئے چشمک کے وہ عقدہائے سربستہ جن میں حالی کے مقابلہ میں لائق عزت شبلی کا

پہلو کچھ دبتا ہوا سا ہے، کھلے ہوئے راز کی حیثیت سے پیش کئے گئے ہیں۔

قبل اس کے کہ میں اسے ختم کروں ایک فقرہ مستر مہ بار طبیعت ہو رہا ہے جس سے اسی سلسلہ میں نپٹ لینا چاہتا ہوں "چشمک" جس کے متعدد نظائر جہاں تک گنجائش تھی بہم پہنچائے گئے ہیں، وراثت طبعی کے اثر سے اس کا سلسلہ اور بڑھتا ہے، ایک زاویۂ علمی کا نوجوان سید الطائفہ جسے آگے چل کر نظام ادبی کا ایک قوی تر عنصر ہونا ہے، ایک غیر متعلق تصنیف کے سلسلہ میں یوں اظہار خیال کرتا ہے،

"مولوی نذیر احمد بھی اس گناہ کے مجرم ہیں، جس قلم نے مرآۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت اور ایامیٰ لکھنے میں زندگی بسر کی ہو وہ الفرائض، اجتہاد، ترجمہ قرآن، امہات الامۃ کے لئے سنجیدگی عبارت، متانت کلام، اور ثقاہت بیان کہاں سے لائے گا، مقصود یہ ہے کہ مذہبی کتابوں اور بزرگان دین کی تاریخ کے لئے سنجیدگی چاہیئے، شوخ اور ظریفانہ عبارت اور سخیف محاورات موزوں نہیں"

یہ مولوی نذیر احمد کون؟ وہی جن کا تصنیفی نام عوام میں "ڈپٹی نذیر احمد" ہے آہا۔ آقائے العلماء علامہ نذیر احمد، ایل ایل ڈی، جو ملک میں السنہ مشرقیہ کا سب سے بڑا ادیب تھا، جس کی عربیت اس پایہ کی تھی کہ سخت سے سخت منحرف بھی اس کا لوہا مانتے تھے اور اس کے تبحر علمی سے مرعوب رہتے تھے، جس نے اردو سی کم مایہ زبان کو اپنے خاص طرز ادا اور زور فصاحت سے ایسا کر دیا کہ آئندہ اس پر ادب العالیہ (کلاسیکس) کا اطلاق ہو گا، جس کی طبیعت میں قدرت نے عربی کا مذاق اس لئے رکھا تھا کہ وہ عرب کے صحیفۂ سماوی کا قالب بدل سکے، پہلے ترجمۂ قرآن کا یہ رنگ تھا۔

"دستی نکالتیاں اور یار کرتیاں چھپ کر"

اب وہ شستہ رفتہ اور فصیح اردو کا ایسا مرقع ہے جس پر انشا پردازی ناز کر سکتی ہے، نذیر احمد نے مرآۃ العروس کے سوا اگر کچھ نہ لکھا ہوتا جب بھی ان کے کمال انشا پردازی کے ثبوت کے لئے یہ اکیلی کتاب کافی تھی ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ اس وقت ایک گراں پایہ مصنف تھے، جب ہمارے لائق ادب بزرگوں میں بہتیروں نے قلم ہاتھ میں نہیں لئے تھے، رہی ان کی ظرافت جو انہی کا حصہ ہے اور جسے آپ کھانے میں نمک سمجھتے اور میں لٹریچر کے چہرے کا تبسم کہونگا جو نئی تحقیقات کے مطابق صرف خوش ادائی نہیں بلکہ اخلاقی پاکیزگی کے ساتھ کا ہلی صحت

کی دلیل ہے،

صرف ایک مثال لیجئے، نزول قرآن کے سلسلہ میں نذیر احمد اپنے فصیح لکچر میں ایک جگہ کہتے ہیں:-

"جن دنوں قرآن نازل ہوا ہے وہ ایک وقت تھا عربی لٹریچر کے جوبن پر ایک بہار آرہی تھی لوگوں میں یہ ملکہ ایسا برسر ترقی تھا کہ کوئی متنفس مذاق شعری سے خالی نہ تھا، یہ تو عربی زبان کے عروج کا زمانہ تھا، یوں بھی عرب کو اپنی بولی پر بلا کا ناز تھا، انہوں نے اپنے سوا دوسروں کا نام رکھا تھا عجم، یعنی گونگے یا جن کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں، ایسے لوگوں سے کیسی ہی اچھی بات کہی جاتی مگر وہ ہوتی جلیۂ فصاحت سے عاری تو ان کے کان پر جوں بھی نہ چلتی، بس ضرور تھا کہ اسی داؤ سے ان کو پچھاڑا جائے۔ جو داؤ ان کو خوب رواں تھا، یعنی فصاحت، قرآن نازل ہوا تو جو اپنے اپنے وقت کے سرسید، محسن الملک، سید محمود، اور حالی و شبلی تھے سب کے چھکے چھوٹ گئے۔"

یہی بلاغت ہے جس کی بنا پر کہا گیا ہے کہ انشا پرداز کا ایک فقرہ ہزاروں علمی اور تاریخی اوراق پر بھاری ہوتا ہے، اور یہی تصرفات ہیں جن کے لحاظ سے ایک ادیب کو بڑے سے بڑے فلسفی اور مورخ پر ہمیشہ ترجیح رہے گی۔

یہی بلاغت تھی جس نے کسی زمانہ میں حیدرآباد دکن کے بسا رک کو نذیر احمد کا شیدائی بنا رکھا تھا، سر سالار جنگ اول اسٹیٹ ڈنر پر ہیں، طلائی قابون کا دور چل رہا ہے، چھری کانٹوں کی دھیمی موسیقیت میں دفعتہً سرکاری ڈاک کے آنے کی اطلاع ہوتی ہے، ارشاد ہوتا ہے نذیر احمد کی کوئی مراسلت ہو تو فوراً پیش کی جائے، ایک منٹ کے بعد جلیل القدر میز بان شام کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہوتا ہے، برقی روشنی کی جگمگاہٹ میں شائق ادب امیر الامرا کی نگاہ نقوش حرفی پر دوڑ رہی ہے، اور چہرے پر رہ رہ کر وہ کیفیت طاری ہوتی ہے جسے تبسم زیر لب کی ہلکی لہریں کہئے، نذیر احمد کے خوان ادب کا یہ وہ لقمۂ تر تھا جس سے شاہی میز بھی بے نیاز نہ رہ سکی، لیکن اب یہ ہمارے گلے میں پھنسنے لگا ہے جسے ہم اگلنا چاہتے ہیں، مگر یہ بے نمک روایات سابقہ کے لحاظ سے کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی، ادب چاہتا ہے ان کا کمال انشا پردازی غیر ستایشی جنبش لب سے ہمیشہ بے نیاز رہے گا۔

آخر میں مجھے ایک نکتہ صاف کرنا ہے یعنی حالی کے ساتھ شبلی کی چشمک کے جو

شواہد پیش کئے گئے ہیں اُن سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ شبلی کو حالی سے خلوص نہیں تھا۔ شبلی حالی کو ہمیشہ عزت کے ساتھ یاد کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ "جب تک مواد تحریری نہ ہو میں ایک قدم بھی چل نہیں سکتا، مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں، ان کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور یہ کمال اجتہاد کی دلیل ہے"۔

پانی پت کے واقعہ کے بعد شبلی کو حالی نے وفورِ جوش میں جو رُباعی لکھ کر بھیجی تھی، اور جس کا ذکر اُوپر گذر چکا ہے، شبلی النّدوہ میں "مولانا حالی کی ذرّہ نوازی" کے عنوان سے یوں رقمطراز ہیں:-

"مولانا کا میری نسبت ایسے خیالات ظاہر کرنا محض ان کی ذرّہ نوازی ہے کہ وہ میرے احباب میں شامل ہونے کا ننگ گوارا فرماتے ہیں، لیکن میری عزت یہ ہے کہ مجھ کو اپنے نیازمندوں کے زمرہ میں شامل ہونے کی اجازت دیں، اب چند ہی ایسی صورتیں باقی رہ گئی ہیں جن کو دیکھ کر قدماء کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ خدا ان بزرگوں کا سایہ قایم رکھے"۔

بہرحال "چشمک" جو کچھ تھی ادبی حیثیت سے تھی، نجی تعلقات دونوں صاحبوں کے اتنے ہی خوشگوار تھے، جتنے باوصف اختلاف وکلائے مقدمہ کے اجلاس سے باہر ہوا کرتے ہیں، ان چند صفحوں میں خصائص نفسی کے مختلف رُخ ضمناً سامنے آگئے ہیں، ورنہ میری غائیت محض تنقیط ادب یعنی احباب کی دماغی تفریح کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس حیثیت سے اُردو لٹریچر میں غالباً یہ ایک نیا مضمون ہے"۔

(معارف)

حالی

(جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری پی۔ ایچ۔ ڈی)

شیکسپیر کی زندگی کو لحاظ شاعر اُس کے سوانح نگار تین چار حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے اوّل ہم اُس سے کارخانۂ قدرت میں ملتے ہیں۔ یہ زمانہ اُس کی شاعری کے آغاز کا ہے۔ اس کے بعد ہم اس کو دُنیا میں دیکھتے ہیں جہاں تخیل رازِ ہستی کے اسرار کھول رہا ہے۔ تیسرا زمانہ وُہ ہے جب شاعر غم آشنا ہو چکا ہے۔ اب اس نے حُسن و عشق کے افسانے یا تاریخ کی پُر شکوہ داستانیں لکھنا ترک کر دی ہیں۔ اور صرف حیات و جذبات انسانی کو اپنی بزمِ خیال میں جگہ دی ہے۔ آخری زمانے میں، وُہ غم کے بادل جو شاعر کے دل پر چھائے ہُوئے تھے ایک ایک کر کے ہٹ گئے ہیں۔ اور اُسے معلوم ہو گیا ہے کہ اس عالم پر ایک قانون مسلّط ہے اور اس

ایک ہی قانون عالمگیر کے ہیں سب اثر
بُوٹے گُل کا باغ سے تنکے چمن کا دُنیا سے سفر

مولانا حالی کی زندگی کے بھی اسی طرح تین مختلف دور ہیں۔

پہلا دور

بزمِ غالب میں ہماری مولانا سے پہلے پہل مُلاقات ہوتی ہے۔ یہ جوانی کا زمانہ ہے۔ اُستاد کے اور شاگرد بھی شریکِ صحبت ہیں۔ یہ وُہ وقت ہے کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہیں کیا جاتا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہیں ہوتی اُس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی تأمل ہوتا ہے۔ اس زمانے کا کچھ کلام دیوان میں غزلیات کی صورت میں موجود ہے مگر چونکہ صاحب کلام کی نگہ شروع ہی سے نکتہ بین اور اُستاد کی طرح طبیعت بند تقلید سے آزاد ہے۔ باوجود طرزِ قدیم کے اس شاعری اور ہمعصر شعراء کے کلام میں ایک خاص فرق ہے۔ محبت شاعری کے لئے ایک پاک جذبہ ہے۔ اور ہر شعر میں وُہ جذبہ پنہاں ہے۔ حُسن نیکی کا پھُول ہے اور گو وُہ اس زمین پر پیدا ہوا ہے لیکن [illegible] حُسن ازل کی جھلک موجود ہے۔

بعض نقادانِ سخن نے جو ہمارے ملک میں کلام کا معیار اشعار کے مقابلے کو سمجھتے ہیں۔ اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ باوجود مذکورۂ بالا خوبی رکھنے کے حالی کا قدیم کلام اس زمانے کے

مشہور شعرائے داغ اور امیر وغیرہ کے کلام کے مقابلے میں نہیں لایا جا سکتا۔ اور حقیقت میں یہ بیان صحت سے خالی نہیں۔ مگر اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ وہ کلام مولانا کی ابتدائی مشق ہے۔ اور شاعر گو پیغمبر ہوتا ہے اور ماں کے پیٹ سے ہی نبی پیدا ہوتا ہے مگر ملکۂ نبوت کو ترقی پذیر ہونے اور کمالیت حاصل کرنے کے لئے وقت کی ضرورت ہے۔

مگر بزم غالب ابھی جمنے بھی نہ پائی تھی کہ محفل برہم ہو گئی۔

در محفلے کہ یاران شرب مدام کردند
چوں نوبتے بما شد آتش بجام کردند

اور مولانا مایوس ہو کر یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے:۔

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی — بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا — ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

دوسرا دور

وہ یہ سمجھتے تھے کہ جو کام قلم سے لینا تھا وہ لیا جا چکا۔ مگر ہندوستان پر ایک انقلاب عظیم آ رہا تھا۔ جس میں انہیں ایک معتدبہ حصہ لینا تھا۔ مسلمان بادشاہوں کی عیاشی اور آرام طلبی اور قابل حقداروں کی آمد نے پہلے ہی سے اہل ہوش پر ثابت کر دیا تھا کہ اسلام ہندوستان میں ہو چکا مگر غدر تک عوام کی آنکھیں بند تھیں اور لوگ ذلت اور جہالت مگر اور فریب کی نقاب سے چہرے کو اس قدر لپیٹے ہوئے تھے کہ بُرا بھلا سمجھنے کی کوئی تمیز نہ رہی تھی۔ جب غدر نے ہاتھ پکڑ کر ایوان شاہی سے باہر لا کر طوفان میں کھڑا کر دیا۔ اُس وقت معلوم ہوا کہ ہم کس حالت پر پہنچ گئے۔ بھیڑوں کی طرح جن کا کوئی چوپان نہ ہو ایک دوسرے کا منہ دیکھتے تھے اور بے راہ اِدھر اُدھر پھرتے تھے۔ ایسے میں جب بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی سرسید مرحوم اُس شب ظلمت میں روشن ستارے کی طرح چمکے اور ترقی کا راستہ نمودار ہوا سپہ سالار کے حکم سے افواج اسلام اس شاہراہ پر پڑ لیں اور مولانا بحیثیت نقیب اُن کے ہمراہ ہوئے۔ مگر جو مہم سر کرنی تھی وہ کوئی قدیم الایام کی لڑائی نہ تھی جس میں اُن کو رجز خوانی سے ہمراہیوں کا دل بڑھانا ہوتا بلکہ وہ تنازع للبقا میں مسلمانوں کی آخری کوشش تھی جس کی نسبت کہہ دیا گیا تھا کہ اب کی شکست فتح ہے۔ اس میں لوگوں کو جوش دلا کر توپ اور تفنگ کے مقابلے میں نہ لے جانا تھا جو کہ ایک نہایت آسان کام ہے بلکہ موجودہ اور آئندہ نسلوں کو

اُس لڑائی کے لئے تیار کرنا اور اُبھارنا مقصود تھا جس میں قلم تلوار پر غالب ہے۔

مسدس مدوجزرِ اسلام۔ چند قومی نظمیں اور جدید غزلیات اس زمانے کے افکار کا نتیجہ ہیں۔ مسدس نئی شاعری کا بنیادی پتھر ہے اور اس میں سخنور نے ایک ایسا نمونہ شاعری کا پیش کیا ہے جس کی مثال اب تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اوّل عرب کی اُس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہورِ اسلام سے پہلے تھی۔ اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا۔ پھر کوکبِ اسلام کا طلوع ہونا اور نبی اُمّی کی تعلیم سے اُس ریگستان کا دفعتہً سرسبز اور شاداب ہو جانا اور ابرِ رحمت کا اُمت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی اور دُنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اُن کے تنزّل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لئے ایک آئینہ خانہ بنا دیا ہے جس میں آکر وُہ اپنے خط و خال دیکھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔ مدوجزرِ اسلام کے تاریخی واقعہ کو اس صحت اور خوبی کے ساتھ نظم کرنا مولانا حالی کا ہی حصّہ ہے۔ اُس کے مختلف حصّے ایسے باربط اور مرتب ہیں کہ تعجب معلوم ہوتا ہے۔ نظام لکھنے میں خیال کو ایک ہی واقعے پر جمائے رکھنا اور اُس واقعے کا ایک ایسی تاریخ سے اخذ کرنا جو نصف دُنیا اور ایک ہزار برس سے زیادہ عرصے سے متعلق ہے کوئی آسان امر نہیں۔

ہم سب ناقص انسان ہیں اور وُہ ایک فردِ کامل ہے جس کی نگاہ مشرق سے مغرب تک دیکھ سکتی ہے۔ وُہ تذکرۃ الاولین اور سیر المتاخرین دونوں سے واقف ہے۔ وہ صرف موجودہ پستی کا نقشہ ہی نہیں کھینچتا۔ بلکہ اُس کے نالوں میں استقبال کی تفسیر ہے۔ اُس کی تقریر میں رعد کی کڑک اور اُس کے کلام میں قانون کا اثر ہے۔ اُس کی ایک آواز نے راس کماری سے لے کر دامن ہمالیہ تک کے مسلمانوں کو بیدار کر دیا۔ پست اپنی پستی سے واقف ہو گئے۔ مغرور اپنے غرور پر نادم ہوئے اور جاہل اپنی جہالت سے شرمائے اُس نے مُردہ دلوں میں احساس کا شرارہ پیدا کر دیا۔ کلام کا اثر سے موازنہ کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا اثر ہو سکتا ہے۔ چونکہ اس کے کلام میں سچ اور درد تھا "درد پھیلا اور سچ چمکا" سرسید مرحوم جو زبان اردو کے مجدّد ہیں فرماتے ہیں کہ اگر خدا نے قیامت کے دن مجھ سے سوال کیا کہ کیا لایا ہے تو عرض کروں گا "حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں"

اس کے بعد ہم مولانا کے "مجموعۂ نظم حالی" پر غور کرتے ہیں۔ اس میں سے "برکھارت"، "نشاطِ امید" "حب وطن"، "مناظرۂ رحم و انصاف" "جوانمردی کے کام" وغیرہ نظمیں ہندوستان کی اُردو کی اکثر درسی کتابوں میں شامل ہیں اور بچے "سعدی پانی پتی" کے اس کلام کو اسی دلچسپی سے پڑھتے ہیں جیسے حکایاتِ گلستان کو مدرسۃ العلوم مسلمانان اور تعلیم مسلمانان وغیرہ قومی نظمیں ہیں اور "جشن جوبلی" اور "دربارِ قیصری" کو قصائدِ مدحیہ کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں ان تمام نظموں کی سب سے بڑی اور پہلی خوبی بیان اور زبان کی سادگی ہے اور چونکہ ان میں سادہ کہانیاں اور واقعات نظم ہیں۔ سادگی اُن کے لئے نہائیت موزون ہے۔ دُوسری خوبی اختصار کی ہے کم یا زائد از ضرورت باتیں بیان نہیں کی گئیں ترتیب کے لحاظ سے بھی کوئی عیب ان میں نہیں نکالا جا سکتا مگر نظم کی تکمیل کے لئے اس کے علاوہ بھی چند چیزوں کی ضرورت ہے۔ اوّل الفاظ کا انتخاب۔ دوم الفاظ کی تعداد۔ سوم الفاظ کی ترتیب الفاظ کا انتخاب عموماً نہایت موزون ہے۔ اِلّا چند حروف کے استعمال سے کہ جن پر بعض اہلِ دہلی اور عموماً نقادانِ لکھنؤ معترض ہیں اور واقعی جب تک خاص زبان اُردو میں کسی چیز کے لئے موزون لفظ موجود ہو دُوسری زبان سے مدد لینا نامناسب اور غیر ضروری ہے۔ مگر اتنا کہدینا کافی نہیں۔ اس استعمال کی ایک وجہ یہ ہے۔ جس طرح سرسید احمد خاں مرحوم نے زبان کی نشر سے دقیق، مشکل، مرصع اور دُور از فہم الفاظ کو خارج کر دیا ہے اور بہ تقاضائے وقت سلیس عبارت کو رواج دیا ہے ویسے ہی مولانا نے نظم کو موجودہ خیالات کے ساتھ مطابقت دینے کے لئے سادہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور گو طرز کو بدلنے میں دونوں کامیاب ہُوئے ہیں۔ مگر سرسید اس کام کو بے عیب پُورا کر گئے ہیں اور مولانا افراط و تفریط کی غلطی میں پڑ گئے ہیں۔ حقیقت میں یہ سوال وقت سے متعلق ہے اور وقت ہی اس کا فیصلہ کرے گا +

الفاظ کی تعداد کی نسبت بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کو اُن کے استعمال پر خوب قدرت حاصل ہے۔ اور اگر نقادانِ سخن کی رائے سے نامناسب ہندی اور تمام انگریزی الفاظ کو خارج بھی کر دیا جائے تو بھی مولانا اگر شیکسپیئر نہیں تو اُردو کے ملٹن تو ضرور ہیں۔ ترتیب الفاظ نہائیت موزون اور عیب سے پاک ہے۔

بیوہ کی مناجات البتہ ایک ایسی نظم ہے جس میں ہندی الفاظ استعمال ہونے پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

ایک نہائیت نازک خیال نقاد نے مولانا کے کلام پر اعتراض کیا ہے کہ وُہ اَن نیچرل یعنی

خلاف فطرت ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"اے شب ماہتاب تاروں بھری"

اور خود بقول مولانا "شعر کے نیچرل کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دُنیا میں ہوا کرتی ہیں" واقعی یہ اعتراض صحیح ہے۔ مگر ہماری رائے میں اوّل تو ایسی غلطیوں کی مثالیں بہت ہی کم دکھلائی جا سکتی ہیں۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ غور نہیں کیا اتفاقاً غلطی ہو گئی ہے۔ اور اگر اس سے رفع اعتراض نہ ہو تو یہ کہا جائے گا کہ مولانا نے نیچر کا مطالعہ "برگ درختان" سے نہیں کیا بلکہ "اوراق کتب" سے کیا ہے اور اسی لئے ایسی غلطی کر گئے ہیں۔ چنانچہ ملٹن بھی اپنے کلام میں چنڈول اور سُرخ چڑیا میں تمیز نہ کر سکا تھا۔ اُن کا کلام آمد نہیں بلکہ آورد ہے۔

اس کے بعد "شکوۂ ہند" اور اور چند نظمیں ہیں جو مختلف کانفرنسوں کے موقعوں پر پڑھی گئی ہیں۔ شکوۂ ہند کو مسدس سے دوسرے درجے پر مانا گیا ہے اور واقعی زوال اسلام کی تصویر جو اس میں کھینچی گئی ہے نہایت ہی عبرت خیز اور رُلانے والی ہے گویا شاعر نے اپنا دل ہمارے سامنے رکھ دیا ہے اور نظمیں بھی بحیثیت خود مکمل اور قابل تعریف ہیں۔

تیسرا دَور

۱۹۰۷ء میں مولانا کی زندگی کا دُوسرا دَور بھی ختم ہوا یعنی سرسید مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ اور وُہ کئی حیثیتوں سے دُنیا سے کنارہ کش ہو گئے مگر گو سرسید مر گئے تھے ان کا کام باقی تھا اور اُس کا بار امانت قوم پر عموماً اور اُن کے دوستوں پر خصوصاً تھا۔ اس لئے مولانا نے دُنیاوی خوشیوں کو گو ہمیشہ کے لئے رخصت کر دیا مگر اُس کام میں شریک رہے اور اب تک شریک ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک فارسی مرثیہ مرحوم کی وفات پر لکھا۔

یہاں پر ہم بحیثیت مرثیہ گو مولانا کے کلام کا موازنہ کریں گے۔ اور صرف دو مرثیوں پر غور کریں گے۔ پہلا غالب کا مرثیہ دوسرا سرسید کا۔ پہلا بزبان اُردو دوسرا بزبان فارسی۔ غالب کا مرثیہ تعلقات شخصی کے منقطع ہونے کی ایک درد انگیز تصویر ہے اور ٹینیسن کے اِن میموریم کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرسید کا مرثیہ قومی ماتم کا دردناک بیان ہے۔ جس میں نالہ و بکا کی آواز ہر شہر و دیار کو اُٹھائے ہوئے ہے اور وُہ قدیم یونان کی اُن تقریروں سے مشابہ ہے جو بڑے آدمیوں کے جنازوں پر تدفین سے پہلے کی جاتی تھیں۔ بلا مبالغہ

کہا جا سکتا ہے کہ ایسے مرثیوں کی مثال ہماری زبان میں نہیں ہے۔

اس کے بعد "تحفۃ الاخوان" اور "چپ کی داد" دو تظمیں خصوصاً قابل تذکرہ ہیں۔ گو یہ تقاضائے وقت بھلا سا جوش ان میں نہیں پایا جاتا اور نہ دیسی شاعری ان میں موجود ہے مگر ایک خاص حیثیت سے وہ بہت بڑھی ہوئی ہیں ان کو پڑھ کر انجیل کے وہ مقامات یاد آجاتے ہیں جہاں حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کے سامنے وعظ فرما رہے ہیں اور مجھے اس بات کے کہنے میں دریغ نہیں کہ شاعر اس زمانے میں پورا "پیغمبر" معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور لحاظ سے بھی اس زمانے کا کلام خصوصیت رکھتا ہے۔ یعنی مسلسل شعر اس وقت کے کلام میں بہت پائے جاتے ہیں۔ جو ظاہر کرتے ہیں کہ مولانا کو کلام پر کس قدر قدرت حاصل ہے +

مگر سب سے بڑی بات جو حالی میں موجود ہے اور کسی میں نہیں۔ یہ ہے کہ ان کا کام اور کلام ایک ہے۔ ان کا کلام ان کی زندگی کا مرقع ہے۔ الطاف حسین اور حالی۔ انسان اور شاعر ان میں علیحدہ علیحدہ نہیں۔ گویا وہ خود اپنے سوانح نگار ہیں۔ اس لئے جو ان سے واقف ہونا چاہے ان کا کلام پڑھے +

خوش کیونکر رہئے؟

(میاں بشیر احمد صاحب)

خوش رہنے کی تمنا سے اپنے جی کو بھر لو۔ تو۔ تم خوش رہو گے۔ ہر شے کو شش سے حاصل ہوتی ہے۔ خوش رہنے کی کوشش کرو تو تم خوش رہو گے! خوشی کی طرف محوش خوش جاؤ۔ تو تم دیکھو گے کہ وہ اک لاڈلے بچے کی طرح تمہاری طرف ہنستی ہوئی دوڑی چلی آئے گی۔ خوشی تمہاری جانب کیونکر آئے۔ جب تمہارا منہ پہلے سے باسی دال یا پھٹے ہوئے بٹوے کی طرح پژمردہ ہے۔ خوشی وہ دلبر ہے کہ اپنے عاشق پر سو جان سے نثار ہے لیکن کوئی عاشق ہو بھی۔ کوئی جی سے چاہے تو وہ آگے قدم بڑھائے۔ چہرے پر اسے دیکھ کر تبسم ہو۔ تو وہ تکلم کا دم بھرے ؛

صرف یہی ضرورت نہیں کہ تم تشویش سے بچے رہو۔ اس کی زیادہ ضرورت ہے کہ تم خوشی کی تلاش کرو۔ انسانی زندگی اک پہاڑ کی مانند ہے۔ سعی و ایمان صبر و انہماک تخیل و محبت وہ راہیں ہیں جو ہمیں اس کی چوٹی پر لے جاتی ہیں۔ وہاں خوشی کی دیوی کا مندر ہے۔ جس کا کلس آسمان سے جا ملتا ہے۔ تم گھاٹیوں سے بھٹک کر جنگلوں میں سرگرداں ہو۔ آؤ اور ان راہوں پر چلو۔ جن کی طرف فطرت تمہاری رہبری کرتی ہے!

ان میں سب سے سیدھی راہ **راہ ایمان** ہے۔ یقین کئے رہو کہ خدا موجود ہے وہ قوت جو ہم سے بالاتر ہے وہ ہستی جس کے اندر جس کے ساتھ اور جس کے لئے ہم زندہ ہیں اور وہ جو ہمارے اندر ہمارے ساتھ اور ہمارے لئے زندہ ہے جو ہماری طرف آتی ہے اور ہمیں بلاتی ہے کہ آؤ ہم تم ایک ہی ہیں۔ وہ جو کائنات میں ہے وہ جس میں کائنات ہے وہ جو نظارے میں خوبصورتی، ستارے میں عظمت اور انسان کے دل میں نیکی بن کر چھپی ہے اور وہ جو چھپ چھپ کر بھی ظاہر ہوئی جاتی ہے! غور کرو کہ وہ خدا جس کے بل پر پہاڑ قائم ہیں آبشار گرتے ہیں۔ سیارے گردش کرتے ہیں وہ تمہاری زندگی کو بھی کسی خیال کے مطابق چلا رہا ہے۔ وہ جو زمین کو لاکھوں سیاروں کی ٹکر سے روکے ہوئے ہے۔ تمہاری روح کو بھی کبھی فنا نہ ہونے دیگا۔ جس کے کروڑوں انتظامات جاری ہیں

اُس کے سلسلے میں تم بھی منسلک ہو۔ تمہاری زندگی کا وہ ہمیشہ کے لئے بیمہ کر چکا ہے تو تم کیوں ڈرو اور دنیا کے غم و تشویش کے آگے اپنا سر کیوں جھکاؤ؟ اس پر یقین رکھو۔ وہ جو کرتا ہے۔ ٹھیک کرتا ہے۔ اور خوب کرتا ہے۔ اس نے تمہیں اس دنیا میں چھوڑا ہے یہاں کی آفتیں تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔ تمہیں یہاں محدود کیا ہے۔ لیکن ان حدود میں تم آزاد ہو۔ نتیجے اس کے ہاتھ ہیں۔ لیکن ذریعے تمہارے ہیں۔ آخرش برائی میں بھی تمہارے لئے اچھائی اور تباہی میں بھی تمہاری فلاح و بہبود ہے۔ پھر فکر کاہے کا اور غم کیسا جب تک تم اپنا فرض انجام دیتے ہو دل و دماغ سے سوچتے سمجھتے ہو۔ ہاتھ پاؤں سے کام کرتے ہو۔ جب تک تمہاری نیت نیک ہے اور تم مصروف کار تب تک فکر کاہے کا اور غم کیسا؟ تم اپنا کام کئے جاؤ۔ خدا تمہارا انجام نیک کریگا۔ نماز پڑھو اور دعا مانگو۔ سچی نماز اور پُرخلوص دعا کے اثر کو وہی جانتے پہچانتے ہیں۔ جو صبحوں کے تڑکے اور راتوں کے سناٹے میں اپنے پروردگار کے آگے سر جھکاتے اور ہاتھ اٹھاتے ہیں کہ اے سب قوتوں سے بالاتر ہماری نقاہت کو طاقت کا راستہ دکھا اور ہمیں نیکی کی توفیق دے +

ہاں اور کبھی تم نے غور کیا ہے کہ دنیا کی کائنات میں کیا حقیقت ہے۔ آفتاب اس سے ساڑھے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے اور ہزاروں ستارے آفتاب سے اسی نسبت سے بڑے ہیں۔ کائنات کتنی طویل و عریض ہے۔ روشنی ... ۱۸۶ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ کی رفتار سے چلتی ہے اور سورج سے جو ہم سے نو کروڑ میل پر واقع ہے۔ صرف آٹھ نو منٹ میں ہم تک پہنچ جاتی ہے، لیکن صدہا تارے ہیں جن کی روشنی ابھی تک ہماری زمین پر نہیں پہنچی۔ تو مادی کائنات میں بھی کیا کچھ ہے جو ابھی ہمارے وہم و گمان میں نہیں۔ سوچو کہ دیگر اجسام سماوی کے مقابل میں زمین کی کیا حیثیت ہے۔ پھر اس زمین پر تم کس گنتی میں ہو۔ اگر تم انگلستان کے وزیر اعظم بھی بن جاؤ۔ تو دو چار برس کے بعد تمہارے اپنے بھائی بند تمہیں نہ پوچھیں اور قدرت تو اپنے اک ننھے سے زلزلے میں تمہیں دائمی نیند کا مزا چکھا دے۔ اس بے بضاعتی اور ہیچ میرزی پر غرور کیسا اور اپنی حالت پر فکر و تشویش کس لئے؟ جب تک دم میں دم ہے۔ خوش رہو۔ وہ جو الانتہا دنیاؤں کو سنبھالے ہوئے ہے وہی تمہاری خوشی کا ذمہ دار وہی تمہاری تکلیفوں کے دور کرنے والا ہے۔ اس عظیم الشان عالم میں اپنی ذرا ذرا سی مصیبتوں کو بڑا نہ سمجھو۔

جو تم سے بن آئے کرو اور باقی ماندہ کی فکر نہ کرو۔ کتنے ننھے کیڑوں کو تم روز پاؤں تلے کچل دیتے ہو۔ اگر تم کسی بڑی ہستی کے نیچے پس گئے تو کیا ہوا۔ تمہارے سر پر پہاڑ آپڑے اور چیخنے چلانے سے باز نہ رہ سکو۔ تب بھی جی میں جان لو کہ خدا کی یہی مرضی ہے۔ لیکن یہ دن گزر جائینگے اور جو اسے منظور ہے آخر وہی ہوگا اور اچھا ہی ہوگا۔ غم کرنا اسے بجا ہے۔ جو غافل ہے کاہل ہے یا جان بوجھ کر کام سے جی چراتا ہے۔ وہ بدنصیب کیوں کڑھے جو اپنی بہت سی کوشش کرے۔ مگر نتیجہ خاطر خواہ نہ ہو۔ نہ اسے اپنے خلاف شکایت کا حق ہے۔ نہ دوسرے کو اس کے خلاف گلہ ہو سکتا ہے۔ پھر وہ کس لئے اپنے جی کو ناحق دکھ دے پھر کوئی کیوں اس کی نیت پر حرف رکھے؟ غرض تمام رنج و محن تمام دکھ و رد میں اپنے پیش نظر رکھو۔ کہ دنیا کی تکلیفیں انسان کے گناہوں کی سزائیں ہیں اور اس کی ترقی کا ذریعہ اور ان کا خوشی سے برداشت کرنا خوشنودی پروردگار کا ذریعہ اور اپنے اطمینان و مسرت کا باعث ہے۔ یہ سمجھے رہو کہ جب تک دنیا میں رہنا ہے تب تک کچھ نہ کچھ دکھ بھی سہنا ہے کوئی مصیبت اتنی بڑی نہیں اس قابل نہیں کہ انسان اپنی قیمتی ہستی کو اس کی نذر کر دے۔ یہ کہتے رہو۔ کہ میری جان دکھ سہا کرے۔ میرا دل تو خوشی کے لئے بنا ہے! یہ کہو اور خوش رہو۔ کہ تم خدا کی وسیع دنیا میں زندہ ہو!

جہاں تک ہو سکے نیکی کرو۔ جہاں تک ممکن ہو برائی سے اجتناب کرو نیکی خوشی کا سرچشمہ اور برائی رنج و غم کا ٹھکانہ ہے۔ نیک دل کتنا بدنصیب بھی کیوں نہ ہو اس کا دل آخر خوشی کا آشیانہ بن کے رہتا ہے۔ خود غرض و نفس پرست کتنا خوش قسمت کیوں نہ ہو۔ آخر اس کا دماغ تشویش ناک خیالات کی آماجگاہ ہو جاتا ہے، یہ بات آج تک کسی فلسفی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ نیکی سے کیوں خوشی ہوتی ہے۔ صرف یہ نہیں کہ لوگوں کی تعریف نیک شخص کو خوش رکھتی ہے۔ ہزاروں نیکیاں ایسی ہیں، کہ دنیا نے کبھی ان کی داد نہ دی۔ پھر بھی ان کے کرنے والے اپنے دل میں جنت کی خوشیاں لئے ہوئے یہاں سے سدھارے۔ شاید بات یہ ہے کہ نیکی میں اس کا جلوہ ہے۔ جو یوں نگاہوں سے مستور رہتا ہے۔ تو جب ہم نیکی کرتے ہیں۔ جب نیکی سے ہمارا دل لبریز ہوتا ہے فی الحقیقت ہمارا دل خدا کا گھر بن جاتا ہے اور جس کے گھر میں اس گھر کے بنانے والا اس کے آراستہ پیراستہ کرنے والا آجائے وہ کیونکر خوش و خرم نہ ہو۔ وہ کس طرح زندگی کی

اونچ نیچ اور زمانے کے دکھ درد کو بھول نہ جائے ! ــــ کسی کا دل نہ دکھاؤ۔ کسی کا حق نہ مارو کسی سے نفرت نہ کرو۔ غرور کو سر سے نکالو، حسد کو جی میں جگہ نہ دو، ایسا نہ ہو کہ حرص کا کیڑا تمہارے جسم و جان کو لگ جائے، ایسا نہ ہو کہ خود غرضی نفع کی صورت دکھا کر الٹا تمہارا نقصان کرے، نفسانی خواہشات کو دبائے رکھو۔ غصے کو ہنس کر ٹال دو خوف سامنے آئے تو بے خوف ہو کر اس پر حملہ کرو۔ پھر ہر میدانِ جنگ میں فتح تمہارے ہی ہاتھ ہے +

علالت کے دنوں میں تکلیف کی ساعت میں مصیبت کے وقت صبر و حوصلہ سے کام لو اور دیکھو تکلیف برداشت کئے سے کتنی جلد رفع ہو جاتی ہے۔ جی سے کہو کہ آخر یہ کچھ ایسا خوف ناک درد نہیں، آخر یہ کچھ ایسی بھاری مصیبت نہیں، تم حیران ہو جاؤ گے کہ اس پر گویا درد ہی ہمدرد اور مصیبت ہی تمہاری مونس بن جائیگی، خدائے کارساز کا تو ازل سے ابد تک یہی کہنا ہے کہ مانگ کیا مانگتا ہے، مگر کوئی مانگے بھی کوئی ہاتھ پھیلائے تو ملے۔ کوئی نعرہ زن ہو تو جواب بھی پائے۔ جسمانی تکلیف کی تو خصوصیت ہے کہ کہا وہ کم ہو رہی ہے دور ہو رہی ہے اور واقعی کم ہونی شروع ہو گئی۔ اس کے بعد دل کی کیفیت کے بدل جانے کا کون قائل نہ ہوگا۔ جسے شب ہو کر کے دیکھے + صابر اور بے صبر شخص میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ وہ دکھی ہو تو بیوی تک کو زیادہ پتہ نہیں چلتا اور یہ ذرا بے آرام ہوں تو پڑوسی بھی نعوذ باللہ کہہ اٹھیں۔ جب تمہیں کوئی مشکل آپڑے، جب تم کسی درد میں مبتلا ہو تو اپنے سے کسی زیادہ حوصلہ مند کی صحبت تلاش کرو۔ اور جب تنہا ہو۔ تو ایسے لوگوں کو یاد کرو جنہوں نے مصیبت کی گھڑیوں میں دنیا میں شاندار کام کئے۔ خود فنا ہو گئے کہ دوسرے زندہ رہیں یا مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اور اسے پچھاڑا ایک جست میں کہیں کے کہیں نکل گئے۔ کہ ترقی بھی شاباش و مرحبا کہتی دوڑی۔ وہ آگ میں گرے، مس خام تھے کندن بن کر نکلے غربت سے امارت پائی۔ گمنامی سے نیک نامی حاصل کی کس طرح ؟ ان کے دل میں ہمت کی دولت اور کوشش کا خزانہ تھا۔ جس کام پر ہاتھ ڈالا ہو گیا جس بات سے واسطہ پڑا بخوبی نبھ گئی ایسے ہی حوصلہ مندوں نے دنیا کو جو کبھی درندوں کی بستی تھی۔ آج انسانوں کی جنت بنا دیا ہے !

یاد رکھو کوئی غم کوئی مصیبت کوئی تکلیف تباہ کر دینے والی نہیں۔ بُرے وقت میں ایسا خیال کرنا مشکل ضرور ہے لیکن یاد کرو کہ کتنی بار عمر میں تم وقت میں پڑے اور بعد میں تمہارا خوف جھوٹا ثابت ہوا۔ اک وقت تھا کہ گزر گیا حادثہ تھا واقعہ تھا کہ ہو گیا اور بس، وقت کسی شے کو چین سے نہیں رہنے دیتا۔ اگر خوشی آنی جانی ہے۔ تو غم بھی فانی ہے۔ زمانے کی چکی سب کو پیسے جاتی ہے اور سوائے حقیقتِ خداوندی کے بقا کسی کو نہیں۔ غم نے تم کو تنگ کیا تو غم کی بھی خیر نہیں۔ تمہاری زندگی کے سمندر میں یہ ذرا ذرا سی موجیں ہیں ان سے ڈرنا نہ چاہئے آتی ہیں چھو چھو کے چلی جاتی ہیں

آڑے وقتوں میں اپنے دل کو سمجھاؤ کہ اس کرب واندوہ سے پہلے مجھے کتنی نعمتیں حاصل تھیں اب بھی کتنی اور مسرتیں میری باندی بنی بیٹھی ہیں یہ ملال وغم کب تک رہیگا "زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن"، مذہبی لوگ کہتے ہیں خدایا تیرا شکر کہ تو نے ہمیں دیکھنے کو آنکھیں سننے کو کان چکھنے کو زبان اور کام کاج کو ہاتھ پاؤں دیے۔ متمدن دہریے اور تعلیم یافتہ عقل مند اس پر مسکراتے ہیں۔ کہ لوگ کیسی عام چیزوں کا ذکر کرتے ہیں، کارلائل کہتا ہے کہ یہی ہمارا بڑا نقص ہے کہ ہم قدرت کی عام چیزوں کو معمولی سمجھنے لگتے ہیں۔ کوئی بات ہمیں تعجب میں نہیں ڈالتی۔ پینے کے لئے صاف، و شفاف تازہ پانی سانس لینے کو ہلکی پھلکی تازہ ہوا، دیکھنے کو سبزہ زار پھولوں کی جھاڑیاں درختوں کے جھنڈ یہ کیسی کیسی دل آویز چیزیں ہیں مشکل یہ ہے کہ یہ بغیر کسی مشکل کے آسانی سے بافراط ہمیں ملتی ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ ہم جب تک توجہ نہ کریں ان کی پوری طرح قدر نہیں کر سکتے ورنہ سچ پوچھو تو زندگی کی ایک ایک بظاہر معمولی سی چیز فی الحقیقت ہزاروں غیر معمولی عجائبات سے زیادہ پر لطف وسود مند ہے لیکن انسان کی حیوانی عجوبہ پسند فطرت اُسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتی،

گزشتہ کی یاد اور آیندہ کی فکر سینکڑوں کو پریشان حال رکھتی ہے اور حاصل دونو سے بجز "حسرتِ حاصل" کچھ بھی نہیں، تم زندہ ہو اور زندگی سے لطف اٹھانا چاہتے ہو تو حال میں زندہ رہو گزشتہ کو یاد نہ کرو اور آیندہ کے لئے مطلق تشویش نہ کرو، بہت لوگ پرانے پیارے وقتوں کو ہی یاد کیا کرتے ہیں "آہ کیا اچھے تھے وہ دن کتنی بے فکری تھی کس قدر آرام تھا۔ لوگوں کے مزاج اچھے تھے معیشت کی فکر نہ تھی زندگی کا نام خوشی تھا" اور یونہی زمانہ حال کے آرام ہیچ نظر آتے ہیں۔ اور اچھائی میں بھی برائی کا پہلو دکھائی دیتا ہے، اکثروں کو آج شام کل صبح یا اگلی بہار کا فکر لاحق رہتا ہے" ہائے کیا ہونے والا ہے فلاں شخص مجھے کیا کہے گا۔ فلاں کام خدا معلوم ہوگا کہ نہیں عزت کا معاملہ ہے کیا جانے دنیا میں میں کتنا رسوا ہو جاؤنگا۔ یہ کام جو میں کر رہا ہوں اس کا اچھا انجام

ہوتا نظر نہیں آتا" اور اسی طرح حال کے اطمینان میں بے اطمینانی کے طوفان برپا ہوتے رہتے ہیں اور بڑی سے بڑی خوشی سے لطف اندوز ہونے کی مہلت نہیں ملتی + کمزور اعصاب والے اور کم حوصلہ شخص تو خاص طور پر اس مرض کا شکار بنے رہتے ہیں ان کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اخراجاتِ فاسدہ کی مانند اٹھتے رہتے ہیں لیکن آج کل عام طور پر بھی دنیا فکرِ مستقبل میں گرفتار نظر آتی ہے۔ جس کا بڑا سبب مصنوعات ولذات پرستی اور اعلیٰ معیارِ زندگی ہے + آنے والے زمانے سے اچھی امیدیں وابستہ رکھو۔ سمجھو کہ خدا تمہارا کام اچھا کریگا۔ تمہاری محنت پھل لائیگی، دو دن خزاں ہے تو بہار کے دن بھی آیا ہی چاہتے ہیں۔ جس وقت جو کام کرو۔ اس وقت میں اور اُس کام میں ہمہ تن منہمک رہو۔ تم تمہارا کام تمہارا وقت یہ تینوں زندگی کے لیئے بس ہیں گزرے ہوئے کل کے جھگڑے آنے والے کل کے مخمصے تم ان سے فی الحال بے تعلق ہو۔ جو ہوا۔ سو ہو گیا۔ اب زندگی پر اس کی حکومت کیوں رہے؟ اور جو ہوگا زندگی خود اس پر کیوں حکومت نہ کرے۔ جو شخص محقق حال میں مصروف ہے۔ اس کی تمام قوتیں اس کی معاون بنی رہتی ہیں جو گزشتہ اور آیندہ کے جال میں پھنسا ہے۔ اس کی بہت سی طاقتیں قید سے رہائی پانے میں مصروف ہیں۔ اس کی توجہ تمام تر موجودہ کام کاج کی طرف مبذول نہیں ہوسکتی۔ اگر کل کا بھوت تمہارے دماغ پر سوار رہے گا تو آج تمہارا دل تمہارے کام سے اچاٹ رہے گا۔ کل کی فکر کل کی مشکل کو حل نہیں کرتی بلکہ آج کے کام کو ناتمام چھوڑ کر وہ کل کے کاموں اور فکروں میں اضافہ کر دیتی ہے اور یونہی یہ بارِ گراں بڑھتا جاتا ہے اور انسان ناہنجار کے دل و دماغ فضول کاموں اور غیر ضروری فکروں کے شکنجے میں دبتے چلے جاتے ہیں۔ وہ جو صرف حال میں منہمک ہے اگر مفلس بھی ہے تو اسے صحیح مصروفیت کی دولت نصیب ہے۔ وہ جو گزرے ہوئے اور آنے والے میں مبتلا ہے اگر مالدار بھی ہے تو تشویش و فکر کے قزاق اس کا مال متاع اڑائے لیئے جاتے ہیں۔ اس کی ملکیت میں اضافہ ہوتا ہے اس کی جائداد میں کمی کہ دنیا میں سب سے بڑی جائداد دل کا اطمینان ہے یا زندگی کی خوشی!

دنیا کی ہر چیز میں منہمک ہونا زندگی کی ہر بات سے لطف اٹھانا اور خوش رہنا سیکھو۔ صبح سویرے تم اٹھو تو سوتے رہنے اور سو چکنے کے خیال سے لطف حاصل کرو۔ بستر میں پڑے ہوئے بھی اس پڑے رہنے میں خوش رہو۔ منہ دھو و مسواک کرو کپڑے بدلو تو دیکھو کہ جسم ان باتوں سے کتنا خوش ہے ٹہلنے جاؤ تو اعضا کی چستی تم کو اک نئی مسرت کا پتہ دے گی۔ بھوک لگنے پر

کھانا کھاؤ تو ایک ایک لقمے سے حظ لو۔ نوالے کو چباؤ دیکھو معمولی یا روغنی روٹی یا دال یہ جو تمہارے نصیب میں ہے ان سب میں کیسا خوش کن ذائقہ چھپا ہوا ہے جو تم پر ظاہر ہو رہا ہے غسل میں مالش میں کھانے پینے میں چلنے پھرنے میں کرسی پر بیٹھنے میں چارپائی پر لیٹنے میں کتاب پڑھنے میں خط لکھنے میں کسی عزیز سے باتیں کرنے میں کوئی عمدہ تقریر سننے میں ان سب باتوں میں کتنی خوشیاں ہیں جن سے اک سمجھ دار شخص صبح سے شام تک لطف حاصل کر سکتا ہے زندگی کی عام مسرتوں سے اپنے جی کے خزانے کو بھر لو اور آڑے وقت پر اس سے مدد لیتے رہو۔ اگر تم اس پر عمل کرو گے تو تمہاری زندگی روز بروز خوشی تر و خوش نصیب ہوتی جائیگی۔ کسی شے سے لطف حاصل کر سکنے کا راز صرف یہ ہے کہ اس وقت میں کسی اور شے کا خیال بھی تمہارے ذہن میں نہ ہو۔ کھانا کھاتے ہو تو دنیا کی اور سبھی چیزیں بھول جاؤ کھانا کھانے میں اس قدر منہمک ہو جاؤ کھانے کو اس درجہ خوش ذائقہ اور اک ایسی نعمت سمجھ بیٹھو کہ اس وقت اس کے مقابل میں لاکھوں روپے کے خیال سے بھی تمہارے منہ میں پانی نہ بھر آئے۔ کسی دوست سے باتیں کرتے وقت ظلم ہے کہ تمہارا دل کسی اور فکر میں پھنسا ہوا ہو۔ اک نظارہ دیکھتے وقت مقام شرم ہے کہ تم کسی عالی شان مکان یا گھر کے بکھیڑوں کی سوچ میں غرق ہو۔ کسی شے کی حقیقت ہمیں تبھی سمجھ میں آتی ہے کسی شے سے تبھی پوری خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جب ہم اس میں ہمہ تن منہمک ہو جائیں۔ جب ہم اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے تئیں اس کے سپرد کر دیں گے تو وہ بھی اپنی تمام کیفیتوں کے ساتھ صرف ہماری ہو جائیگی۔ ہر شے یہاں تک کہ روٹی کے اک نوالے میں بھی اتنی خود داری ہے۔ کہ جب تک ہم اس کی طرف توجہ نہ کریں گے وہ بھی ہماری طرف توجہ نہ کریگا۔ ہم اسے نگل جائیں گے تو وہ بھی یونہی نگلا جائیگا۔ ہمیں اس کی پرواہ نہیں تو اسے ہماری کیا پروا؟

کام کرو لیکن کام کے بعد آرام بھی اک ضروری کام ہے جس کے بغیر کوئی کام اچھی طرح سرانجام نہیں ہو سکتا۔ یورپ والوں کی ترقی کا اک بڑا سبب ان کی تفریحات ہیں سات سات آٹھ آٹھ گھنٹے کام کرنے کے بعد وہ فوراً اپنے کلبوں، باغوں، سیر گاہوں یا تانگ گھروں میں چلے جاتے ہیں۔ کوئی موٹر گاڑی میں سیر کو نکلا۔ کوئی ریل میں سوار ہو کر پاس کی ندی کے قریب جا اترا کوئی متحرک تصاویر دیکھنے کو گیا۔ کوئی ٹینس کھیلنے کوئی دوستوں سے ملنے کوئی بازار کی سیر کرنے ہی چل نکلا۔ دماغ جو دن بھر کے کام سے تھک چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں تازہ دم

ہوگیا، دل جو روزانہ فرائض سے اکتا گیا تھا۔ پھر بشاش ہوگیا یعنی کولھو کا بیل ذرا سے دلاسے پر پھر کولھو کا بیل بننے کو تیار ہوگیا۔ اور پہلے سے بھی زیادہ مستعدی دکھانے لگا۔ یہ درست ہے کہ یورپ کی بعض تفریحات عیش و عشرت کے بدترین نمونے ہیں لیکن سبھی لوگ ان میں منہمک نہیں اور اگر ان کی چند عام رسومات ہمارے نزدیک نفسانیت اور لغویت کا درجہ رکھتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اچھی باتوں کے ساتھ ہم ان کی بُری باتیں بھی ضرور سیکھیں خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدَرْ (اچھی شے لے لے بری کو چھوڑ دے) ہماری غم پسندی اور توہم پسندی۔ ہماری صحت کی خرابی اور ہمارے دماغ کی نقاہت کا ایک ذریعہ یقینی طور پر یہی ہے کہ ہم دن بھر کے کام کے بعد زندگی کے فکر و محن کے ساتھ کوئی شغل نہیں رکھتے۔ کسی غیر نقصان دہ تفریح میں حصہ نہیں لیتے۔ ہمارے دلوں میں اک نہایت لغو خیال پیدا ہوگیا ہے کہ شغل اک چوچلا ہے تفریح تضیع اوقات ہے۔ جس کا نتیجہ ہے کہ ہم یا عمر بھر گدھے کی طرح تین بنے رہتے ہیں۔ یا روز و شب سور کی طرح ناچتے پھرتے ہیں۔ یا ہم میں افراط ہے یا تفریط۔ موسیقی ہمارے ہاں بھانڈوں کا شغل سمجھا جاتا ہے۔ ناٹک ہمارے ہاں اوباشوں کا مشغلہ خیال کیا جاتا ہے عورتوں سے زیادہ باتیں کرنا مردوں کے لئے خلافِ شان ہے۔ بال بچوں پر رعب لازم ہے بڑوں کے سامنے بولنا بے ادبی ہے زور سے قہقہہ مارنا مجلسی قانون کا توڑنا ہے پھر ہم کریں تو کیا کریں ہنسیں کیسے مسکرائیں کیونکر دل کس طرح بہلے؟ جی کیونکر زندگی سے اُچاٹ نہ ہو جائے؟ موجودہ مہذب آدمی کا جُوا کھیلنا شراب پینا ناچ کرنا اس کی عورتوں سے دل لگی مذہب سے بیزاری زر پرستی جاہ طلبی بے شک انتہا درجہ انسانیت سوز اور شیطنت آموز ہیں۔ لیکن خدا کی دنیا کو دن رات دھوکے کی ٹٹی کہتے رہنا اکثر قبرستانوں کی زیارت کرتے رہنا بات بات پر آہیں بھرنا ذرا سے غم پر آنسو بہرلانا اپنے آپ کو سب سے بڑا بدنصیب سمجھنا کیا یہ خدا پرستی ہے؟ کیا جنت میں جانے کی یہی راہ ہے؟ کیا یہ اپنے پروردگار سے بغاوت نہیں؟ کیا یہ اس کی دی ہوئی چیزوں کو رد کرنا اور اس کے فرمودہ حکموں کی خلاف ورزی نہیں؟ یقیناً اس سے بڑھ کر کوئی جہالت نہیں بلاشبہ اس سے زیادہ کوئی حماقت نہیں!

اپنے بال بچوں میں کھیل کھیلو اپنے دوستوں سے ہنسی خوشی باتیں کرو کوئی اچھی متحرک تصویر دیکھو، کوئی علم آموز ناٹک دیکھو کبھی کبھی تاش یا شطرنج یا پچیسی کھیلو باجہ یا ستار یا مرلی بجاؤ اور کوئی پیارا سا گیت گاؤ دوستوں کے ساتھ سیر کو نکلو کسی خوش طبع سے لطیفے سنو، کبھی مداری کے ہتھکنڈے دیکھو کبھی [illegible]

کے ملفوظات ملاحظہ کرو۔ کبھی کبھی اپنی متانت کو اپنے رتبے کو اپنے رعب کو بھول جاؤ۔ دنیا کو اپنے ساتھ شکنجے میں نہ دبائے رکھو۔ کبھی کبھی کھلکھلا کر ہنس پڑو اور دیکھو کہ دل کا پھول کیسے مہکتا ہے؟

تفریح تکمیل کار ہے شغل کے بغیر دنیا اک قید خانہ ہے۔ کارلائل شیکسپیئر کو اک ولی سے بھی برتر سمجھتا تھا محض اس لیئے کہ اس کے نزدیک شیکسپیئر میں ولی کی عقل مندی کے علاوہ انسانی ظرافت بھی تھی۔ تفریح ہمیں دنیا کے بہت سے فکر و تشویش بھلا دیتی ہے وہ زندگی کی کل میں تیل دیتی ہے جس سے کل پھر چلنے اور کام کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

اپنی طبیعت میں **باتوں کو بھول جانے کی صلاحیت پیدا کرو** کہ اس سے دل پر سے بہت سا بوجھ ہلکا ہو جائیگا۔ اور تم زیادہ خوش رہو گے۔ کلام اللیل یمحوہ النھار (رات گئی بات گئی) اگر انسان بھی گزرے ہوئے سے اس طرح بغل گیر نہ ہو تو ہوتی ہوئی باتیں اسے اس طرح پریشان نہ کریں کل کی شکر رنجی بہتوں کے آج کو ترش رو کر دیتی ہے جس سے دل کی گھنڈی کھلنے نہیں پاتی۔ آنے والی مصیبتوں سے ڈرتے رہنا گئی گزری تکلیفوں کو یاد کرتے رہنا انسان کو خوش و خرم نہیں ہونے دیتا۔ کل تم کسی سے چیں بجبیں تھے پرسوں تمہارے سر میں درد تھا اتنوں اک بھونچال آیا تھا ان سب چیزوں کا ذکر کر کے اپنے آپ کو اور دنیا بھر کو زندگی سے بیزار نہ کرتے رہو، مانا کہ دس برس تم نے صعوبتیں اٹھائیں تمہارا ایک پیارا سا بچہ بھی جاں بحق ہوا۔ ممکن ہے آیندہ سال تمہاری پونجی کم ہو جائے تمہارا کوئی دشمن تم پر فتح پائے۔ لیکن اس گردش افکار سے حاصل؟ اس چکی پیسنے سے مطلب؟ صرف بے سود تفکر بے فائدہ تردد! جو ہونا تھا سو ہوا۔ جو ہو گیا سو ہو چکا جو ہو گا ہو جائیگا۔ تو دیکھا جائیگا۔ برائے خدا اپنے آج کو گزرے ہوئے اور آنے والے کل کی کلفتوں سے بچاؤ۔ وہ زندہ ہے اور یہ یا مردہ ہیں یا ناپید۔ تو زندگی کو زندہ درگور نہ کرو۔ کہ نیم مردہ ہستی مردوں سے بدرجہا زیادہ بدنصیب ہوتی ہے۔ باتوں کو بھلا دو، واقعات کو فراموش کر دو۔ بھلانا کچھ اتنا مشکل بھی نہیں ذرا کر دیکھو!

کبھی کبھی اپنے مقررہ کام کو چھوڑ کر کوئی اور کام کرو اور اگر یہ نہ ہو سکے تو ایک ہی کام کے مختلف اجزا کو باری باری کیا کرو۔ **کام کی تبدیلی** کام کی کلفت کو ہلکا کر دیتی ہے اور دماغ کو تازگی بخشتی ہے گویا دماغ کے مختلف خانے ہیں کبھی کسی کو بند کر دو۔ کبھی کسی کو کھول دو حواس سے سب کی طاقتیں برقرار رہیں گی۔ طالب علم ریاضی کو چھوڑ کر جغرافیہ پڑھنے لگے نثر کو چھوڑ

کرنظم کا مطالعہ کرے۔ تھیٹر کا ایکٹر اک پھوڑ کر بازاروں میں گھومے اور دکان دار نقلی چھوڑ کرناٹک جادیکھے۔ جج گھوڑے کی سواری کرے اور ضلع دار کسی مشاعرے میں جا بیٹھے کہ مان لاہور جاکر انارکلی اور ٹھنڈی سڑک کی سیر کرے اور بنیا شالامار باغ کے پرے باغبانپورہ کے کھیتوں میں گاجر مولی کھائے۔ مصنف کبھی کبھی مسخروں کی محفل میں وقت ضائع کرے اور بھانڈ گوئے کسی ریش دار مولانا کا وعظ سنیں۔ آٹھوں پہر ہنستے رہنا بھی مسرت کا باعث نہیں۔ ہر رات تماشہ دیکھتے رہنا کچھ لطف آور نہیں۔ کسی شے کی زیادتی اچھی نہیں۔ یہاں تک کہ ہر وقت خوشیوں کا مجنوں بنے رہنا بھی فی الحقیقت خوشی کا باعث نہیں ہوتا۔ اول بدل کر کام کرو پھر دیکھو گے کہ تم کتنے مختلف کاموں کے قابل ہو۔ انسان عموماً اپنے مقررہ کام کو چھوڑ کر دوسرا کام نہیں کرسکتا۔ نہ اس کی فرصت ملتی ہے نہ موقع۔ موجودہ دنیا کے تقسیم کار اور ذاتوں کے نظام نے عام طور پر جدا جدا کام لوگوں کے سپرد کردیے ہیں اس کے فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کام کے بعد تفریح اسی لئے ضروری ہے کہ یہ تبدیلی دل و دماغ کے لئے مفرح ثابت ہوتی ہے۔ تم جب کبھی زندگی سے اکتا جاؤ تو کوشش کرو کہ زیادہ یا تھوڑے عرصے کے لئے اپنی طرز زندگی کو بالکل بدل دو تم دیکھو گے کہ اس سے دنیا کا اک قطعی نیا منظر تمہارے سامنے جلوہ پیرا ہو جائیگا اور زندگی تمہارے لئے زیادہ دلچسپ ہو جائیگی۔ بلاشبہ ہر شخص اپنے حالات کے مطابق اس پر عمل کرسکتا ہے باقاعدگی اور تنظیم انسان کے لئے ازبس ضروری اور سود مند ہیں لیکن کبھی کبھی زندگی کی شاہراہ سے الگ ہوکر آس پاس کی پگ ڈنڈیوں پر سیر کے لئے نکل جانا مراحل حیات کے طے کرنے کے لئے لابدی ہے۔

قدرت کی خوبصورتیوں اور نوع انسان کی صنعتوں سے حظ اٹھانا سیکھو!

قدرتی مناظر کا حسن کس قدر مسرت خیز ہے! کسی سرسبز و شاداب پہاڑ کی گھاٹیوں میں سبزۂ آویزاں کے درمیان جابجا ننھے ننھے جھرنے ہیں کہیں عمودی چٹانوں میں ایک بڑے آبشار کے شفاف پانیوں کا زور شور دنیا بھر کے جھگڑوں جھمیلوں کو غرق آب کر رہا ہے کہیں برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر آفتاب کی آخری کرنوں کا زریں سہرا ہے سونا پگھل رہا ہے یا اک آگ سی لگی ہے جس سے دل کو پناہ نہیں ملتی کہیں دامن کوہ کے مرغزاروں میں پہاڑی چڑیوں کے چہچہوں نے قیامت برپا کر رکھی ہے۔ کہیں کے ناچ گھروں کے راگ رنگ ان کے سامنے سرنگوں ہوں۔ کشمیر کی وادیوں میں دائیں بائیں پہاڑیوں کے سلسلے کے بیچوں بیچ اک بندی

رنگ رنگ کے سنگ ریزوں سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی چلی جاتی ہے بید مجنوں کے درخت کناروں پر اپنی شاخوں کے ساتھ جھکے پڑتے ہیں اور اُن کی ننھی ننھی پتیاں مور و ملخ کی کشتیاں بن کر ندی کے ساتھ ساتھ بہے جاتی ہیں آس پاس کے پہاڑوں کی عظمت ندی کے پانی کی روانی اس کی میٹھی میٹھی شورش اودی اودی بدلیوں کی پھوار، جنگلی پھول پتوں کی مہک طیورِ رنگین ادا کی چہک ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است ۔۔۔ ہمین است و ہمین است و ہمین است

کراچی کے ساحل پر بحیرۂ عرب کی موجوں کے تھپیڑے رود بار انگلستان میں طوفانی سمندر کی فلک پیمائیاں سوئٹستان میں جھیلوں کے کنارے انگور کی کھیتیاں برفانی دریاؤں کی براق صفت پاکیزگی کوہستانی نظاروں کی گوناگونی اور بوقلمونی! بدقسمت ہیں وہ جن کو ان رنگینیوں کی خوشیاں جن کو ان حسن آفرینیوں کی جنت نمائیاں دیکھنی نصیب نہیں، مگر یاد رہے کہ قدرت صرف امیروں کے طبقے کے لئے مخصوص نہیں ایک زبردست مصنف نے کہا ہے کہ تم دنیا بھر میں خوبصورتی کا تماشا کرنے کو گردش کرتے رہو، لیکن جب تک تم خوبصورتی کو اپنے ہمراہ دل میں نہ لے جاؤ گے کسی شے کو خوبصورت نہ پاؤ گے۔ ایک اور جگہ پر وہ لکھتا ہے کہ خوبصورتی کہاں نہیں ہے۔ حسن ہر سمت جلوہ گر ہے بکھرا پڑا ہے کوئی دیکھنے والا ہو تو نظر آئے کوئی گلچیں ہو۔ تو یہ گل ملے، کسی دیہاتی خطۂ ملک میں کسی معمولی گاؤں کے قرب و جوار میں دیکھئے۔ تو بے نظیر نظارے پیش نظر ہوتے ہیں۔ صبح گیہوں یا دھان کے کھیتوں میں سورج کا نکلنا رات کو ذوق میدانوں میں چاند کا کھیت کرنا دوپہر کو دیہاتی چراگاہوں کا منظر اندھیری رات کو ننھے تاروں کی جھلملاہٹ یہ چنت نگاہ کس کے نصیب میں نہیں لیکن کوئی چشم مسرت بھی وا کرے کوئی ربِ دو جہاں کی ان نعمتوں کے لئے ہاتھ بھی تو پھیلائے! کسی کا قول ہے کہ اگر ستارے دس ہزار برس میں صرف ایک رات نکلتے تو لوگ صدیوں تک ان کی متبرک یاد میں خدا کا شکریہ ادا کرتے اور کبھی نہ بھولتے اس ہوش ربا حسین منظر کو جس نے ان کی روحوں میں اک شیریں سی لرزش پیدا کر دی۔ اب حقیقت یہ ہے کہ یہ حسین شمعیں ہر رات ہمارے سر پر جگمگ جگمگ کرتی ہیں اور ہم ہفتے میں ایک بار بھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے، پھر کہو کون زیادہ بے نیاز ہے خدا یا انسان۔ خدا اپنے خوش نما بدیے ہر وقت ہر جگہ لئے کھڑا ہے لیکن انسان شکریہ تو کجا التفات بھی نہیں کرتا۔ خوش نصیب ہیں وہ انسان جو مناظر قدرت سے خوشہ چینی کرتے ہیں اور قدرت کی

شادمانیوں میں اس کی بے ساختہ خوشی کے حصہ دار ہیں! ملک ملک کی سیر کو نکلو باغ باغ میں گلگشت کرو میدانوں میں دوڑو پہاڑوں پر چڑھ جاؤ۔ نور کے تڑکے بیدار ہو کر طلوع آفتاب کا منظر دیکھو رات کے سناٹے میں اٹھ کر ضیا پاشی مہتاب کی ٹھنڈک کا لطف اٹھاؤ۔ سبزے کی بہار دیکھو پرندوں کا گانا سنو ہوا کے جھونکوں میں جھومو رنگین پھولوں کو چومو اور کہو کہ کتنی پیاری ہے یہ زندگی!

پھر دیکھو خدا نے انسان کو بنایا اور انسان نے بھی اس کی قدرت کو سجایا! بے آب و گیاہ صحرا میں ریل چلائی بے پایاں سمندر میں جہاز تیرائے۔ شہر بسائے ان میں فراخ سڑکیں پر رونق جن نفیس روشنیاں بنائیں۔ کیڑوں سے ریشمی کپڑا دھاتوں سے سونے چاندی کے زیور درختوں سے چوب کاریاں مٹی روڑوں سے پکی عمارتیں پھولوں سے عطر سمندر سے موتی پہاڑوں سے ہیرے اور معمولی چیزوں سے دخانی اور برقی قوت حاصل کی، نقاشوں نے کیسی کیسی تصویریں بنائی ہیں کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے وانس کی "امید" "گرز کا ٹوٹا ہوا برتن" "یا دودھ بیچنے والی" "دانتی کا خواب" "کھوئی ہوئی فریب کاریاں" پوپین کی تصویر جہاں وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہے ژان دارک کا سراپا جہاں وہ آگ کے شعلوں میں جل رہی ہے اگر تم متمدن انسان ہو تو ان کو دیکھ کر اپنی زندگی کی دلچسپی کو بڑھاؤ اور اپنے دل و دماغ کی دنیا کو وسعت دو۔ کبھی کبھی موسیقی کی دل نوازیوں سے محظوظ ہوتے رہو۔ کہ انسان کی صنعتوں میں صحیح موسیقی سے بڑھ کر کوئی شے حقیقت آشنا نہیں۔ انسان ساز بجانے یا گیت گانے میں محو ہو جاتا ہے اور بے غرض محویت زندگی کی سب سے بڑی اور سب سے پاکیزہ خوشی ہے۔ اپنے بچوں کو گانا سکھاؤ اور خود ساز بجاؤ۔ تیسرے چوتھے اپنے دوستوں کے ساتھ گانے بجانے کی اک پاکیزہ محفل قائم کرو۔ موسیقی کے ذریعے سے اخلاق کی تربیت بطریق احسن ہو سکتی ہے۔ ارسطو نے موسیقی کو اپنے نظام تعلیم میں خاص جگہ دی ہے۔ اور لکھا ہے کہ موسیقی روحانی ترقی کا ایک عمدہ ذریعہ ہے جس کا صحیح استعمال نوجوانوں کے لئے ازبس سودمند ہے۔

کتابوں کی دنیا میں اس کے لئے جو چاہے کتنی خوشیاں منتظر ہیں۔ مذہبی اور روحانی کتابوں کا تو کہنا ہی کیا کہ ان کی ہدایات زندگی کے لئے مشعل راہ ہیں۔ اور بھی بیشمار تصنیفات ہیں جو انسان کو انسان بنا دینے میں کرامات سے کم درجہ نہیں رکھتیں۔ سنسکرت میں رامائن و مہابھارت عربی میں مقامات حریری دیوان متنبی الف لیلہ۔ ہندی میں تلسی داس و کبیر کی نظمیں۔ بنگالی میں ٹیگور کی گیتان جلی۔ فارسی میں حافظ و سعدی عمر خیام و فردوسی عرفی و نظیری کی غزلیات فرانسیسی میں

وکٹر ہیوگو اور ڈیوما کے ناول جرمن میں گوئٹے کا فاؤسٹ روسی میں ٹالسٹائے کی تصنیفیں۔ اطالوی میں دانتی کی "جہنم" انگریزی میں شیکسپیئر کے ڈرامے بائرن کی چائلڈ ہیرلڈ کارلائل کی "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" ایمرسن کی خلوت وجلوت، اور ہماری کم سن اردو کے دامن میں آزاد کی نیرنگِ خیال حالی کی مسدس غالب کی غزلیات اقبال کی نظمیں انیس کے مرثیے شبلی کی الفاروق حسن نظامی کی سی پارۂ دل مشتاق نمونہ از خروارے ہیں۔ تاریخ کی معجز بیانیاں طبیعیات کی جدت طرازیاں فلسفے کی بھول بھلیاں ریاضی کی اندازہ دانیاں جغرافیہ کی سمت نمائیاں کتنی خوشیوں کا سامان اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ اس حیرت آباد عالم میں کوئی مسرور شغولیت سے فرصت چاہے تو کہاں؟

دنیا کی حسین ونفیس چیزوں کو بلحاظِ فن دیکھو کہ قدرتی ومصنوعی خوبصورتی کے مشاہدے میں اک خاص خوشی پنہاں ہے جو دلِ مضمحل کو قوت بخشتی اور ہمت سکھاتی ہے۔

سرکھپانا نہ چاہو تو نظروں نظروں میں جان نوازی کر لو۔ جاؤ اور جمنا کے کنارے تاج محل کا حسن لال قلعے کی شان جامع مسجد کی پاکیزگی اور قطب مینار کی عظمت کا نظارہ کرو۔ راوی کے کنارے جہانگیر و نورجہاں کی خواب گاہیں اور ذرا دُور شالامار کی چمن آرائی سے بہرہ اندوز ہو۔ آوارہ گردی میں مشاق ہو تو سمندر پار جاکر کارو باری لندن میں سینٹ پال کا گرجا لنکن کی لات اور انگلستان کی پارلیمنٹ عشرت گاہ پیرس میں لُودور کا تصویر خانہ نپولین کا مزار اور ستارے کا چوک یا مصروف نیویارک میں تمدنِ حاضر کی گہما گہمی اور ترقی علوم کے کرشمے دیکھو۔ عجائب پرستی کا جنون ہو تو بیسیوں رایں ہیں مختلف ملکوں کے نمک اکٹھے کرو۔ پرانی تہذیبوں کے سکے جمع کرو۔ کوئی چڑیا رکھو۔ کوئی ہرن پالو۔ اور کچھ نہیں تو اڑتے پرندوں کے پرسمیٹو۔ کوہستانی پتیوں سے اپنی بیاض کو پیراستہ کرو۔ مفید نسخے لکھ رکھو کہ کسی کے کام آئیں کسی کا اچھا قول کسی کا عمدہ شعر قلمبند کر لو کہ کبھی کسی دل کی تفریح کا سامان مہیا ہو۔ غرض سینکڑوں اور تفریحات ہیں جو انسان کے لئے فراہم ہو سکتی ہیں۔ ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق فطرت کے چمن سے گل چینی کر سکتا ہے۔ ہاں یہ خیال رہے کہ ہر قسم کے تفریح وشغل میں اعتدال سے کام لینا چاہیئے۔ افراط پسندی نے بیسیوں مفید مشاغل کو تضیع اوقات کا موجب اور زندگی کو احمقوں کا ناٹک بنا رکھا ہے۔

محبت کائنات کی روح ہے زندگی کی سبھی مشکلیں اک محبت وایثار سے حل ہوتی ہیں اگر تم دنیا کے عام جھگڑوں جھمیلوں سے بالا بالا خوشیوں کے آغوش میں عمر بسر کرنا چاہتے ہو۔ تو

محبت کے قدم پکڑ لو۔ محبت کو اپنے دل و دماغ میں بس جانے دو۔ ہر کہ دمہ کے لئے ہر برے اچھے کے لئے سچی محبت پیدا کرو۔ پھر دیکھو کہ تمہاری دنیا اور تمہاری زندگی اپنی تمام دقتوں کے ساتھ کیونکر تمہارے لئے راست ہو جاتی ہے!

اپنے دوستوں عزیزوں اور دیگر اشخاص سے ہمدردی کرنے کی عادت ڈالو۔ باہمی ہمدردی سے زندگی کی بیسیوں تکلیفیں دور ہوتی ہیں۔ ہمدردی سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے اگر تم اوروں کا دکھ میں ہاتھ بٹاؤ گے اوروں کو صبر و ہمت کی راہ دکھاؤ گے تو آڑے وقت میں مدد نہ سہی۔ اوروں کی خواہش اور دعا تمہارے حق میں ہوگی۔ دکھی لوگوں کی دلجوئی کرو۔ لیکن غم پسندوں سے حتی المقدور گریز کرو۔ اور ہمیشہ خوش مزاج اور خوش دل لوگوں کی صحبت تلاش کرو + ہر انسان پر کم و بیش صحبت کا اثر ہوتا ہے۔ اگر ہر روز تمہارے کان میں یہی آواز آتی رہے گی۔ کہ دنیا فانی ہے خوشیاں ہیچ ہیں انسان پر مصیبتیں نازل ہوتی ہیں روح جسم میں زبردستی مقید ہے تو کچھ شبہ نہیں کہ تمہارا دل یاس پسند ہو جائیگا اور اگر تم اکثر یہ سنتے رہو گے کہ جب تک جیو خوش رہو۔ مرنے سے پہلے نہ مرو۔ ہمت کرو۔ تکلیفیں آتی ہی ہیں لیکن خدا کی نعمتیں بھی بیحد و بے شمار ہیں آج دکھ ہے تو کل سکھ ملیگا۔ دنیا میں خوشیوں کی کمی نہیں تو تم دیکھو گے کہ تمہاری آنکھیں دکھ میں بھی سکھ کی جھلک دیکھنے لگیں گی اور تمہارا دل رنج و محن کو جلد بھول سکنے کی قابلیت پیدا کرے گا + خوش طبعی اور ظرافت وہ اوصاف ہیں جو انسان کو حیوان پر برتری بخشتے ہیں + خوش طبع انسان اپنے اور دوسروں کے لئے اک فرشتۂ رحمت ہے جس کی موجودگی سے دنیا رہنے کے لایق اور زندگی جینے کے قابل ہو جاتی ہے + دل کے سورج سے ظرافت کی کرنیں پیدا کرو تاکہ تمہاری اور تمہارے عزیزوں کی اندھیری دنیا میں اجالا ہو جائے اور ہر شخص تمہاری صحبت کا خواہشمند اور تمہاری گفتگو کا دلدادہ ہو جائے + مزے کی بات یہ ہے کہ ظریف شخص کو بات بات میں ظرافت کا پہلو نظر آنے لگتا ہے کوئی متین و سنجیدہ بات ہے تو اسے اسی پر ہنسی آرہی ہے کہ کوئی خواہ مخواہ متانت کے گلے کا ہار ہو۔ کہیں لاٹ صاحب کی گاڑی آپہنچی۔ تو اس کے جی میں گدگدی پیدا ہوئی کہ ذرا حماقت ملاحظہ ہو۔ دو شخص بے فائدہ جھگڑنے لگے اور یہ لطف لے رہے ہیں کہ ان کی عقل پر خوب پردہ پڑ گیا۔ ظرافت کی عادت ڈالو۔ اور دن رات کا کچھ حصہ طعنے سے بچ کر ہنسی مخول کی نذر کر دو +

اپنی زندگی کا کوئی نصب العین بناؤ۔ ارادہ کرو کہ تم کوئی نہ کوئی مفید کام کرو گے

ارادہ کرو کہ تم آج ہی سے اپنے خیالات میں اک تبدیلی اپنے اعمال میں اک انقلاب پیدا کرنا شروع کردوگے۔ اپنے روزانہ تقسیم اوقات کے علاوہ مستقبل پر نظر رکھو کہ آنے والے زمانے میں تمہیں اس دنیا میں کچھ کام کرنے ہیں کسی نوجوان کو ترقی کے میدان میں بڑھانا ہے کسی غم زدہ عزیز کے لئے کوئی شغل پیدا کرنا ہے۔ خود کوئی عزت کوئی مرتبہ حاصل کرنا ہے۔ بعض لوگوں کو روحانی تعلیم دینی بعض کی اخلاقی اصلاح کرنی ہے روز بروز اپنے آپ کو جسمانی و روحانی دماغی و عقلی حیثیت سے بہتر بنانا تمہارا منتہائے نظر ہو۔ دیکھو کہ تمہاری صحت کی ترقی کیونکر ہوسکتی ہے۔ دماغ کی ترقی کیونکر ہوسکتی ہے۔ دل کا اطمینان کیونکر بڑھ سکتا ہے۔ روح کی مسرت میں کیسے اضافہ ہوسکتا ہے روز بروز وہ کام کئے جاؤ جو تمہیں کارزار حیات میں ہمیشہ آگے کو بڑھائے جائیں، تمہارا قدم آگے کو پڑے پیچھے نہ ہٹے۔ اپنے محلے میں ایک کتب خانہ اپنے گاؤں میں اک شفاخانہ اپنے شہر میں کسی قسم کی ادبی یا معاشرتی یا سیاسی انجمن قائم کرو۔ جس سے نوع انسان کے جسمانی اور عقلی ارتقا اور لوگوں کی مسرتوں میں اضافہ ہو۔ اک انجمن زندہ دلاں بناؤ جس کے رکن اپنے اور دوسروں کے غم غلط کرنے کا بیڑا اٹھائیں جس کا اثر گھروں کی چاردیواری میں محسوس ہو۔ جس کے باعث روزمرہ کے قضیے زیادہ آسانی سے طے ہونے لگیں کسی اچھے اخبار یا رسالے کی اشاعت کسی اچھی رسم کی ترویج کسی اچھے آدمی کی حوصلہ افزائی کرو کسی مظلوم کو بچاؤ۔ انسان کو جانوروں پر ستم نہ ڈھانے دو۔ مارپیٹ کی عادت کے خلاف ہدایت کرو پھر دیکھو تمہارے دل میں کیسی خوشیوں کی ہوائیں چلتی ہیں۔ کیونکر اطمینان کی ننھی ننھی بوندیں پڑتی ہیں! تمہارا ضمیر تمہارے دل سے صلح کرے گا۔ تمہارے باہر اور اندر تسلی کی حکومت کا دور دورہ ہو جائیگا +

"خوش کیونکر رہیے"؟

زندگی خوشی کے لئے ہے خوش رہنے کی کوشش کرو اور تم خوش رہوگے۔ خوش رہنے پر اصرار کرو خوشی کو بلاؤ اور جب وہ آئے اسے اپنے دل میں جگہ دو۔ خوشی اک نعمت خداوندی ہے لیکن وہ اک انسانی صنعت بھی ہے وہ خود بھی آتی ہے اور بلائی بھی جاسکتی ہے۔ وہ خدا کے ہاتھوں ملتی ہے لیکن لی جاتی ہے انسانی ہاتھوں سے خوشی کے لئے بعض اوقات سعی لازم ہے لیکن بعض وقت اپنے تئیں چھوڑ دو۔ اور قدرت کو

اپنے نفس میں اپنا کام کرنے دو خود رو کے پھول کبھی خود تیار کئے جاتے ہیں کبھی آپ سے آپ ان کی بارش ہوتی ہے۔ اگر تم خود خوشی کو حاصل نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ تو کرو کہ خوشی کو اپنے پاس آنے سے نہ روکو۔ رستہ کھلا چھوڑ دو کہ وہ موقع پاکر کبھی نہ کبھی خود ہی تم تک آپہنچیگی۔ اپنے غموں کو نیکیوں کی مدد سے دور کرو۔ اپنی تکلیفوں کو صبر و ہمت سے کم کرو دنیا کے بکھیڑوں کو اپنی عقل و سعی سے سلجھاؤ۔ زندگی کے جھمیلوں کو قسم قسم کی تفریحوں سے منتشر کر دو۔ اور اگر تم اپنے دکھ درد کو کم نہیں کر سکتے تو کم سے کم یہی ہو کہ ان کے بہت سے شغلوں اور بہت سی خوشیوں کو اپنے جی میں گھلا ملا دو کہ مرکب میٹھا نہ سہی کھٹ مٹھا سا ہو جائے۔ دنیا جنت نہ سہی جہنم بھی نہ رہے زندگی شہد نہیں لیکن زہر بھی تو نہ ہو۔

جب تم فکرمند ہو۔ جب کوئی مصیبت آدھمکے تو سمجھو کہ جس طرح پہلی مصیبتیں گزر گئیں یہ بھی گزر جائیگی، جیسی دنیا میں پہلے بہار تھی اب بھی آرہے گی ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

آج سے اس خوشنما خیال سے اپنے دل کو معمور کر لو کہ میں خوش رہونگا، میں کسی کا برا نہ چاہونگا۔ جہاں تک ہو سکے میں ہر ایک کا بھلا کرونگا۔ جہاں تک ہو سکے میں ہر شے اور ہر شخص کی سیرت کا اچھا پہلو دیکھوں گا۔ جو کچھ کہوں گا خوشی سے جو کچھ سنوں گا خوشی سے اور جو کچھ کروں گا خوشی سے اور اچھی طرح! گزرے زمانے کو یاد نہ کروں گا آیندہ کا فکر نہ کروں گا۔ حال میں منہمک رہوں گا۔ اور خدا کا شکر کروں گا۔ اپنی زندگی کو خوش سمجھوں گا اور خوش بنانے کی پوری کوشش کروں گا۔ اور جب کبھی میری زندگی میں بے معنی فکر و تشویش کا دور دورہ ہوگا میں فوراً اپنے آپ کو کسی مفید کام میں مشغول کر لوں گا۔ اور خوش رہوں گا۔ خواہ وہ کام ذرا سا ہی کیوں نہ ہو۔ خواہ وہ یہی ہو کہ اپنے بھائیوں سے کہا کروں کہ بھئی خوش رہو۔ اور سب کو خوش رکھو اور اک مضمون لکھ دوں کہ خوش کیونکر رہیے؟

(ہمایوں)

اخلاقیاتِ اجتماعیہ

(جناب مولینا ابوالاعلیٰ مودودی)

زندہ رہنے کا حق۔ حقوق انسانی کی فہرست میں سب سے پہلا حق زندہ رہنے کا ہے، جو بنی نوع انسان کے ہر فرد کو بلا امتیاز حاصل ہے۔ اگر حق زندگی کو تمام حقوق سے زیادہ اہم نہ قرار دیا جاتا یا اس کے احترام میں اتنی سختی نہ برتی جاتی تو شخصی زندگی ہر وقت معرض خطر میں رہتی اور رات دن اس کی قربانیوں کے واقعات پیش آتے رہتے، اگرچہ جماعت کی تکمیل کے لئے بعض اوقات افراد کی قربانی حق بجانب ہوتی ہے۔ کیونکہ جس نفس کی تکمیل مقصود ہے وہ اجتماعی ہے، اور اگر کسی صورت میں اس کی تکمیل انفرادی قربانی پر منحصر ہو جائے تو وہ کیجا سکتی ہے، مگر یہ ایک استثنائی صورت ہے، اور انسانی جان کی حرمت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ عمومی حیثیت سے شخصی زندگی کا بقاء و تحفظ انسانیت کے لوازم میں سے ہے اور تمام انسانی حقوق کی فہرست میں اس کا سب سے زیادہ بلند اور اہم درجہ تسلیم کرنا انسانیت کا پہلا فرض ہے، مگر باوجودیکہ قانون اخلاق اس حق کے احترام میں انتہائی سختی برتتا ہے۔ عام طور پر انسانی جان کی کوئی وقعت نہیں کی جاتی، ایک شخص اپنی خواہشات کے حصول میں اگر کسی کو سدراہ پاتا ہے تو اسے بے دریغ قتل کر دیتا ہے، ایک جماعت اگر اپنی بزرگی کو تسلیم کرانے یا اپنے فوائد کو قدرتی حدود سے آگے بڑھانے کے لئے ضروری سمجھتی ہے تو ہزاروں لاکھوں انسانی جانوں کا خون کر دیتی ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کو ادنیٰ منافع کی خاطر قہر کی نظروں سے دیکھتی اور اس کا خون پینے کے لئے تیار رہتی ہے اور آجکل کی نام نہاد متمدن اقوام میں بھی یہ درندگی موجود ہے، لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ایسی حالت خواہ متمدن قوموں میں ہو یا وحشی اقوام میں، اسے محض وحشت کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے، کیونکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے ایسی قومیں کے اخلاقی قوا پوری طرح نشوونما پائے ہوئے نہیں ہوتے اور وہ تمدن کے نام سے نیم وحشیانہ زندگی بسر کر رہی ہوتی ہیں۔ بدقسمتی سے موجودہ زمانہ میں ایسی ہی جماعتوں کی کثرت ہے

اور بوجہ کثرت، حکومت و فرمانروائی کی باگیں بھی انہی ہاتھوں میں ہیں اور ہر طرف سے آوازیں آرہی ہیں کہ "صلح چاہتے ہو تو جنگ کرو" "امن چاہتے ہو تو تلوار اٹھاؤ" اور "زندگی چاہتے ہو تو لڑنے مرنے کے لئے ہر وقت تیار رہو"

اس حق کے ساتھ ہی یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ہر قوم کے شہریوں کا حق حیات اس وقت تک پوری طرح محفوظ و مامون نہیں ہو سکتا جبتک اسکے حصول معاش کے ذرائع بھی محفوظ و مامون نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر حق زندگی کے لئے استقلال محنت مستلزم ہے، اس مسئلہ پر روئی بلینک وغیرہ اشتراکی علماء نے بہت زور دیا ہے لیکن اس کا فیصلہ کہ اس قسم کے حقوق کو کس حد تک اور کن وسائل سے محفوظ کیا جاسکتا ہے ان کے یا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس کا جواب سیاسیات و اقتصادیات کے علماء بھی نہیں دے سکتے۔ درحقیقت اس کا انحصار نوع انسان کے عملی فہم و احساس پر ہے۔

تمام اور حقوق کی طرح حق زندگی بھی اپنے ساتھ ایک فرض رکھتا ہے، اور یہ اپنی اور غیروں کی زندگی کا احترام ہے جو شخص اپنی زندگی کا احترام نہیں کرتا اور خودکشی کرتا ہے، وہ اخلاقاً سخت گنہگار ہے اور جو شخص دوسرے کے حق زندگی میں دست اندازی کرتا ہے وہ اپنے حق حیات کو زائل کرتا ہے وہ اس کا مستحق ہے کہ اسے بھی اسی طرح زندہ رہنے۔ کے حق سے محروم کیا جائے احترام نفس قائم کرنے کے لئے یہ بات ضروری ہے، اس میں رحم و درگذر کو دخل دینا عین بے رحمی ہے۔

حق آزادی۔ حق زندگی کے بعد دوسرا درجہ حق آزادی کا ہے۔ چونکہ ہر شخص کو جماعتی زندگی میں اپنا نصب العین تلاش کرنے اور اس کے حصول کی سعی کرنے کے لئے آزادی کی ضرورت ہے، اس کے بغیر وہ اپنی استعداد کے مطابق تکمیل نفس کی امکانی سعی نہیں کر سکتا، اس لئے آزادی یا حریت فکر و عمل ہر شخص کا حق ہے، حق زندگی کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے اس کے بغیر حق زندگی ایک قالب بے روح کی حیثیت رکھتا ہے اور اخلاق اس کو لوازم حیات انسانی میں سب سے اہم درجہ دیتا ہے، کوئی شخص نہ کسی شرط پر اس حق کو بیچنے کا مجاز ہے اور نہ کسی کو اس کے خریدنے کا حق۔

یہی حق اجتماعی حیثیت بھی رکھتا ہے جس طرح ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ نظام جماعت کے اندر اپنے نصب العین کے حصول کے لئے تمام ممکن ذرائع کو استعمال کرنے میں آزاد ہو اور کوئی قوت اس کو روکنے والی نہ ہو۔ علم الاخلاق انفرادی آزادی سے زیادہ اجتماعی آزادی کا احترام کرتا ہے، کیونکہ اجتماعی آزادی خود انفرادی آزادی کی اصل ہے اور اگر وہ مفقود ہو تو افراد کی آزادی بھی بے معنے ہو جاتی ہے۔

مگر آزادی کبھی بے تعلقی اور عدم ارتباط کے معنی میں نہیں بولی جاتی۔ اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ہر فرد جماعت کے نظام سے اور ہر جماعت بین الاقوامی نظام سے اپنے آپکو قطعاً آزاد سمجھے اور دنیا کے تمدن نظام کو جو علائق و روابط پر مبنی ہے۔ منتشر کرنے کی کوشش کرے۔ اگر آزادی کے یہی معنی ہوں تو سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔ اسی لئے علم الاخلاق ہر آزادی خواہ کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ خالص مطلق العنانی کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے ورنہ وہ اپنے اصلی حق کو بھی کھو دیگا۔ وہ حق آزادی کے معنی یہ قرار دیتا ہے کہ ہر شخص نظام جماعت کو قائم رکھتے ہوئے بغیر دوسروں کی آزادی میں خلل ڈالے ہوئے جہاں تک ممکن ہو اپنے شخصی اعمال اور اپنی زندگی کے اختیاری معاملات میں آزاد رہے اور اس سے فائدہ اٹھائے۔ اسی طرح اجتماعی آزادی کو بھی وہ دوسری جماعتوں کی آزادی اور بین الجماعتی تعلقات کی حرمت سے مشروط قرار دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انفرادی آزادی کے لئے جماعتی نظام کی پابندی شرط ہے اور اجتماعی آزادی کے لئے بین الاقوامی حقوق کی حرمت لازم یہ وہ فرض ہے جو حق آزادی کے ساتھ ہر فرد اور ہر جماعت پر عائد ہوتا ہے۔

حق ملکیت۔ ان حقوق کے بعد حق ملکیت کا درجہ ہے۔ اس کو آزادی کا قریب قریب ایک جز سمجھنا چاہیئے۔ ہر مقصد کے لئے اسباب و وسائل ہوتے ہیں جن کے بغیر اس کا حصول ناممکن ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کو ان وسائل کا حق استعمال حاصل نہ ہو تو طلب مقصد کے لئے اس کی آزادی بے معنی ہے۔ وسائل کی مقدار غیر محدود ہے۔ اس لئے اس سوال کا حل کرنا بہت مشکل ہے کہ ان کے استعمال کو جماعت پر کیونکر تقسیم کیا جائے؟ اگر یہ وسائل صرف چند افراد کے لئے مخصوص کر دئے

جائیں تو باقی افراد کا حق مارا جاتا ہے اور اگر سب پر مساوی تقسیم کئے جائیں تو علاوہ ناممکن ہونے کے یہ قانونِ فطرت کے خلاف ہے اور مساوات کسی حال میں قائم نہیں رہ سکتی۔ مگر ہم اس دلچسپ اور مشکل مسئلہ پر ان صفحات میں کوئی بحث نہیں کر سکتے کیونکہ اس کا تعلق سیاسیات اقتصادیہ سے ہے۔ یہاں صرف حق ملکیت کی اہمیت ہی پر زور دیا جا سکتا ہے، اس حیثیت سے کہ وہ ارتقائے حیات میں معین ہے۔

اس کے حق کے ساتھ جو فرض عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کو عاقلانہ طور پر فلاح جماعت کے لئے استعمال کیا جائے ہر چیز جماعت کی ملک ہے اور اس کو جماعت ہی کے فوائد کے لئے ہونا چاہیئے۔ انسان تعلیم و تمدن میں جتنی ترقی کرتا جاتا ہے اتنی ہی اس کے اندر اس حق کو استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی جاتی ہے، مگر پھر بھی وہ اپنے فرض کو محسوس کرنے میں ایک بڑی حد تک کوتاہی کر رہا ہے خالص اخلاقی نقطۂ نظر سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی شخص سوائے ان چیزوں کے جو اس کے وجود کے لئے لازمی ہیں، اور کسی چیز کا حق نہیں رکھتا۔ جیسا کہ ایک جرمن عالم اخلاقیات کہتا ہے۔ کہ میں "اسکے سوا اور کسی چیز کا مالک نہیں ہوں"۔ قریب قریب یہی خیال فلاطون نے بھی ظاہر کیا ہے وہ کہتا ہے کہ "ایک اعلیٰ نظام اجتماعی میں ہر چیز مشترک ہونی چاہیئے، شخصی ملکیت کوئی شئے نہیں ہے"۔ مگر عملی سیاست میں اس اصول کا نبھنا بہت مشکل ہے اس لئے ہمیں اس دائرہ کو محدود کرنا پڑیگا اور صفائی کے ساتھ یہ حد بندی کرنی پڑیگی کہ ہر شخص اپنی ملکیت میں تصرف کا مختار رہے، مگر اس کا فرض ہے کہ اپنی جائز و مناسب ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے بعد اس کے بقیہ فوائد کو جماعت پر خرچ کرے۔ ارسطو نے اس بارہ میں یہی مذہب اختیار کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ:-

"اعلیٰ نظام حکومت میں ہر شخص کو اپنی ملکیت میں تصرف کا پورا پورا حق حاصل ہے، لیکن اس حق کے ساتھ جماعت کی طرف سے اس پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے اور اس پر وہ اخلاقاً مجبور بھی ہے، کہ اس میں سے صرف بقدر ضرورت خرچ کرے اور جو کچھ باقی رہے اسے جماعت کی صلاح و فلاح کے کاموں میں لگائے"۔

اگرچہ ایسی ملکیتوں میں جیسے زراعت ہے، یہ اصول بھی پیچیدہ ہوجاتا ہے مگر ایک بڑی حد تک قابل عمل ہے۔

حق معاہدہ۔ اسی سلسلہ میں ایک اور حق، حق معاہدہ ہے۔ تمکو یہ حق حاصل ہے کہ کسی شخص سے چند شرطوں پر اس کی خدمت کرنے کا معاہدہ کرلو اور اسی طرح اس کو یہ حق حاصل ہے کہ تم سے اس معاہدہ کو پورا کرنیکا مطالبہ کرے عہد وحشت میں جبکہ معاہدہ کا کچھ زیادہ دستور نہ تھا، یہ حق کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا، مگر جوں جوں انسان تمدن کی طرف بڑھتا جاتا ہے، اس میں معاہدہ کی عادت بڑھتی جاتی ہے اور معاملات کا سارا انحصار معاہدہ پر ہوگیا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ "جماعتیں طبعی حالت سے معاہدہ کی طرف جارہی ہیں"۔ یہ خیال اب اس قدر عام ہوگیا ہے کہ ایک گروہ اس کا قائل ہے کہ "تمام انسانی تعلقات معاہدہ پر قائم ہیں اور حکومت کی بنیاد دراصل ایک اجتماعی معاہدہ ہے"۔ روسیو اور ہابس نے اس عقیدہ کی پُرزور حمایت کی ہے۔

مگر حق معاہدہ کے لئے یہ ضروری شرط ہے کہ ہمیشہ معاہدات ایسے ہوں جو جائز طور پر پورے کئے جاسکتے ہوں۔ مثلاً کوئی شخص ایسا معاہدہ نہیں کرسکتا جس کی رو سے وہ اپنے آپ کو کسی کی غلامی میں دیتا ہو، اور نہ وہ ایسے معاہدہ کے ایفا پر مجبور ہے۔ کیونکہ غلامی جو بنائے معاہدہ ہے اخلاقاً ناجائز ہے۔

حق تعلیم۔ حقوق کی فہرست میں آخری مگر اہم درجہ تعلیم کا ہے۔ اس میں حقوق اور فرائض دونوں اس طرح جمع ہوگئے ہیں کہ تفریق مشکل ہے۔ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق اپنے تئیں تعلیم دینے کا حق بھی رکھتا ہے۔ اور یہ اس کا فرض بھی ہے۔ یہ ایک ایسا حق ہے جس کو ادا کرنا ہر شخص کا انسانی فرض ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ دُنیا نے اس حق کو حاصل کرنے کی ابتک وہ کوشش نہیں کی جو کرنی چاہیئے، اور متمدن ملکوں میں بھی عامۃ الناس اعلیٰ تعلیم تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے۔ ایک بہترین نظام حکومت کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اسکے ماتحت ہر شخص اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو ترقی دینے کے بہترین وسائل پر قادر ہو اور ایک متنفس بھی ایسا باقی نہ رہے جو اعلیٰ تعلیم سے محروم ہو، کیونکہ تکمیل نفس کے لئے

یہ سب سے زیادہ لازمی چیز ہے ۔

اب ہم اخلاقی فرائض سے بحث کرینگے :۔

اخلاقی فرائض ۔ دُنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کے مذہبی لٹریچر میں اخلاقی فرائض کے متعلق اوامر و نواہی نہ ملتے ہوں لیکن اخلاقیات میں اور ان میں فرق یہ ہے کہ وہ احکام قطعیہ پر مشتمل ہوتے ہیں اور یہ صرف لفظ "چاہیئے" یا "نہ چاہیئے" پر قناعت کرتا ہے ۔ وجہ ظاہر ہے کہ مذہب ایک تحکمی شان رکھتا ہے ۔ اور اخلاق محض تعلیمی ۔ "چاہیئے" کا لفظ تعلیمی شان کے لئے بہت موزونیت رکھتا ہے ۔

شاید اوپر ہم کہیں بتا چکے ہیں کہ بعض ایسے متعین حقوق موجود ہیں ۔ جو اگرچہ ترمیم پذیر ہیں مگر آہستہ آہستہ تقریر پذیر ہوتے جاتے ہیں ۔ یہ متعین حقوق اپنے ساتھ متعین فرائض بھی لاتے ہیں جن کی صورت بالکل احکام کی سی ہوتی ہے ۔ یہ فرائض صرف معروف و مسلم حقوق ہی کے ساتھ نہیں ، بلکہ انسانی زندگی کے تمام شعائر اور اجتماعی تعلقات کی ہر صورت سے ان کا تعلق ہوتا ہے ۔ اگرچہ ہر فرض کے ساتھ ایک حق ہوتا ہے ۔ اور عموماً فرائض کی اصلیت حق ہی ہے ، مگر انسان فطرتاً ہر اُس چیز کو اہمیت دینے کا عادی ہے جو فرض کے نام سے پکاری جائے ، کیونکہ فرض میں حکمیت ہوتی ہے ۔ اس لئے اخلاقی قوانین سے مراد اخلاقی فرائض و احکام ہی ہوتے ہیں جن کے ساتھ حقوق ایک لازمی شئے ہیں ۔ مثال کے طور پر بعض احکام پیش کئے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ اخلاقی نقطۂ نظر سے ان احکام کی حیثیت بھی بیان کیجاتی ہے ۔

احترام حیات ۔ اس سلسلہ میں پہلا فرض احترام حیات ہے جو بالکل حق حیات کے برابر ہے ۔ اس کا منشا صرف یہی نہیں کہ دوسروں کی جان کا احترام کیا جائے بلکہ خود اپنی حیات کا احترام بھی واجب ہے ۔ اور ایسے تمام افعال سے بچنا ضروری ہے ۔ جو اپنی یا دوسروں کی زندگی کو نقصان پہنچانے والے ہوں ۔

احترام آزادی ۔ دوسرا فرض احترام آزادی کا ہے جسے حق آزادی کے مقابل سمجھنا چاہیئے ۔ یہ فرض ہمکو دوسروں کی آزادی سلب کرنے اور انکی آزادانہ ترقی میں دخل دینے سے روکتا ہے ۔ البتہ ایسے حالات میں وہ افراد کی حریت عمل سے

تعرض کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ جبکہ وہ حریت خود انہی کی بقا کے لئے مضر ہو یا دوسرے ابنائے جماعت کے حقوق میں صریح مداخلت کرتی ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص خودکشی کرتا ہو تو تم اسے جبراً روک سکتے ہو کیونکہ اگرچہ وہ اپنے فعل کا مختار ہے مگر وہ اپنے اس اختیار کو ایک اہم اخلاقی فرض کی خلاف ورزی میں استعمال کر رہا ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کے ہاں چوری کر رہا ہو تو تمہیں اجازت ہے کہ اسے اس حرکت سے روکو کیونکہ وہ اپنے حدود سے تجاوز کر کے دوسروں کے حق میں صریح مداخلت کر رہا ہے۔ مگر ان استثنائی صورتوں سے اصل فرض پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

احترام سیرت۔ تیسرا فرض احترام سیرت کا ہے۔ اس میں اور مندرجہ بالا دونوں احکام میں یہ فرق ہے کہ یہ ایجابی حکم ہے اور وہ سلبی حکم تھے۔ یہ حکم ہمکو صرف ان چیزوں سے باز رہنے ہی کی ہدایت نہیں کرتا جو ہمارے ہمسایہ کے لئے باعث تکلیف ہیں، بلکہ وہ اس امر کی بھی ہدایت کرتا ہے کہ تا بمقدور ہم ہر شخص کی اعانت کریں اور اسے جو مدد بھی پہنچا سکتے ہیں اس میں دریغ نہ کریں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ "اخلاقی فرائض اجباری نہیں بلکہ احساسی ہوتے ہیں" ان چند لفظوں میں اس نے سارا فلسفۂ اخلاق بھر دیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے ایسے فرائض جن پر وہ مجبور کیا جا سکتا ہے بہت ہی کم ہیں، لیکن ایسے فرائض جو احساس پر مبنی ہیں ان کی تعداد ان گنت ہے، مثال کے طور پر دیکھو، کہ اگر تم لوگوں کے ساتھ معاملات درست رکھو، کسی کے حقوق میں دست اندازی نہ کرو۔ اور جو حقوق و مطالبات تم پر قانوناً عائد ہوتے ہیں انہیں ادا کرتے رہو تو تم ایک بیباک زندگی بسر کرو گے اور تمہارے اوپر کوئی فرض ایسا عائد نہ ہوگا جسے ادا کرنے پر تم مجبور کئے جا سکو، لیکن اگر تم محسوس کرو تو تمہارے ذمہ پھر بھی ایسے فرائض ہیں جنہیں ادا کئے بغیر تم انسانیت کی عام سطح سے بلند نہیں ہو سکتے۔ ہر معذور شخص جس پر تمہاری نظر پڑتی ہے، اپنی معذوریت میں تمہیں یہ فرض یاد دلاتا ہے کہ اسکی اعانت تمہیں کرنی چاہیئے، ہر ضرورتمند جب اپنی ضرورت تمہارے پاس لاتا ہے تو دراصل وہ تمہیں جتاتا ہے کہ اسکی مدد کرنا تم پر فرض ہے، اور بنی نوع انسان کا ہر وہ فرد جو کسی مصیبت میں مبتلا ہو اپنی فلک زدگی کے ذریعہ تمہیں ایک

اہم اخلاقی فرض کو ادا کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اگر کسی کے گھر میں آگ لگ رہی ہو تو کوئی قانون تمہیں مجبور نہیں کر سکتا کہ اسے بجھانے کی کوشش کرو۔ لیکن اگر تم میں تھوڑی سی بھی اخلاقی روح موجود ہو تو تم محسوس کرو گے کہ اس شعلہ سامان گھر کے مکینوں کی مدد کو پہنچنا تمہارا فرض ہے۔ احترام سیرت کے ایجابی پہلو سے بھی یہی مراد ہے۔ تمہارا فرض صرف صرف یہی نہیں ہے کہ اپنے ہمسایہ شہریوں کو نہ ستاؤ، بلکہ تمہارا فرض یہ بھی ہے کہ جب وہ ستائے جائیں تو انکی مدد کرو اور حتی الامکان ایسے امور میں حصہ لو جو تمہارے شہری بھائیوں کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہوں۔ ہیگل نے کیسی اچھی بات کہی ہے کہ "تم خود انسان بنو اور دوسروں کا بحیثیت انسان احترام کرو"

احترام ملکیت۔ یہ فرض احترام سیرت کا ایک جزو اور اس کی ایک تعمیلی صورت ہے۔ لیکن اس کو خاص طور پر علیحدہ بیان کرنے سے مقصد یہ تاکید و صراحت اس امر کی ممانعت کرنا ہے کہ دوسروں کی فلاح و بہبود اور ترقی و آسائش کے اسباب و وسائل سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرو خواہ وہ وسائل مادی ہوں۔ یا غیر مادی۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہر شخص اپنی شخصیت کی بقا اور اس کی ترقی کے لئے اسباب کا محتاج ہے اور وہ اسباب جو وہ خود اپنی کوشش سے پیدا کرتا ہے، یا اس کو وراثتاً حاصل ہوتے ہیں، اس کی ذاتی ملکیت ہوتے ہیں۔ اس ذاتی ملکیت میں دخل دینا ایک ناجائز حرکت ہے جس سے اجتناب ہر شخص کا فرض ہے۔ تھوڑی وسعت نظر سے کام لو تو تمہیں نظر آئے گا کہ اس فرض کے مختلف پہلو ہیں جو بادی النظر میں معلوم نہیں ہوتے۔ مثلاً ایک یہ پہلو بھی ہے کہ خود اپنی ذاتی ملکیت کا بھی احترام کرنا چاہیئے کیونکہ اس کا ناجائز استعمال حق ملکیت کو زائل کرتا ہے۔ اسی طرح ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کوئی فرد کاہلی بیکاری کی زندگی بسر نہ کرے کیونکہ جو لوگ بیکار زندگی بسر کرتے ہیں اور دوسروں کی کمائی پر اپنا پیٹ پالتے ہیں، وہ درحقیقت دوسروں کے نتائج محنت سے بیجا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ملکیت غیر میں کسی نہ کسی صورت سے تصرف کے اخلاقی مجرم ہیں +

احترام آئین۔ یہ فرض ایک وسیع دائرہ رکھتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ

سوسائٹی کے مقررہ آئین و قوانین کا احترام کیا جائے خاندانی رسم و رواج اگر درجۂ اخلاق سے گرے ہوئے نہ ہوں اور کسی حیثیت سے مفاد اجتماعی و انفرادی کے لئے مضر نہ ہوں، ان کی پابندی کیجائے، قومی شعائر و رسوم کی خلاف ورزی سے پرہیز اور ان کی بجا آوری کی کوشش کیجائے، جائز طریقہ سے جو حکومت ملک میں قائم ہو اس کے قوانین کی اطاعت کیجائے۔ جس جماعت سے کاروباری تعلق ہو۔ اسکے مقررہ طریقوں اور قاعدوں کا احترام کیا جائے، غرض یہ کہ یہ فرض انسان کو ایک آئین پسند اور باقاعدہ شہری بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ جو لوگ اجتماعی آئین کی پابندی نہیں کرتے وہ اس فرض کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور اس طرح ایک اخلاقی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ سوسائٹی کے کامیاب رکن بننے کی اہلیت نہیں رکھتے ہر شخص جماعت کا ممبر ہونے کی حیثیت سے مجبور ہے۔ کہ اپنی جماعت کے آئین و قوانین کی پابندی کرے، کیونکہ اگر وہ اس کی پابندی نہ کرے گا تو جماعت کا نظام درہم و برہم ہو جائیگا اور فساد و خودسری کے جراثیم تشتت و تفرق کا عالم پیدا کر دینگے جو ہر جماعت کو تباہی کی طرف لیجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالی دماغ افراد اکثر اپنی جماعت کی فضول اور غلط رسموں کی بھی پابندی کرتے ہیں اور انکی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے ایکدم انکی خلاف ورزی نہیں کرتے ۔

مگر اس کے معنے یہ نہ سمجھو کہ یہ حکم حق انقلاب یا حق اصلاح یا حریت فکر و رائے کے حق کو سلب کرتا ہے۔ نہیں، اس حکم کے باوجود ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ جب جماعت کو کسی غلط نظام پر چلتے ہوئے دیکھے یا اسے اندیشہ ہو کہ جماعت کسی تباہ کن راستہ پر جا رہی ہے تو وہ پوری بلند آہنگی کے ساتھ اسے متنبہ کرے۔ نظام جماعت کی اصلاح کے لئے اپنی ساری قوتیں صرف کر دے اور اس حالت کو بدلنے کے لئے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے۔ کہ اس حق انقلاب و اصلاح کو استعمال کرنے میں قدرت کے صحیح تدریجی اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ یعنی نظام جماعت میں کسی فوری تغیر کی کوشش نہ کرنی چاہیئے بلکہ رفتہ رفتہ جماعت کو اصلاح کی طرف مائل کرنا چاہیئے ۔

احترام صداقت ۔ عام طور پر اس سے دو معنی مراد ہوتے ہیں۔ ایک

یہ کہ قول اور نیت ایک ہو، دوسرے یہ کہ قول اور فعل ایک ہو۔ ان دونوں میں ایک نازک مگر بین فرق ہے اول الذکر کا منشا یہ ہے کہ ہمیں وہی بات کہنی چاہیئے جو ہمارے دل میں ہو، یعنے بادل ناخواستہ کوئی بات نہ کہیں، اور آخر الذکر کا مقصد یہ ہے کہ ہم زبان سے جو کچھ کہیں اس پر عمل بھی کریں لیکن درحقیقت اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ یہ تینوں چیزیں متحد ہوں۔ ہماری زبان سے کوئی بات ایسی نہ نکلے جو ہمارے دل میں نہ ہو اور جس پر ہم عمل کے لئے تیار نہ ہوں۔ صحیح معنے میں صداقت کا احترام یہی ہے کسی مجبوری سے کوئی بات زبان سے نکالنا اور اس پر عمل نہ کرنا، یا عمل بھی مجبوری سے کرنا اس حال میں۔ کہ نیت اس سے متفق نہیں احترام صداقت سے خارج ہے اسی طرح یہ بات کہ زبان سے جو کچھ نکل گیا یا مصلحتاً نکالا گیا اس پر عمل کرنے کی کوشش کیجائے، احترام صداقت کے درجہ سے گری ہوئی ہے، کیونکہ اس میں بھی نیت کا اتحاد نہیں ہے +

احترام ترقی۔ اس حکم کا منشا یہ ہے کہ جماعت کا ہر فرد تا بمقدور اجتماعی ترقی اور بنی نوع انسان کی فلاح میں سعی کرے، اور جو خدمت وہ کر سکتا ہو اس میں دریغ نہ کرے، دراصل یہ حکم سچی خدا پرستی پر مبنی ہے اور اس لئے بہت قابل تعظیم ہے۔ خدا کی محبت جس انسان کے دل میں صحیح طور پر جاگزیں ہو! سکے لئے عملی عبادت یہ ہے کہ وہ خلق اللہ کی بھلائی اور بہتری میں اپنی ساری امکانی قوتیں صرف کردے کیونکہ خلق اللہ کی خدمت دراصل عین اللہ کی خدمت ہے۔ اس اعتبار سے احترام ترقی کا درجہ کسی طرح زاہدانِ شب زندہ دار کی عبادت و ریاضت سے کم نہیں ٹھیرتا۔ اخلاقیات کے مجموعۂ فرائض میں، سب سے آخری اور سب سے بڑا ایجابی حکم ہے، اور اس کی رُو سے انسان انتہائی اخلاقی مدارج تک صرف اسی طرح پہنچ سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو کلیتہً جماعت کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کردے +

مباحث گذشتہ پر ایک نظر۔ مندرجۂ بالا احکام و فرائض کو ہم نے ترتیب و تنظیم کے ساتھ پیش نہیں کیا ہے، اور نہ یہ بتایا ہے کہ ان میں باہم کیا تعلق ہے، یہ کچھ ہماری کوتاہی نہیں، بلکہ درحقیقت ان کا کوئی کامل نظام ہی نہیں

بن سکتا اور نہ یہ تعیّن ہو سکتی ہے کہ تعلق کے لحاظ سے کون مقدم ہے اور کون موخر اجتماعی زندگی اور اس کے ارتقا کے لئے یہ سب لوازم ہیں۔ کوئی فرض ایسا نہیں جو ضروری نہ ہو یا جس کی اہمیت کسی دوسرے فرض سے کم ہو۔ جو اہمیت احترام سیرت کی ہے وہی اہمیت احترام ملکیت کی بھی ہے اور اجتماعی زندگی کے لئے جس طرح حق حیات ضروری ہے اسی طرح حق حریت بھی ضروری ہے۔ یہی حال انکے باہمی تعلق کا ہے۔ ہر حق اور ہر فرض دوسرے حق اور فرض سے اس طرح متعلق ہے جس طرح نظام شمسی کے سیارے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں اور یہ فرائض و حقوق حیات اجتماعی کے گرد اسی طرح گردش کرتے ہیں جس طرح تمام سیارے آفتاب کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔

ادب لطیف

عورت کا دل بچے کی جیب ہے۔ جس میں وہ جو کچھ ملتا ہے۔ پر شوق ہاتھوں سے ڈال لیتا ہے ــــ

ٹوٹا ہوا تاگا، مرجھایا ہوا پھول، کھوٹا سکہ، پتھر کا ٹکڑا۔ چاقو کا دستہ۔ یہ سب اشیا ناکارہ ہیں۔ ان کو سمجھ دار دنیا نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اور حقارت کی ٹھوکر لگا کر راستے سے پرے ہٹا دیتی ہے۔ مگر چھوٹے بچے کے لئے یہ عجائبات دنیا سے بھی قیمتی ہیں۔ وہ ان پر اپنی جان عزیز چھڑکتا ہے۔

عورت کا دل بھی بچے کی جیب ہے جس میں اُسے جو کچھ ملتا ہے۔ شوق سے ڈال لیتی ہے ــــ

نفرت کے دو لفظ، محبت کا ایک کلمہ، لاپروائی کا قہقہہ، شوق بھری آواز نگاہیں، جعلی سرد آہیں، یہ سب اشیاء ناکارہ ہیں۔ سمجھ دار (مردوں کی) دنیا ان کو دیکھ کر چونک اٹھتی ہے۔ مگر عورت کے لئے یہ بیش قیمت خزانہ ہے۔ وہ اسے مردوں سے چھپا کر رکھتی ہے۔

نیو میگزین

بعض راستے

بعض راستے ایسے ہیں، جو درختوں میں سے گزرتے ہیں۔ وہاں صرف پرندے پہنچ سکتے ہیں۔ آدمی ان کو مصروف پرواز دیکھتے ہیں اور ترس کر رہ جاتے ہیں۔

بعض راستے ایسے ہیں، جو گہرے پانیوں کے درمیان ہیں۔ وہاں صرف مچھلیاں، مگرمچھ اور دیگر آبی جانور رہ سکتے ہیں۔ آدمی ان کا تصور کرتے ہیں، اُن کے حالات سنتے ہیں۔ اور خوف سے اُن کا خون رگوں میں منجمد ہو جاتا ہے۔

بعض راستے ایسے ہیں، جو اونچے پہاڑوں کی برف سے ڈھکی ہوئی سربلند چوٹیوں کے مابین ہیں۔ وہاں صرف ہوا کا گزر ہے۔ آدمی وہاں کے مناظر دیکھنے کے خواہاں ہیں، وہاں جانے کو تیار ہوتے ہیں۔ لیکن قدرت راستہ روک لیتی ہے۔

بعض راستے ایسے ہیں، جو ہزار ہا ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں کے درمیان ہیں۔ وہاں سے صرف ٹوٹنے والے تارے اور دُم دار سیارے ہی گزر سکتے ہیں۔ آدمی بہت نیچے سے اُن کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ کسی طرح وہاں کے اسرار معلوم کر سکیں۔ لیکن زیادہ کامیابی نہیں ہوتی۔

مگر بعض راستے ایسے بھی ہیں، جہاں میرے خیالات، اور صرف میرے خیالات ہی پہنچ سکتے ہیں۔ یہ وہ راستے ہیں جن پر میرا قبضہ ہے، میری حکومت ہے۔ وہاں نہ پرندوں کی گزر ہے۔ نہ مچھلیوں کی۔ نہ ہوا کی نہ ستاروں کی۔ وہ درختوں سے اونچے، پہاڑوں سے بلند، سمندر کے پانیوں سے گہرے اور تاریک آسمان پر ٹمٹمانے والے تاروں سے بھی پرے ہیں۔

میشر رنیویارک

خدا کی تلاش

میں تجھے پر فضا گوشوں میں پھولوں کے پیڑوں تلے تلاش کر رہا تھا، لیکن تو مصیبت زدہ غریبوں کے جھونپڑوں میں میرا منتظر تھا۔ میں تجھے دلکش نغموں میں ڈھونڈھ رہا تھا۔ لیکن تو کسی کی آہ بن کر مجھے بلاتا تھا۔

کاش مجھے یہ معلوم ہو جاتا۔ تو میری مراد آن واحد میں پوری ہو جاتی۔

میری آنکھیں تیری تلاش میں عالی شان مندروں میں بھٹک رہی تھیں، لیکن تو جاں بہ لب مریض کے سرہانے بیٹھا میرا ہی رستہ تک رہا تھا۔

تو میری ہی خاطر کسی کی آنکھ سے آنسو بن کر اس کے رخسار پر بہہ رہا تھا لیکن میں

تجھے اپنی محبوبہ کے گورے اور نکھرے ہوئے رنگ میں تلاش کر رہا تھا۔
کاش میری آنکھیں کھل جاتیں۔ تو میری مراد آنِ واحد میں پوری ہو جاتی۔
میں تجھے بہشت میں ڈھونڈتا تھا۔ لیکن تو غریب محنتی مزدوروں کے درمیان کھڑا تھا۔
تو نے مجھے اپنے تک پہنچنے کے ہزاروں موقعے دیے۔ لیکن میں نے ان سب کو کھو دیا۔
کاش میں یہ جان سکتا۔ کہ میں تجھے قول میں تلاش کر رہا ہوں، حالانکہ تو فعل میں ہے۔ تو میری تلاش کتنی جلدی ختم ہو جاتی۔ اور میں کس آسانی سے اپنے مقصود کو پا لیتا۔

میں جانتا ہوں

میں جانتا ہوں کہ کسی دن کے دھندلے خاتمے پر سورج مجھے اپنی آخری الوداع کہے گا۔ چرواہے بڑ کے نیچے اپنی بانسری بجائیں گے۔ اور چوپائے دریا کے کنارے گھاٹیوں پر چرتے ہونگے۔ جب کہ میرے دن تاریکیوں میں غائب ہو جائیں گے!

یہ میری دعا ہے کہ رخصت سے پہلے میں جان لوں کہ زمین نے کیوں مجھے اپنی گودی میں لیا تھا؟ کیوں اس کی رات کے اندھیرے نے مجھ سے تاروں کی باتیں کیں۔ اور اُس کے دن کی روشنی نے کیوں میرے خیالات کو پھول بنا دیا

اے کاش! جانے سے پہلے میں اپنے آخری گیت کو اچھی طرح گنگنا لوں۔ اور اس کی موسیقی کو مکمل کر لوں۔ اس چراغ کو روشن کروں جس سے تیرا چہرہ دیکھ سکوں۔ اور وہ ہار پرو لوں جو تیرے سر کا تاج ہو!

(گلچیں)

ناکتخدا لڑکی

اے معزز خاندان کی کم سن پیاری لڑکی تیرے خوبصورت چہرہ سے عالی خاندانی کے اثر نمایاں ہیں۔ شریف والدین کے تعلیمی اثر نے تجھے چھوٹی سی عمر میں بردبار اور متین بنا دیا ہے۔ لیکن تقاضائے عمر کی بے چینیاں تیری صورت سے ٹپک رہی ہیں۔ تیری بھولی بھالی باتیں پتہ دے رہی ہیں۔ کہ بام عمر کی صرف دسویں سیڑھی تک تیرا قدم پہنچا ہے۔ بس اب دو تین زینوں پر قدم رکھنے کے بعد تیری زندگی کا ایک نیا مرحلہ شروع ہوگا۔ کیا تجھے یہ لاابالی زمانہ یاد رہے گا۔ نہیں۔ پھر تو کسی اور دنیا میں چلی جاوے گی۔ تیرے اس مکان کی چار دیواری جو اس وقت تیری دنیا ہے۔ اور تیرے مکان کی چند گز زمین جو تیری سیرگاہ ہے۔ پھر اسے کہاں پاے گی۔ اے عیش و آرام کی گودیوں میں پلی ہوئی دوشیزہ لڑکی۔ خدا کرے۔ تو جیسی خوبصورت ہے ویسی خوش نصیب بھی ہو۔ تیرا نیک شوہر کسی شریف خاندان کا سید اور تعلیم یافتہ نوجوان ہو۔ اور یہ خدا کی دی ہوئی نعمت تیرے لئے سرمائہ ناز ہو۔ تو اپنے ہمجنسوں میں فخر و مباہات کرے۔ اور وہ تیری عصمت اور سلیقہ شعاری کا قدردان ہو۔ بھولی ناسمجھ لڑکی! ابھی تو گڑیوں سے کھیل رہی ہے۔ انہیں سے تیرا دل بہلتا ہے۔ اور انہیں کو تو پیار کرتی ہے۔ ان ہی کو تو اپنے ہاتھ سے سی سی کر عمدہ کپڑے پہناتی ہے اور انہی کو تو اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے گھروندے یا طاق میں بٹھا کر اپنی صناعی کا تماشا دیکھتی ہے۔ اور دل ہی دل میں شاد ہوتی ہے اللہ اللہ تو اس عالم کے مزے لوٹ رہی ہے۔ جس کو دنیا اور افکار دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ تیرا چھوٹا بھائی تجھ کو ستانے کے لئے تیری گڑیوں کو تتر بتر کر دیتا ہے۔ اور انہیں نوچ کھسوٹ ڈالتا ہے۔ تو کبھی رونے لگتی ہے۔ کبھی فریاد کرتی ہے۔ کبھی اس شوخ لڑکے کو کوستی ہے۔ اور اگر زیادہ غصہ آتا ہے۔ تو اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر زمین پر گرا دیتی ہے وہ چالاک لڑکا کیا صفائی سے ہاتھ چھڑا کر نکل جاتا ہے۔ اور تو منہ دیکھ کر رہ جاتی ہے۔ پھر تو آنسو پونچھ کر اپنی چیزوں کو ٹھکانے سے رکھتی ہے پیاری زہرہ! (ہاں یہی تیرا نام ہے) جب تو نے اپنے ہمسائے کی لڑکی رشیدہ سے اپنے گڑیا کی شادی کی اور تیری ساری سہیلیوں نے خدائی رات میں ڈھول بجا بجا کر شادیانے گائے۔ کیا اس وقت تجھے یہ خیال آیا تھا۔ کہ تیرا دولھا بھی آخر کوئی ہوگا۔ جو

کسی روز اس گڑیا کی طرح تجھے بھی بیاہ لے جائیگا۔ جس کو تو نے بنا سنوار کر بٹھایا ہے۔ نہیں تجھے یہ خیال کیوں آنے لگا۔ شرافت کا خون جو تیری رگوں میں شرم وحیا بن کر دورہ کر رہا ہے وہ ایسے معاملوں کی طرف تیرے ذہن کو منتقل ہونے نہ دیگا۔ تیری بھولی صورت کہہ رہی ہے کہ تو شرم والی لڑکی ہے۔ تو میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ تیری چھوٹی سی چوٹی جو شفیق ماں نے اپنے ہاتھ سے گوندھ دی ہے۔ اس کو بھی تیری بے پرواہی سنبھال نہیں سکتی آگے چھوٹے چھوٹے بال چوٹی سے کھل کر بچھے دار ہو گئے ہیں۔ اور چاندسی پیشانی پر لہرا رہے ہیں۔ تو گھبرا گھبرا کر ان کو پیشانی سے ہٹاتی ہے۔ مگر وہ حسین چہرے کی بلائیں لینے کو جھکے پڑتے ہیں۔ ظاہری نمایش اور مصنوعی آرایش سے تیری مستغنی طبیعت کو کس قدر نفرت ہے قدرت کے پاک ہاتھوں کی بنائی ہوئی تصویر عصمت کا فرشتہ تجھ کو اپنے پروں میں چھپائے ہوئے ہے کہ تیرے حسن خداداد کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ بے مئی کے چمکتے ہوئے خوش نما دانتوں کا سلسلہ سلک مروارید کو شرما رہا ہے۔ بنیر کاجل کے شرم وحیا بھری ہوئی آنکھوں کا جادو مہربان والدین کا دل لبھا رہا ہے۔ مگر ہاں اے نیک بخت زہرہ! آج تیری ماں کے کلیجہ میں پنکھے کیوں لگے ہیں؟ تو اپنی ہم عمر سہیلیوں کے ساتھ ہنڈکلھیا پکا رہی ہے۔ اور وہاں گھر کے بڑے بوڑھوں میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں +

ناسمجھ لڑکی! تو جس گھر میں پلی ہے اُس کے در و دیوار پر اک حسرت بھری نظر ڈال کے الوداع کہہ لے اور اپنی پیاری پیاری گڑیوں سے بھی رخصت ہو لے۔ اب تو ان سے چھوٹ جائے گی۔ اور دنیاداری کے کام تیرے گلے پڑیں گے۔ تجھے ایک نئے گھر میں جانا ہے جہاں کا آسمان و زمین بھی تیرے لئے بیگانہ ہے نئے نئے لوگ ہونگے نئی نئی صورتیں دیکھنے میں آئیں گی تو اپنے گھونگھٹ کے اندر ہی اندر حسرت بھری نظریں دوڑائیگی۔ مگر تیری پیاری سہیلیاں تجھے نظر نہ آئیں گی۔ بہت دن تیرا دل گھبرائیگا۔ جس نے تجھے اپنی گود میں پالا جس نے تیری ضد پوری کرنے کے لئے ہزارہا مصیبتیں جھیلیں۔ وہ عاشق زار ماں چھوٹ جائیگی تیرے چاہنے والے رَضِیْنَا بِاَمْرِ اللّٰہِ کہہ کر تجھے اک ایسے اجنبی کے سپرد کر دیں گے کہ جس کی صورت بھی آج کے سوا تو نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ اب وہ ہمیشہ کے لئے تیرا چاہنے والا دولھا تیری نیک مزاجی اور سلیقہ شعاری کا قدردان ہوگا۔ تیری ماں نے اپنے کلیجے پر پتھر رکھ لیا۔ تو ایک غیر شخص مگر وارث شرعی کے پہلو میں ہے اپنے بھولے چہرے سے ہاتھ

ہٹا کر دیکھ۔ اس کی مانوس نگاہیں محبت میں ڈوبی ہوئی تیرے دریائے حسن کی موجوں میں غوطہ کھا رہی ہیں۔ کیا تو اس بات سے خوش ہے کہ اک حسین نوجوان کے پہلو میں بیٹھی رہے؟ نہیں تو ابھی خوش نہیں مگر آئندہ خوشی کی امید رکھ۔ ناسمجھ لڑکی تیرے آنسو کیوں ڈبڈبائے ہوئے ہیں تو ہچکیاں لے لے کر کیوں رو رہی ہے۔ اب اپنا گھر کیوں یاد کرتی ہے۔ آنکھیں کھول اور دیکھ کہ اب یہی ہمیشہ کے لئے تیرا گھر ہے۔ اور یہ اجنبی جوان تیرا شوہر ہے۔ زہرہ! اپنے متصل گریہ کو روک کہ ہچکی تھمے۔ دل کو ٹھہرا۔ اور سن۔ دیکھیا ماں تجھے دعا دیتی ہے اور تجھ سے رخصت ہوتی ہے۔ میری پیاری بچی۔ میری نادان زہرہ خدا تیرے خاوند کو نیک ہدایت دے۔ وہ تیرا تلوا دیکھ کر کسی کا سنہ نہ دیکھے۔ تیرا گھر آباد رہے۔ تو پھلے پھولے۔ سات بچوں کی ماں ہو +

احسن۔ لکھنوی

اے وادیٔ نیل

(مصریوں کا قومی گیت)

اے وادی نیل! اے وادی نیل!! تیرا مبارک شوق میرے دل کی انتہائی گہرائیوں میں موجزن ہے! تیری سچی محبت میری رگ رگ میں سمارہی ہے! وہ محبت جسے میں اپنی جان بلکہ اپنا ایمان سمجھتا ہوں!

اے مصر! اے سارے جہان سے زیادہ محبوب وطن!! اے مصر! اے تمام زمانہ کی ماں!! میری ساری عمر تجھ پر نثار! میری تمام زندگی تجھ پر قربان!!

اے مصر! اے آسمان جاہ اہرام کی سرزمین!! اے سدا بہار وادیٔ نیل!!! تو بیسیوں قوموں کا گورستان ہے! ہاں تو سینکڑوں ظالموں اور ستمگروں کا مدفن ہے! جو تیرے عزیز باشندوں پر تیرے محبوب فرزندوں پر ظلم کریگا۔ اس سے ایک نہ ایک دن ضرور انتقام لیا جائے گا!

اے وادیٔ نیل اس وسیع کائنات میں وہ کونسی ایسی طاقت ور اور جابر شخصیت ہے؟ جو موجودہ روشن زمانے کے آنے کے بعد بھی ایک آنکھ والی قوم کو روشن حق کے دیدار سے روک سکتی ہے۔ آسمان سے تارے توڑ کر لانا ممکن ہے مگر یہ قطعی ناممکن ہے کہ غمگین قوم کی امیدوں کو کوئی خون کی نہریں بہا کر بھی چھین سکے ——— !

اے وادی نیل! تیری عزت میری انتہائی آرزو ہے! تیری محبت میرا قومی نشان ہے! لہرانے دو! ہاں، میرے مقدس نشان کو لہرانے دو!! ابھی میرا دایاں ہاتھ اسے تھامنے کے لئے موجود ہے !!!

میرا نشان! میرے دل کے پاکیزہ خون سے رنگیں نشاں!! جو دنیا والوں کے سر پر اس طرح چمکتا ہے، جیسے آغاز ماہ کا نیا اور جوان چاند، آسمان کے نیلگوں پردے پر جگمگاتا ہے! باقی رہے گا! برسوں تک وہاں صدیوں تک، باقی رہے گا! ——— !

ہم ایک لمبی اور گہری نیند کے بعد..... آگے بڑھنے کے لئے، اندھیری خلوتوں سے باہر نکلے ہیں۔ اور خدائے برحق ہمارا حافظ و ناصر ہے!

دوستو! لحظہ بہ لحظہ، درجہ بدرجہ، گزرے ہوئے عہد غفلت کو یاد کرو! اور ——— اور آنے والے سنہری زمانہ کو بھی نہ بھولو! خدائے قدوس ہمارا مددگار ہے !!

پائندہ باد وادی نیل !!!

اختر شیرانی

اگر میں صحرا نشیں ہوتا

اگر میں صحرا نشیں ہوتا۔ تو طلوع و غروب آفتاب کے نظارے سے ہر روز متاثر ہو جاتا۔ چاندنی رات کو میں دیکھتا کہ چاند اور ستارے زمین کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں، اندھیری رات میں تمام عالم کی تاریکی اور ہر چیز کی خاموشی مجھ پر اثر کرتی اور میں اپنے دل میں عمیق حسیات محسوس کرتا۔ میں کسی وادی میں گذر رہا ہوتا، پر فضا گھاٹی کے پھول، اور ان پھولوں کو دیکھ دیکھ کر رنگین اور لطیف گانے والی بلبل، ہلکی آواز سے گرنے والے آبشار مجھے گھنٹوں حیرت زدہ رکھتے اور میں پر مسرت زندگی بسر کرتا۔

مگر میں شہر نشین ہوں، اور کیا دیکھتا ہوں؟ ایک غریب مزدور کا لڑکا سڑک سے گزر رہا ہے، ایک عالی شان محل کے سامنے (جس میں عیش و تنعم و گناہ کے سوا کچھ نہیں) کھڑا ہو جاتا ہے، کھڑکیوں کو کھڑا گن رہا ہے۔ اور یوں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے، آگے، ایک بڑی پُر رونق دکان کے سامنے کھڑا، حسرت سے منہ اور آنکھیں کھولے، دیکھ رہا ہے، مٹھائیوں کو دیکھ دیکھ کے اس کے منہ میں پانی بھر بھر آتا ہے لیکن وہ خرید نہیں سکتا +

ایک بے والی، وارث لڑکی کو دیکھتا ہوں، اور سوچتا ہوں کہ اس کا تبسم معصوم، ایک امر ناجائز پر (جس کے ساتھ اس کا پیٹ بھرنے کے لئے کچھ پیسے دیے جائینگے) قربان ہو جائیگا +

پھر ایک شرابی سامنے سے گزرتا ہے، جس کی قوت معنویہ سب محو ہو چکی ہے، جو جان جان کر زہر پی رہا ہے۔

پھر ایک چور پر نظر پڑتی ہے۔ جسے فلاکت و حاجت کے کوڑے نے چوری پر مجبور کیا، اور جسے اوروں کو عبرت دلانے، اور اسے آیندہ چوری سے باز رکھنے کے لئے، زندان کو لئے جا رہے ہیں! گویا فلاکت و حاجت زندان سے ڈرتی ہے!

ایک متعفن اور گھنی بیماری میں مبتلا فقیر کو دیکھتا ہوں، اور دیکھتا ہوں کہ ایک عفن بھرک دار فٹن میں بیٹھا ہوا اُدھر سے گزرتا ہے۔ اور اس فقیر کو دیکھ کر تنفر سے منہ پھیر لیتا ہے +

آہ! شہر نشین ہوں، روتا ہوں اور کہتا ہوں۔

اے مایوس دلو، اے مدفن سرور مزارو! تمہارا خیال مجھے رلاتا ہے، تمہیں سوچتا ہوں اور تم پر دل کڑھاتا ہوں۔ جیسا میرا مایوس دل ہے ایسے کتنے ہو چکے ہیں، اور کتنے اس وقت ہیں! شائد، پہلے اتنے دل خون نہ ہوتے ہونگے، مگر اب؟ اب تو مجھے ہر جگہ سینہ چاکی، دل شکستگی نظر آتی ہے +

دھڑک، دھڑک اے قلب یاس بنیاد! اپنے لئے، اپنے جیسے لاکھوں مصیبت زدہ دلوں کے لئے دھڑک، ٹکڑے ٹکڑے ہو جا، جا، جا دور ہو جا، تیرا وجود میرے لئے بارِ گراں ہے، تو مزار ہے +

سجاد حیدر

اہلِ قلم روحِ انتخاب حصّۂ دوم

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

ڈاکٹر عبدالرحمٰن مرحوم سہوارہ ضلع بجنور کے باشندہ تھے، ایام طالب علمی ہی میں ان کی ہونہار شخصیت سے ملک و قوم کی توقعات وابستہ ہوگئی تھیں۔ ان کی خداداد قابلیت اور قابل رشک ذہانت نے ان کے معاصرین میں انہیں محسود بنائے رکھا کم و بیش چودہ پندرہ زبانوں کے ماہر تھے۔ انگریزی میگزین "ایسٹ اینڈ ویسٹ" میں ان کا ایک مضمون ملک سرویا کی شاعری پر شائع ہوا تھا۔ وہ قابل قدر مضمون جن حضرات کی نظر سے گذرا ہے وہی کچھ ان کی نقادانہ شان اور متبحر لسانی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کی ساخت پرداخت اور اُس کے دستور العمل کی ترتیب میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بہت کچھ امداد دی ہے۔ اردو ادب سے ان کی محبت عشق کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ بھوپال کے سرکاری کتب خانہ سے مرزا غالب کے غیر مطبوعہ دیوان کا جو قلمی نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ اُس پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن کا علمی مقدمہ اردو لٹریچر میں ایک گراں مایہ اضافہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ مرزا غالب کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے عبدالرحمٰن جیسا بے پناہ قادر التحریر مداح نصیب ہوا۔ اور آہ یہ اردو کی بدنصیبی ہے کہ اُس کا ایک مسیحا نفس اور افتخار روزگار ادیب نوجوانی ہی میں موت کی لاابالیوں کی نذر ہوگیا۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن اپنے قابل فخر علمی امتیازات اور قابل رشک ذاتی اوصاف کے سبب ملک کے اُن چند در چند افراد میں سے تھا۔ جن پر کوئی ملک بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

میاں بشیر احمد اڈیٹر ہمایوں

میاں بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا اڈیٹر ہمایوں جدید دور کے انشاپردازوں میں بلند رتبہ رکھتے ہیں۔ باغبان پورہ کے میاں خاندان کے ایک ممتاز رکن ہیں + آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں مرحوم کے خلف الرشید ہیں میاں صاحب مرحوم نے حمیتِ ملی کے جذبہ سے متاثر ہوکر اپنی اخیر زندگی میں اپنے اس عزیز بیٹے (میاں بشیر احمد) کی زندگی قوم کے لئے وقف کردی تھی۔ چنانچہ میاں بشیر احمد بہت مدت تک اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامی تاریخ کی اعلےٰ جماعتوں کو تعلیم دیتے رہے۔ اپنے محترم باپ کی یادگار میں رسالہ ہمایوں جاری کیا جو اس وقت اردو کے ممتاز ترین ماہوار رسالوں میں شمار ہوتا ہے۔ ادبی ذوق انہیں اپنے باپ سے ترکے میں ملا ہے۔ اردو نظم و نثر میں یکساں مہارت رکھتے ہیں ان کا طرز تحریر مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کے رنگ انشاء سے متاثر ہے کبھی ایسی سلیس اور بے ساختہ عبارت لکھ جاتے ہیں کہ اس پر آزاد کی تحریر کا دھوکا ہونے لگتا ہے +

ابتدا سے ادب "لطیف" کی تحریروں کو بہت پسند کرتے ہیں اور اس رنگ میں ان کے مضامین کا مجموعہ ایک ضخیم جلد میں سما سکتا ہے۔ مگر ادب لطیف میں عریانیوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ ان کی اس قسم کی تحریریں اخلاقی اور روحانی ہوتی ہیں +

ڈاکٹر ٹیگور کی ایک کتاب کا ترجمہ "طائران آوارہ" کے نام سے کر چکے ہیں۔ اور فرانس کی مشہور جون آف آرک کی زندگی پر ایک نہایت لطیف کتاب "ژان دارک" کے نام سے لکھی ہے جو ہمایوں میں مسلسل طور پر شائع ہوکر قبولیت حاصل کرتی رہی ہے +

سید راس مسعود ناظم تعلیمات حیدرآباد

نواب مسعود جنگ بہادر سید راس مسعود مملکت حیدرآباد نظام میں سررشتہ تعلیم کے ڈائرکٹر ہیں۔ دہلی کے ایک معزز خاندان کے رکن ہیں۔ ان کا خاندان عہد مغلیہ میں بہت با اقتدار رہ چکا ہے۔ ہندوستان کے مشہور مدبر اور ہندوستانی مسلمانوں کے رہنمائے اعظم ڈاکٹر سر سید احمد خاں کے پوتے اور اپنے عہد کے ذہین ترین قانون داں جسٹس محمود کے بلند اقبال صاحبزادے ہیں۔ بی۔ اے تک علی گڈھ میں تعلیم حاصل کی۔ پھر سرکاری وظیفے کر ولایت تشریف لے گئے۔ وہاں سے آئی۔ ای ایس ہو کر واپس ہوئے حکومت نظام نے گورنمنٹ سے ان کی خدمات اپنے سررشتہ تعلیم کے لئے حاصل کر لیں۔ اور جب سے اب تک ریاست حیدرآباد کے محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حیدرآباد کی تعلیمی بیداری میں زیادہ تر آپ ہی کا حصہ ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی حیرت انگیز کامیابیوں کا سہرا بھی آپ ہی کے سر ہے ٭

انجمن ترقی اردو کو آپ کی ذات سے گراں قدر امداد ملتی رہتی ہے ٭

ادبی ذوق آپ کو اپنے والد ماجد اور جد بزرگوار سے ورثے میں ملا ہے۔ سر سید مرحوم جن کو بقول مولانا حالی "قادر آف اردو" کہنا موزوں ہوگا اُن کے پوتے سے تعلیمی اور ادبی دنیا جس قسم کی توقعات وابستہ کر سکتی ہے آپ ان توقعات کو باحسن وجوہ پورا کر رہے ہیں ٭

"انتخاب زریں" کے نام سے آپنے اردو شعرا کے منتخب کلام کا ایک مجموعہ ترتیب دیا ہے۔ مشہور مستشرق موسیو گارساں دتاسی کے وہ لیکچر جو اردو زبان کی تاریخ پر پیرس یونیورسٹی میں دئے گئے تھے۔ فرانسیسی زبان سے آپنے اردو کے سانچے میں ڈھال کر اردو تاریخ ادب میں گرانبہا معلومات کا اضافہ کیا ہے"۔ جاپان اور اس کا نظم و نسق" آپ کی اُس یادگار رپورٹ کا اردو ترجمہ جو آپنے سیاحت جاپان کے دوران میں کی تھی کتابی صورت میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے۔ سر سید مرحوم کے سرمایۂ ادب اردو خطوط۔ بڑی تلاش و جستجو سے آپ نے فراہم کر کے دو جلدوں میں ترتیب دئے ہیں ٭

ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی

مشہور ادیب ایم مہدی حسن افادی گورکھ پور کے ایک معزز خاندان کے ممبر ہیں علی گڈھ کالج میں ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ تعلیمی تکمیل کا موقعہ نہ ملا۔ ضروریات وقت نے ملازمت پر مجبور کر دیا اور نائب تحصیل داری سے ملازمت شروع کی، تحصیلداری تک ترقی کرنے پائے تھے کہ زندگی نے جواب دے دیا۔

ان کے مضامین کا مجموعہ "افادات مہدی" کے نام سے ان کی وفات کے بعد بیگم مہدی نے ترتیب دے کر شائع کیا۔ خطوط مہدی زیر ترتیب ہیں۔

مہدی مرحوم حد درجہ نفاست پسند اور خوش مذاق واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی فطری نفاست کے سبب اپنی زندگی کے ہر شعبے کو دل پسند بنا رکھا تھا۔ ان کی اس نفیس المزاجی کا اثر ان کی انشا پردازی میں بھی سرایت کر گیا تھا۔ ان کا طرز تحریر خوبصورت الفاظ دلکش تراکیب شاندار پیرایہ بیان۔ لطیف و نازک خیالات کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ بھی اردو زبان کے صاحب طرز ادیب ہیں۔ ان کے طرز انشا میں کچھ لطیف خصوصیات ایسی ہیں کہ احساس ذوق ہی سے تعلق رکھتی ہیں بیان نہیں کی جا سکتیں۔ دوسرے لفظوں میں مجمل طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مہدی حسن افادی کا طرز تحریر نفاست و لطافت اور حسن بیان کا ایک مرقع ہے اس اجمالی دعوے کی تحلیل دشوار ہے +

رسالہ نقاد آگرہ کی ابتدائی اشاعتوں میں مہدی حسن نے اپنے "ادب لطیف" کے نمونے جو شائع کئے ہیں۔ ان میں یہ کھل کھیلے ہیں "مقیاس الشباب" اور "تمغہ عیش" جیسی عریانی در بغل تراکیب بے محابانہ استعمال کرتے ہیں۔ حسین شخصیتوں کے حسن کا تجزیہ اس بے باکی سے کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہیں اناٹمی کے پروفیسر رہے ہیں +

نواب سر ذوالفقار علیخان

نواب سر ذوالفقار علیخان کے سی۔ آئی۔ ای پنجاب کے ایک بہت بڑے جاگیردار رئیس مالیر کوٹلہ کے حکمران خاندان کے ایک معزز و مقتدر رکن ہیں۔ حکومت اور رعایا دونوں میں اُن کا یکساں احترام ہے۔ مدت تک وائسرائے کی کونسل کے ممبر رہے ہیں۔ گذشتہ انتخابات میں لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اسلامیہ کالج لاہور اور انجمن حمائت اسلام کو ان کی ذات سے بڑی مدد پہنچی ہے۔ کالج و انجمن مذکور کے سرپرست ہونے کے علاوہ پریزیڈنٹ بھی منتخب ہوتے آئے ہیں۔ پنجاب چیفس ایسوسی ایشن کے صدر اور ایچیسن چیفس کالج کے ٹرسٹی بھی ہیں۔ سیاسی حیثیت سے اعتدال پسند ہیں اور مسلمانوں کے ایک لیڈر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ صلح کل اور مرنجاں مرنج پالیسی کے باعث دوسری قوموں میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہر قوم اور ہر طبقہ کے افراد سے ان کے خوشگوار تعلقات ہیں۔ اس قدر پبلک مصروفیات کے باوجود ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ انکی ایک مشہور انگریزی تصنیف "اے وائس فرام دی ایسٹ" یعنی مشرق سے ایک آواز جو ڈاکٹر اقبال کے کلام پر ایک جامع تبصرہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تنقیدی نظر کس قدر عمیق ہے۔ ہندوستان اور انگلستان سے یکساں طور پر فراخ تحسین وصول کر چکی ہے۔ اردو میں بھی وقتاً فوقتاً انشا پردازی کی داد دیتے رہتے ہیں۔ طرز تحریر نہائت صاف اور شگفتہ ہے۔ خود صاحب علم ہونے کے علاوہ بہت بڑے علمدوست بھی ہیں۔

جسٹس کرامت حسین مرحوم

مولوی سید کرامت حسین مرحوم جون پور کے رہنے والے تھے۔ جون پور ہمیشہ سے اہل علم کی سرزمین بنا رہا ہے۔ شمس بازغہ کے مصنف ملا محمود اور نور الانوار کے مصنف ملا جون اسی سرزمین پاک سے تعلق رکھتے تھے۔ اب بھی علامہ عبداللہ عمادی مولینا ابوبکر جسٹس سلیمان، پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسی گراں پایہ ہستیوں کا وطنی انتساب جون ہی سے ہے +

سید کرامت حسین مرحوم اپنے عہد میں ملک کے قابلترین افراد میں سے تھے۔ دنیا کی مشہور علمی زبانوں کے ماہر تھے۔ سنسکرت اتنی جانتے تھے کہ مدراس یونیورسٹی آپ کو سنسکرت کے ایم اے کا ممتحن بناتی رہی ہے۔ عربی کے جید فاضل تھے۔ غرضیکہ علوم مشرقیہ و مغربیہ کے جامع تھے۔ تعلیم نسواں کے بہت بڑے حامی تھے۔ کئی لاکھ روپیہ مسلمان عورتوں کی تعلیم کے لئے وقف کر گئے آپ کی وفات سے ملک کا ایک ایسا جامع الصفات اور قابلترین ہندوستانی کم ہو گیا جس پر اہل ملک کو فخر تھا۔

مولینا عبدالماجد بی اے

دریا آباد ضلع بارہ بنکی ان کا وطن ہے۔ ملک کے ممتاز ترین مصنفوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ فلسفۂ جدید پر کلاسیکل کتابیں تصنیف کر کے اردو کو علمی زبان بنانے میں ان کا بھی حصہ ہے۔ ان کی تصنیفات و تالیفات میں فلسفۂ جذبات، فلسفہ اجتماع، مکالمات برکلے۔ تصوف اور اسلام۔ فلسفۂ "امن" وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زود پشیمان کے نام سے ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے۔ مصحفی مرحوم کی مثنوی بحر المحبت کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے فلسفہ ایک خشک مضمون ہے مگر اپنے دلکش انداز تحریر سے آپ نے اپنی تصانیف کو ناول کی طرح دلچسپ بنا دیا ہے پہلے پہل آپ کے دماغ پر فلسفہ اس پر ہی مسلط تھا کہ مذہبیات کے منکر رہے علامہ شبلی کی الکلام عقائد اسلام کے فلسفے پر شائع ہوئی تو آپ نے

اُسے اپنی فلسفیانہ جولانیوں کا میدان بنالیا۔ مدتوں تک یہی رنگ طبیعت پر کھیلتا رہا۔ حیدرآباد بلائے گئے۔ تو وہاں کے مذہبی اخبارات نے صدائے احتجاج بلند کی۔ جب تک آپ وہاں رہے۔ اخبارات آپ کے عقائد پر معترض ہی رہے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو کچھ دنوں کے بعد عمر کے انحطاط کے ساتھ فلسفیانہ آزادی کی دوپہر بھی ڈھلنے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ رنگ پھیکا پڑتے پڑتے اتر ہی گیا اور ایسا اترا کہ ایک دن آپ "آمنتُ باللہ ورسولہٖ" پڑھتے سنے گئے۔ مذہب نے آپ سے اس مضر آزادی اور ہرانکاری کا جی کھول کر بدلہ لیا۔ نہ صرف اپنے حدود میں محصور کیا بلکہ تصوف کی بھول بھلیاں میں لاکر چھوڑ دیا۔ یا تو کبھی صانع ہی کا انکار تھا یا آب مصنوعات پر بھی عقیدت کے پھول نثار ہونے لگے۔ اور اب تو ہر سال حضرت نظام الدین اولیاء کے سالانہ عرس میں بڑے پابندی کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔

حضرت خواجہ حسن نظامی کے دربار سے فلسفی شاہ نظامی کا خطاب بھی پاچکے ہیں۔ بڑے محنت اور انہماک سے اسلامی تصوف کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اسلامی تصوف پر ایک بلند پایہ کتاب بھی شائع فرماچکے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ آپ عبدالماجد فلسفی رہیں یا فلسفی شاہ نظامی" اردو زباں کو ہر حال میں یاد رکھتے ہیں۔

شیخ محمد ضیاء الدین شمسی جرنلسٹ

شیخ محمد ضیاء الدین شمسی جرنلسٹ لاہور شیخ چراغ دین روشن مرحوم کے صاحبزادے ہیں ان کا خاندان جو راجپوتوں کے ایک معزز فرقہ سے تعلق رکھتا ہے — حضرت شمس تبریز کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ اسی رعایت سے یہ خاندان شمسی کہلاتا ہے۔ گویا ان کے نام پر شمسی کا اضافہ کوئی تخلص کا اضافہ نہیں۔ کیونکہ انہیں شعر کہنے کا کہیں اتفاق نہیں ہوا۔ شیخ چراغ دین روشن پنجاب میں ٹمپرنس تحریک کے ایک سرگرم حامی تھے۔ انہوں نے انسداد مسکرات میں نمایاں حصہ لیا اور اس سلسلہ میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ (دیکھو ص ۳۰۱)

چودھری محمد حسین ایم۔ اے

چودھری محمد حسین ایم اے پہاڑ نگی پہاڑ نانگ ضلع سیالکوٹ کے باشندہ ہیں۔ اسلامیہ کالج لاہور میں ایم اے تک تعلیم پائی ہے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر کئی سال تک نواب سر ذوالفقار علیخان صاحب کے پریویٹ سیکرٹری رہے محکمہ اطلاعات پنجاب کے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ طالب علمی ہی سے اردو نظم و نثر کے دلدادہ چلے آتے ہیں۔ ان کی بلند پایہ اردو نثر انہیں ان کے معاصرین میں ممتاز کرتی ہے۔

علامہ سر اقبال کے ادبی کارناموں کے اختصاصیین میں سے ہیں۔ علامہ موصوف کی شاعری پر چودھری صاحب کے معرکتہ الآرا مضامین اردو کے تنقیدات عالیہ میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ ذاتی طور پر بہت ذہین ذی استعداد اور شریف النفس انسان ہیں۔

مولینا محمد یونس فرنگی محلی

لکھنؤ علمی حلقوں میں علمائے فرنگی محل کے سبب سے مشہور ہے مولینا نظام الدین مولینا عبد العلیم مولینا عبد الحی جیسے فاقد الاقران علماء اس فرنگی محل سے متعلق تھے۔ درس نظامیہ اسی علمی خاندان کے ایک عالم مولینا نظام الدین فرنگی محلی کی جانب منسوب ہے ہندوستان درس نظامیہ کی نسبت سے تانوین صدی علما فرنگی محل سے سلسلہ تلمذ رکھتے ہیں۔

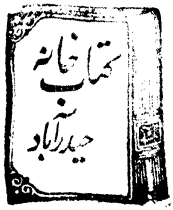
مولینا محمد یونس فرنگی محل مرحوم بھی اسی خاندان کے ایک فرد تھے۔ جو افسوس ہے عالم جوانی ہی میں انتقال فرما گئے۔ ابن رشد اور اس کے فلسفہ پر جو علمی اور تاریخی کتاب آپ نے تصنیف فرمائی ہے اس کی گراں قدری سے آپ کی قابلیت و استعداد کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لکھنؤ کی سلجھی ہوئی زبان میں دقیق فلسفیانہ مباحث کو اس خوبی سے بیان کیا ہے۔ کہ ہر اردو خوان اس علمی کتاب سے مستفید ہو سکتا ہے۔

شمسی صاحب پنجاب کے ایک نوجوان ادیب ہیں اور اردو ادب کی اس صنف پر بڑا عبور رکھتے ہیں۔ جسے مختصر افسانہ نگاری کہا جاتا ہے۔ اسے انہوں نے ایک ایک فن کی حیثیت سے سیکھا ہے۔ امریکہ جو فی زمانہ مختصر افسانہ نگاری کا مرکز ہے۔ وہاں کے ایک اسکول سے افسانہ نگاری کی باقاعدہ سند پائے ہوئے ہیں۔ ویسے بھی اس فن کے ڈاکٹر ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس لحاظ سے ان کے معاصرین میں کوئی ان سے بڑھا ہوا نہیں۔ ان کے مضامین عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور ملک کے تمام رسائل انہیں بڑے اشتیاق اور قبولیت سے شائع کرتے ہیں۔ اردو میں ان کا پہلا مضمون بعنوان اصول قصہ نویسی ہمایوں میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون بڑا سیر حاصل اور محققانہ تھا۔ اور حضرت نیاز فتحپوری کے نگار نے ہمایوں پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا۔ کہ اگر ہمایوں سال بھر میں صرف یہی مضمون شائع کرتا تو اس کی ہستی کا جواز ثابت کرنے کے لئے کافی تھا۔ مختصر افسانوں میں "شکست حسن" اور "جادو" اخلاقی مضامین میں نیک ارادے اور کیا آپ مہذب ہیں" معلوماتی مضامین میں متحرک تصاویر" اور معاشرتی مضامین میں "مرد اور عورت" خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔

مولوی ابوالاعلیٰ مودودی

مولوی ابوالاعلیٰ مودودی ایک نوجوان انشاء پرداز ہیں۔ آج کل جمعیتہ العلماء کے آرگن الجمعیۃ کی عنان ادارت انہی کے ہاتھ میں ہے۔ ان کا طرزِ تحریر بہت سلیس اور سلجھا ہُوا ہوتا ہے۔ ابھی تک ان کی کوئی مستقل تصنیف اشاعت پذیر نہیں ہوئی۔ لیکن متفرق مضامین جو الجمعیۃ کے علاوہ دوسرے اخبارات و رسائل میں نکلتے رہتے ہیں۔ ان کی مصنفانہ قابلیت کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کا مطالعہ بھی بہت وسیع معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخی۔ تمدنی۔ سیاسی۔ اخلاقی اور ادبی قسم کے مضامین پر خامہ فرسائی کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

رسالہ ہمایوں میں اخلاقیات اجتماعیہ کے عنوان سے علم الاخلاق پر اُن کا معرکۃ الآرا مضمون مسلسل کئی نمبروں میں شائع ہوتا رہا۔ غالباً علم الاخلاق ایسا جامع، اور محققانہ مضمون اردو میں پہلا مضمون ہے۔



{مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام بابو رلیا رام پرنٹر چھپا}

کتبخانہ
جامعہ عثمانیہ

۱۔ ارکین مجلس اعلیٰ مجلس قائمہ مجلس انتظامی
مجالس شعبہ جات نصاب پانچ کتابیں ایک بیک اپنے پاس رکھ سکینگے۔
۲۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ وکلیہ جات ملحقہ وگزیٹڈ عہدہ داران جامعہ
اور ارکین دارالترجمہ دس کتابیں ایک بیک اپنے پاس رکھ سکینگے۔
۳۔ طلبا ئین جیٹر شدہ دو کتابیں بی اے۔ اور انٹرمیڈیٹ
کے طلبہ تین کتابیں ایم۔ اے ال ال۔ بی وتحقیقاتی جماعتوں کے
طلبہ پانچ کتابیں دو ہفتہ تک اپنے پاس رکھ سکینگے۔
۴۔ مدت مقررہ پر کتابیں واپس نہ ہوں تو طلبہ سے بحساب
ایک آنہ یومیہ فی کتاب دیا نہ لیا جائیگا۔
۵۔ بشرط موقع کتابیں گم یا خراب کی جائینگی گم اس غرض کے
لئے کتب خانہ میں کتاب کا لانا لازم ہے۔